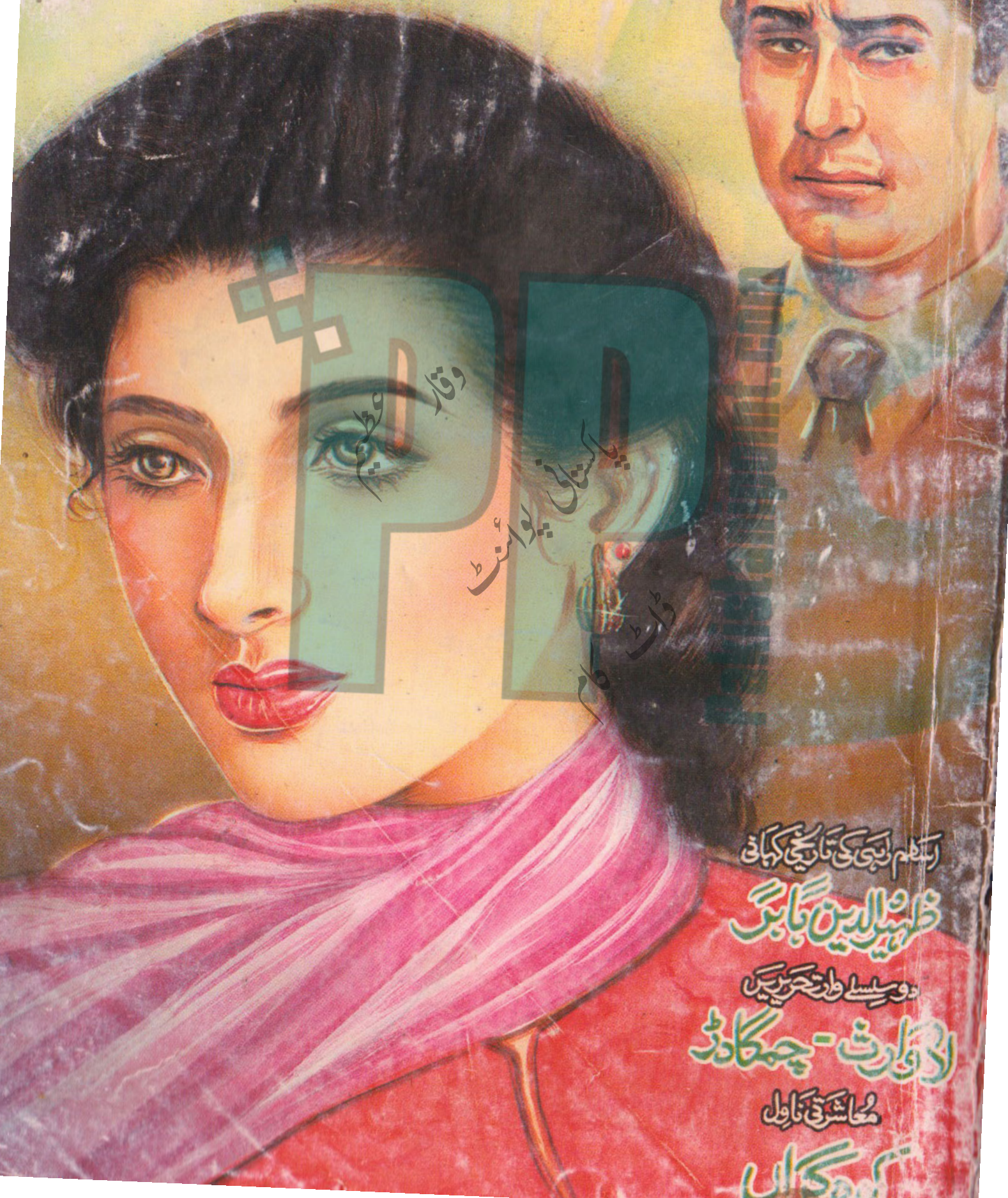


دنیا بھر میں منتخب معیاری ادب

مئی 2015

عمران ڈائجسٹ



پاکستانی پوائنٹ

ایکدم لہجہ کی تاریخی کہانی

ظہیر الدین بابر

دو سلسلے طرز تحریریں

انوارت - چمکاڈ

معاشرتی ناول

گہرے گہاں

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

پہلی قسط

ظہیر الدین بابر

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں سب سے زیادہ سازشیں ہونی ہیں، اس کا اہم سبب جہاں اختیارات، اقتدار اور دولت رہی ہے، وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم، ہر مذہب اور ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کے استحکام کے لیے مذہب پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا، وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آنے گی۔ مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے..... شیطان صفت لوگوں نے کس کس انداز سے مسلمانوں کو کمزور کیا اور اس کے دور رس نتائج کیا برآمد ہوئے۔ یہ تاریخی حقائق ہیں، جنہیں آپ کو ملے گی۔
زیب داستان کیا ہے معروف قلم کار اسلم راہی نے.....

مسلمان حکمرانوں کا احوال، تاریخی حقائق، طویل داستان



بیوانسٹ

کام



نہ سوچیں عیسوی کی وہ ایک انتہائی خوشگوار منجھی۔

گوالیار شہر سے باہر ایک کھلے میدان کے اندر دور دور تک چمکتی خوب صورت قالینیں پھی ہوئی تھیں جن کے سامنے ایک ہلکی سی شہر نشین کی بنیادی کئی سی شاید وہاں گوالیار کے راجہ بکر ماجیت کا دربار لگنے والا تھا اس لیے کہ شاہی دربار ہی کی طرح قالینوں کے اوپر بالائی اور جواہر نگار شامیانے نصب کیے گئے تھے رنگ رنگ اور خوب صورت قالین ان شامیانوں کے ساتھ ایک عجیب ساں برپا کر دی تھیں۔ ٹھوڑی دیر بعد وہاں لوگوں کی آمد شروع ہوئی اور جو ایک تخت سا بنایا گیا تھا اس کے سامنے لوگ اپنے اپنے مراہب کے مطابق بیٹھنے لگے تھے جہاں گوالیار کے راجہ بکر ماجیت اپنے اہل خانہ کے ساتھ بیٹھا تھا وہاں جو پردے لگے ہوئے تھے ان میں بڑے بستی اور گراں بہا مونی لگے ہوئے تھے۔ آخر اصرار اور سرگردہ لوگ رنگ برنگ لباس اور کاہ را در او پہنے وہاں جمع ہوتا کرنے لگے تھے۔

ٹھوڑی دیر بعد گوالیار کا راجہ بکر ماجیت اپنی رانی بھوجہ راج کمار دی را دی کا اور بیٹے رائے کرن کے ساتھ نمودار ہوا۔ راجہ اور اس کے اہل خانہ کے پیچھے راجہ بکر ماجیت کے لشکر یوں کا سپہ سالار ہاس دیواس کا بیٹا رام نرائن، بیٹی رتن دیوی سمراتے ہوئے شہر نشین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آخر سب لوگ جب شہر نشین پر لگی نشستوں پر بیٹھ گئے تب راجہ کے لشکر یوں کا نائب سالار بیرنگھ نمودار ہوا اور اعلان کرنے لگا کہ وہ تقریب راجہ بکر ماجیت کی تخت نشینی کے ایک سال پورا ہونے کی وجہ سے منتقد کی جاری ہے ساتھ ہی بیرنگھ بھی اپنے اہل خانہ کے ساتھ شہر نشین کے پیچھے جو نشست لگی ہوئی تھیں اس پر بیٹھ گیا تھا۔

اگلی نشستوں میں خود راجہ بکر ماجیت رانی بھوجہ ان کا بیٹا رائے کرن اور راج کمار دی را دی بیٹھے ہوئے تھے جہاں تک راج کمار دی را دی کا تعلق تھا تو وہ اپنی عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں بچپنا شباب سے

گلنے کی تیاری کرتا ہے۔ راج کمار دی را دی کا محبت کی جنم میں نہانے تازہ گلانی پھول کی سی خوب صورتی جسم میں تحلیل ہو کر رگ رگ میں تلاطم کھڑے کرتے شغف رنگوں کے قدیلوں کی یہی حسین اور نقیوں کے سحر سے محصور عزیزین سحر کے عجوبوں کی سی پرکشش تھی۔

اس سے اس کی آنکھوں میں نشاط اور سستی کے خواب نگر بھرے ہوئے تھے جن کے اندر نقیوں کے گوہر و جہان کے نیلے رقص کر رہے تھے اس کا مرمیں جسم بھرے گال فراخ سینہ اسے زندگی کے دلکش روپ نواہیت کے وقار اور شباب کی عذرت بنا رہے تھے۔ راج کمار دی را دی کے پیچھے راجہ بکر ماجیت کے سپہ سالار ہاس دیوی کی بیٹی رتن دیوی بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بھی راج کمار دی را دی کی طرح حسین اور خوب صورت تھی۔ اس کے بعد کافی دیر تک رقص و سرور کی محفل برپا رہی دراصل گوالیار کے راجہ بکر ماجیت کی تخت نشینی کو ایک سال پورا ہو گیا تھا اس سے پہلے گوالیار کا راجہ بکر ماجیت کا باپ راجہ مان سنگھ ہو کر انتقال تھا جو مر گیا تھا۔ کافی دیر تک رقص و سرور اور بھری محفل جاری رہی اس کے بعد حاضرین کے لیے بہترین دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جب یہ مجلس اپنے انجام کو پہنچی اور راجہ بکر ماجیت واپس جانے کے لیے اپنی رانی بھوجہ، بیٹے رائے کرن اور راج کمار دی را دی کے ساتھ اٹھا تب اس کے لشکر یوں کا سپہ سالار ہاس دیواس کے قریب آیا اور بڑی عاجزی اور انکساری میں راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”مہاراج چند دن پہلے میں نے آپ سے ایک گزارش کی تھی۔“

ہاس دیواس کے یہ الفاظ سن کر بکر ماجیت مسکرایا تھا جبکہ رانی بھوجہ راج کمار دی را دی کا بیٹا رائے کرن ہاس دیواس کی بیٹی رتن دیوی کی بیٹی رتن دیوی سب غور سے بھی ہاس دیواس کی راجہ بکر ماجیت کو دیکھ رہے تھے۔

اس موقع پر راجہ بکر ماجیت مسکرایا ایک گہری پیار بھری نگاہ اس نے اپنے پہلو میں کھڑی راج کمار دی را دی کا پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

”ہاس دیوی میں جانتا ہوں تم اپنے بیٹے رائے کرن کے لیے راج کمار دی را دی کا ہاتھ مانگتے ہو تمہارا بیٹا رائے کرن جوان ہے ایک عمدہ اور لا جواب شخص ہے اور میں یہ بھی فیصلہ کر چکا ہوں کہ تمہارے بعد یہی میرے لشکر یوں کا سپہ سالار ہوگا، لیکن تم دیکھتے ہو راج کمار دی را دی کی چھوٹی ہے اس حاطے کو ایک سال کے لیے اتنا وسیل ڈال دو ایک سال بعد ان دونوں کی شادی کا اہتمام کر دیا جائے گا۔“

راجہ بکر ماجیت نے ہاس دیواس کی بیوی بیٹا اور بیٹی سب خوش ہو گئے تھے۔ رانی بھوجہ اس کا بیٹا رائے کرن بھی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ تاہم راجہ بکر ماجیت کے دل میں کھڑی راج کمار دی را دی کے چہرے سے محکم کے جذبات اور تاثرات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

پھر راجہ بکر ماجیت اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہاں سے جانا ہی چاہتا تھا کہ اسی موقع پر اس کا ایک درباری ہرکارہ وہاں پہنچا اور بکر ماجیت کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”مہاراج اودھے پور کے راجہ رانا ساٹھا کا اپنی آیا ہے آپ کے نام اس کے پاس کوئی پیغام ہے حکم دیں تو اسے پیش کروں۔“

رانا ساٹھا اور اس کے اپنی کا سن کر راجہ بکر ماجیت اپنے سپہ سالار ہاس دیواس اور نائب سپہ سالار بیرنگھ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”یہیں بیٹھے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ رانا ساٹھا کا قاصد ہمارے لیے کیا لے کر آیا ہے؟“

ساتھ ہی بکر ماجیت نے اس آنے والے ہرکارے کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

”رانا ساٹھا کے اس قاصد کو کہیں لے آؤ۔“ اس کے ساتھ ہی وہ ہرکارہ وہاں سے ہٹ گیا تھا چنانچہ بکر ماجیت اس کی رانی راج کمار دی را دی کا بیٹا

ہاس دیواس اور اس کے اہل خانہ بیرنگھ اور اس کے اہل خانہ سب وہیں رک کر رانا ساٹھا کے اپنی کی آمد کا انتظار کرنے لگے تھے۔

چٹوڑیا اودھے پور میواڑ کا راجہ رانا ساٹھا ہندوستان میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ رانا ساٹھا تمام راجپوتوں کا قائد شمار ہوتا تھا۔ اس کی تمام زندگی مسلسل جنگوں میں گزری تھی ہندوستان کے سات راجہ اور ایک سو چار سردار اس کے اطاعت گزار تھے۔ اس سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رانا ساٹھا

ہندوستان کے ہندو راجاؤں میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے بہت پہلے سے حکومت اور امارت اس کے خاندان میں چلی آ رہی تھی یہ راجہ میواڑ کا حاکم تھا۔ دہلی اور اجیر کے راجہ جو قطب الدین ایک کے ہاتھوں تباہ ہوئے تھے رانا ساٹھا کے قبیلے میں سے تھے۔ اس کے علاوہ دو چار پشتوں کے بعد ان کا سلسلہ نسب آپس میں مل جاتا ہے۔

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ گوالیار کے راجہ بکر ماجیت کے ہرکارے نے رانا ساٹھا کے قاصد کو پیش کیا۔ قاصد جب اس شہر نشین پر آیا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر بکر ماجیت نے اس کا استقبال کیا اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہاں بیٹھے باقی لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے پھر رانا ساٹھا کے قاصد کو بکر ماجیت نے اپنے پاس بٹھایا پھر اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”اگر تم رانا ساٹھا کی طرف سے میرے لیے کوئی پیغام لائے ہو تو کہنا کہ میں بھی جانوں کہ پیغام کی نوعیت کیا ہے؟“

قاصد نے گفتگو سے پہلے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر بکر ماجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”مہاراج بات یہ ہے کہ سر قند کا مسلمان بادشاہ بابر ان دنوں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ کابل میں مقیم ہے جو جنرل ہم تک آئی ہیں ان کے مطابق اس کے بابا وطن میں اس کی حالت اجتر رہی ہے جس کی

بنا پر وہ اس سمت آیا ہے اور ہمارے خبر سے بھی خبریں لائے ہیں کہ وہ اب انہی علاقوں کو اپنا مسکن بنائے گا۔

چنانچہ مہاراج تنگ رام (رانا ساگا) چاہتا ہے کہ تیز رفتار قاصد بابر کی طرف روانہ کیے جائیں اور اسے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی جائے آپ کی طرف مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ رانا کو یہ اطمینان ہو جائے کہ ہم بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دیتے ہیں تو اس دعوت میں آپ بھی ہمارے شریک کار ہیں گے۔“

قاصد جب خاموش ہوا جب کچھ سوچتے ہوئے راجہ بکر ماجیت بولا اور کہنے لگا۔
”یہ رانا نے کیا سوچا ہے کہ ہم خود بابر کی طرف قاصد بھجوائیں اور اس سے کہیں کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو اور ہندوستان پر قبضہ کر لے اس لیے کہ ہمیں ہندوستان کی ضرورت نہیں ہے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد راجہ بکر ماجیت جب رکا جب وہ قاصد پھر بولا اور کہنے لگا۔
”مہاراج ایسی بات نہیں ہے۔ رانا نے بڑی سوچ بچار کے بعد بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دینے کا اہتمام کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں بابر اور اس کے لشکر کی برفانی علاقوں کے رہنے والے ہیں جب ہم انہیں دعوت دیں گے کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوں اور ہندوستان کے موجودہ مسلمان حکمران ابراہیم لودھی سے ہماری جان چھڑائیں اور یہ بھی اسے یقین دہانی کرائی جائے کہ جب وہ ابراہیم لودھی سے ٹکراتا ہے تو اس کی پوری مدد کی جائے گی جب رانا کامیاب ہے کہ بابر ہندوستان پر حملہ آور ہوگا۔ اگر وہ ابراہیم لودھی کو اپنے سامنے زیر کر دیتا ہے تو رانا کے مطابق ہمارے سامنے راستے صاف ہو جائیں گے۔ ابراہیم لودھی آپ جانتے ہیں انتہا درجہ کا ظالم شکی مزاج انسان ہے۔ جنگ و عارت گری میں خوش محسوس کرتا ہے جب اس سے جان چھوٹ جائے گی تو میں سمجھتا ہوں کہ۔۔۔“

قاصد اپنی بات مکمل نہ کر سکا اس لیے کہ طہریہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بکر ماجیت بول اٹھا۔

”بابر حملہ آور ہو ابراہیم لودھی سے ہماری جان چھڑائے اور ابراہیم لودھی کی جگہ خود ہندوستان کا حکمران بن کر جم کر بیٹھ جائے۔۔۔“

قاصد چونکا اور کہنے لگا۔
”مہاراج ایسی بات نہیں ہے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ بابر اور اس کے لشکر کی برفانی علاقے کے رہنے والے ہیں سر دی برداشت کر سکتے ہیں گرمی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے بعد جب وہ ابراہیم لودھی کو اپنے سامنے زیر کریں گے تو یقیناً وہ دہلی اور آگرہ کے خزانوں کو لوٹیں گے اس کے بعد وہ یہاں مستقل قیام نہیں کریں گے کچھ شہروں کے خزانوں کو لوٹ کر واپس چلے جائیں گے اس لیے کہ برفانی علاقے کے رہنے والے یہ لوگ ہندوستان کی گرمی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ دہلی اور آگرہ کے خزانوں کو لوٹ کر واپس چلے جائیں گے اور ان کے بعد ہندوستان پر رانا اور آپ جیسے راجاؤں کی حکومت ہوگی۔“

قاصد جب خاموش ہوا تب کچھ دیر تک عجیب سے انداز میں بکر ماجیت مسکراتا رہا پھر کہنے لگا۔
”جو ٹھنڈی ہوائیں آ رہی ہیں وہاں اسیا خواب ہے جو دن کے وقت خیالی ملاؤنگیاں بننے والے دیکھا جاسکتا ہے۔ بابر نے اگر ہندوستان کو فتح کر لیا تو کیا اس کا دماغ خراب ہے کہ وہ اس قدر علاقے فتح کرنے کے بعد واپس چلا جائے گا۔ ہاں اگر وہ واپس چلا جائے پھر تو سارے ہندوستان کے ہم ہی ماں ملک اور وارث ہوں گے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد بکر ماجیت رکا کچھ سوچا دوبارہ رانا ساگا کے قاصد کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔
”تم ہمارے ہاں قیام کر دو اس کے بعد واپس جا کر میری طرف سے رانا کو یہ پیغام دینا کہ ہم دو طرح کی حکمت عملی اختیار کریں گے ظاہراً ہم ابراہیم

لودھی کو یہی بتاتے رہیں گے کہ ہم اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اس کی مدد کے لیے تیار ہیں جبکہ اندرون خانہ ہم رانا ساگا کے ساتھ ہیں۔ رانا ساگا جو بھی پیغام بابر کی طرف بھجوائے گا اس سلسلے میں یہ سمجھنا کہ اس پیغام میں ہم بھی ساتھ ہیں۔“

بکر ماجیت کا یہ جواب سن کر رانا ساگا کا قاصد خوش ہو گیا تھا۔

جب قاصد چلا گیا تب کچھ دیر خاموشی رہی پھر ٹھنڈی ہوائیں آگئے بکر ماجیت کے سالار باس دیو نے کیا اور بکر ماجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
”مہاراج آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہمیں نہ کل کر رانا ساگا کا ساتھ دینا چاہیے اور نہ ہی ابراہیم لودھی کا بلکہ اندریہ اندر ہمیں ابراہیم لودھی کے ساتھ رہنا چاہیے۔ رانا ساگا اور اس کے ماتحت کام کرنے والے درجے ہم سے دور ہیں۔ ابراہیم لودھی ہم سے نزدیک ہے اگر ہم اپنے ابراہیم لودھی سے لگاؤ نہ کریں تو وہ لاؤ لشکر لے کر ہم پر چڑھ دے گا اور ہمارے علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا اور جب تک رانا ساگا اور اس کے حمایتی راجے ہماری مدد کو پہنچیں اس وقت تک ابراہیم لودھی ہمیں اپنے سامنے بری طرح رکھ کر ہمارے علاقوں پر قبضہ کر چکا ہوگا۔ لہذا ہمیں سب سے پہلے ابراہیم لودھی کو اس سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنا ہوگا۔

ساتھ ہی رانا ساگا کو بھی چینی چڑی باتوں سے مطمئن رکھنا ہوگا اس لیے کہ رانا ساگا کا یہ فیصلہ درست نہیں ہے۔

بابر نے ایک بار اگر ہندوستان کو فتح کر لیا تو کیا وہ بچے ہے کہ ان سرزمینوں کو چھوڑ کر واپس جائے گا اور متوجہ علاقے کی ہر چیز دوسروں کے حوالے کر کے چلا بنے گا بلکہ وہ یہاں کی قوتوں کو چٹا کرے گا۔“

اس موقع پر بکر ماجیت نے بڑی رازداری سے اپنی رانی بھرچہ، بیٹے رام نارائن اور راج کمار کی راویکا سے مشورہ کیا۔ سب نے اسی مشورے سے

اتفاق کیا جو گوالیار کے سپہ سالار باس دیو نے کہا تھا لہذا بکر ماجیت خوش ہو گیا تھا اور باس دیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”باس دیو تمہارا کہنا درست ہے اسی پر عمل کیا جائے گا۔“ اس کے بعد سب اپنی اپنی جگہوں پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ بکر ماجیت اپنی رانی بھرچہ راج کمار کی راویکا اور بیٹے رام نارائن کو لے کر راج محل کارن کر رہا تھا سپہ سالار اور نائب سپہ سالار بھی اپنی رہائش گاہوں کی طرف جارہے تھے۔

☆☆☆

جہاں تک بابر کا تعلق ہے تو ظہیر الدین باہر چودہ فروری سن چودہ سو تراسی عیسوی کو فرغانہ کے حکمران عرش مرزا کے ہاں پیدا ہوا۔ چودہ سو پچھانوے میں عیش مرزا کے انتقال کے بعد فرغانہ کا تخت و تاج صرف گیارہ سال کی عمر میں بابر کے حصے میں آیا۔

عرش مرزا اپنے والد کی طرف سے چوتھی پشت میں عظیم حکمران تیمور لنگ اور اپنی والدہ نثار خانم کی طرف سے جو پولس خان کی بیٹی تھی چنگیز خان کے بیٹے چغتای خان کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔

چنانچہ بابر کی رگوں میں اپنے والد کی طرف سے ترک اور والدہ کی طرف سے منگول خون دوڑ رہا تھا۔

بابر کا والد اور فرغانہ کا حکمران عرش مرزا تیمور لنگ کے بیٹے ابوسعید خان کے نو بیٹوں میں سے ایک تھا۔ سن چودہ سو باون میں وہ فرغانہ کے تخت پر بیٹھا اس وقت تیمور لنگ کی وسیع سلطنت میں صرف یہی علاقہ باقی رہ گیا تھا۔

سن چودہ سو اہتر میں سلطان ابوسعید خان کی وفات کے بعد اس کی سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئی اس کے سب سے بڑے بڑے محمود کو بدخشاں اور حصار کے علاقے ملے ایک اور بیٹے الخ بیک کے حصے میں کامل اور غزنی آئے جبکہ بابر کے والد عرش کو فرغانہ کا علاقہ ملا جس کا دارالحکومت

ان دنوں تیورنگ کی نسل میں سب سے زیادہ طاقتور حکومت سلطان حسین بیکرا کے ہاتھ میں تھی جو خراسان سے ہرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بابر کا چچا تھا مشرق میں اس کے علاقے پنج نک مغرب میں بستان اور دومان تک پھیلے ہوئے تھے۔ شمال میں خوارزم اور جنوب میں قندھار تک اس کی وسیع سلطنت تھی۔

سن چودہ سو چوراسی میں بابر کے تانائوس خان کا بیٹا جو اپنے باپ کے بعد حکمران تھا وفات پا گیا اس کی جگہ اس کے بھائی محمود نے لی، لیکن وہ بھی سال بھر میں وفات پا گیا۔ اس کا علاقہ اس کے دو لڑکوں میں تقسیم ہو گیا۔

سن چودہ سو چوراسی میں عرش کی وفات کے بعد فرغانہ کا تخت بابر کے حصے میں آیا جس کی عمر اس وقت صرف گیارہ سال تھی۔ تخت نشین ہوتے ہی بابر نے خود کو دشمنوں میں گھرا ہوا پایا۔

نیز اسے داخلی سازشوں کا بھی سامنا تھا۔ ان دشمنوں اور سازشوں کی وجہ سے اسے اپنا تخت ہر وقت غیر محفوظ محسوس ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ تخت نشین ہونے کے بعد ابتدائی کئی برس تک بابر کو اپنے دشمنوں بالخصوص اپنے رشتے کے بھائیوں کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف رہنا پڑا۔

آخر سن چودہ سو ستاونے میں بابر نے تاریخی شہر سمرقند پر قبضہ کر لیا یہ قبضہ سات ماہ کے مسلسل محاصرے کے بعد حاصل ہوا تھا۔ دراصل بابر سمرقند کے خوب صورت شہر سے بے حد متاثر تھا یہ شہر عظیم الشان مساجد، خوب صورت باغات، وسیع محلات اور متعدد تعلیمی اداروں کا مرکز تھا۔

اس سے پہلے بھی بابر نے سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے ناکامی ہوئی تھی آخر چودہ سو ستاونے میں اس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی، لیکن بابر اس شہر میں زیادہ عرصہ تک قیام نہ کر سکا تھا تقریباً تین ماہ تک اس نے اس خوب صورت شہر کا لطف

اٹھایا اس کے بعد شدید علالت کے باعث اور ساتھ ہی بغاوت کی وجہ سے اسے فرغانہ کی طرف توجہ دینا پڑی۔

بغاوت کی وجہ سے جب بابر نے سمرقند سے نکل کر فرغانہ کا رخ کیا تو فرغانہ کی بغاوت پر قابو پانا اس کے بس میں نہ رہا اور چچے سمرقند بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جب وہ دوبارہ سمرقند پہنچا تو اس کے پاس سمرقند تھا نہ تھا۔ فرغانہ پہلے ہی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ایک موقع پر وہ خود کہتا تھا کہ فرغانہ کی خاطر میں نے سمرقند چھوڑا، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ میں نے سمرقند پائے بغیر فرغانہ سے بھی ہاتھ دھو لیے۔

فرغانہ اور سمرقند دونوں سے ہاتھ دھونے کے بعد بابر اب ایک بے تاج اور بے تخت بادشاہ تھا۔ یہ دور اس کی زندگی کا غالباً بدترین اور ناکہ ترین دور تھا۔

اسی دوران ایک ازبک سردار شیبانی خان مظہر عام پر آیا۔ بابر نے جب دوبارہ سمرقند حاصل کرنے کی کوشش کی تو اہل سمرقند نے شیبانی خان کو بابر کے حملے کے خلاف دفاع کے لیے دعوت دی تھی، لیکن شیبانی خان نے مدد کو بھیجنے کے باوجود حاکم سمرقند کی عملاً کوئی مدد نہ کی۔

سن پندرہ سو ایک میں بابر اور شیبانی خان کے درمیان زبردست جنگ کے بعد بابر کو سری ملی کے مقام پر شکست ہوئی اور شیبانی خان نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا۔

جب محاصرہ ٹوٹنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو بابر کوصل کی درخواست کرنا پڑی۔ سمرقند کا قبضہ شیبانی خان کو مل گیا بابر اور اس کے خاندان کی جان بخشی اس شرط پر کی کہ وہ اپنی بہن کی شادی شیبانی خان کے ساتھ کر دے چنانچہ بابر اس شرط کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

دراصل فرغانہ اور سمرقند ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بابر نے بڑی مشکل سے سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا،

لیکن اس بار شیبانی خان اس سے سمرقند چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ بابر اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ انتہائی کمپرسی کی حالت میں نکل کھڑا ہوا۔ انتہائی مصائب اور مشکلات کے بعد وہ ٹھوکریں کھاتا ہوا اپنے ماموں اور تاشقند کے حکمران کے پاس پہنچا وہاں اس نے تین سال گزارے، لیکن اس تمام مدت میں وہاں اپنے ٹھوٹے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے بے قرار رہا۔

سن پندرہ سو تین میں بابر اور اس کے ماموں نے ایک بار پھر فرغانہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن شیبانی خان نے بابر کے لشکر کے کوچ کی خبر سن کر تیزی سے پیش قدمی شروع کر دی۔ بابر کی قسمت کا حکم یہ بھی گردش میں تھا کہ شیبانی خان کے ہاتھوں شیبانی خان کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی محکول قیدی، بے گھر گئے بابر مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا، لیکن اس مدت میں اس کا شہید قاتل کیا گیا اور وہ در بدر ٹھوکریں کھاتا رہا۔

اس عرصہ میں شیبانی خان نے مزید علاقے فتح کیے اور دو بڑے شہروں حصار، قندوز پر بھی اس نے قبضہ کر لیا اور اس طرح شیبانی خان کے ہاتھوں تیورنگ کی سلطنت کو مکمل طور پر زوال آ گیا۔

سن پندرہ سو چار تک کا دور بابر کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔ اس دوران اسے کئی طرح بھی سکون نصیب نہ ہوا جب اس نے محسوس کیا کہ وسط ایشیا میں در بدر پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں اور یہ زمین اس پر تنگ ہو چکی ہے۔ تب اس نے افغانستان کا رخ کیا کیوں کہ اس وقت وہاں ایک غیر مستحکم حکومت تھی اور عوام بھی حکومت کی چیرہ دستیوں سے تنگ تھے لہذا بابر کے لیے اس علاقے میں قدم جمانے کی مجالش موجود تھی۔

جہاں تک کاہل کی حکومت کا تعلق تھا تو وہاں پندرہ سو ایک میں وہاں کے حکمران الیغ بیگ کے انتقال کے بعد اس کا شیر خوار لڑکا عبدالرزاق اس کا

واحد جانشین تھا، لیکن ایک شخص محمد مقیم ارغون نے بعض عناصر کی پشت پناہی سے کاہل میں اقتدار قائم کر کے شیر خوار بادشاہ عبدالرزاق کی بہن سے شادی کر لی اور تمام پرانے سرداروں کو معزول کر دیا۔

ان اقدامات نے مقامی آبادی اور سرداروں کو ارغون کا مخالف بنالیا چنانچہ جب پندرہ سو چار میں بابر نے کاہل پر قسمت آزمائی کی تو اسے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اس طرح اس نے کاہل اور اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ میں پہلی بار بادشاہ کا لقب اختیار کیا کاہل پر قبضہ کرنے کے بعد بابر نے ارغون کو اس کے باپ کے پاس جانے کی اجازت دے دی جو قندھار کے نزدیکی رہتا تھا۔

کاہل پر قبضہ کرنے کے بعد بابر نے غزنی اور تنگ نہار کے علاقے اپنے دو بھائیوں جہانگیر مرزا اور ناصر مرزا کے حوالے کر دیے اب اس کے سامنے افغانستان میں اس واماں قائم کرنے اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کا کام تھا، لیکن ماضی قریب میں مصائب اور مشکلات کے دوران وہ اپنے رشتہ داروں اور ساتھیوں کی وفاداریوں کی آزمائش کے تحت تجربے سے گزر چکا تھا لہذا اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

دوسری طرف شیبانی خان آندھی اور اور طوفان کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا اور اب اس کا رخ پنج شہر کی طرف تھا۔ پنج شہر شہیر الدین بابر کے چچا حسین بیکرا کے پاس تھا۔ پنج کے بعد ہرات شہر کو بھی شیبانی خان کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان حالات میں حسین بیکرا نے بابر سے مدد کی درخواست کی بابر نے یہ دعوت قبول کر لی اور اسی وہ اپنے لشکر کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا کہ اسے حسین بیکرا کی وفات کی اطلاع ملی اس کے باوجود بابر نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور خراسان میں شیبانی خان کو زیر کرنے کے لیے ہرات کی طرف بڑھتا رہا۔

چچیس اکتوبر پندرہ سو چھ کو بابر ناقابل برداشت حالات کی وجہ سے پھر ہرات سے مڑا۔

کابل کا رخ کیا۔ برف پوش دروں سے گزرتا ہوا کابل کی طرف سے بڑھتے ہوئے وہ راستے میں پڑنے والے ہزارہ قبائل پر بھی حملہ کرتا رہا۔

اس دوران کابل میں ایک نئی سازش نے سر اٹھایا اس کے ایک بھائی مرزا خان کو تختہ نشین کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بابر نے اس سازش کو کچل دیا۔

پندرہ سو سات میں ازبک حکمران شیبانی خان خراسان پر حملہ کرنے کے لیے ایک بار پھر سر قند سے روانہ ہوا اور جون پندرہ سو سات میں اس نے ہرات پر قبضہ کر لیا اور ہرات کے حکمران شیبانی خان کے حملے کے خلاف دفاع نہ کر سکے۔

جب ہرات پر شیبانی خان کا قبضہ ہو گیا تب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ شیبانی خان کی طرف سے قندھار شہر کے لیے بھی خطرہ ہے۔ قندھار کے انتہائی عسکری اہمیت کے پیش نظر بابر اس پر قبضہ کرنے کا خواہش مند تھا۔

ہرات پر شیبانی خان کے قبضے کے بعد قندھار کے ارغون شہزادوں نے بابر سے مدد کی درخواست کی لیکن جونہی بابر نے ان کی مدد کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کیا ارغون حکمرانوں نے بابر کو مخالف کی ٹھان اور اس کے خلاف صف آراء ہونے کا فیصلہ کر لیا بہر حال ایک بار پھر بابر ارغونوں سے تیرہ ڈر زما ہوا ارغونوں کا سربراہ عظیم اور شاہ بیگ بابر کے ہاتھوں شکست اٹھا کر بھاگے اس کے فوراً بعد بابر کو اپنے بھائی ناصر مرزا کی طرف سے خبر ملی کہ شیبانی خان قندھار کا محاصرہ کرنے کے لیے کوچ کر چکا ہے۔ لیکن بابر نے انتہائی سیاست سے کام لیا شیبانی خان کا مقابلہ کرنے کی جگہ سرداروں کے مشورہ کرنے کے بعد جون پندرہ سو سات میں اپنی تمام فوجیں کو سامنے رکھتے ہوئے وہ قندھار سے بھی منہ موڑنے پر مجبور ہوا اور کابل چلا آیا اب اس نے ٹھان لی تھی کہ ہندوستان پر حملہ آور ہوگا دوسری طرف شیبانی خان نے قندھار پر قبضہ کیا قندھار کو اس نے فتح کر لیا لیکن قبضہ کیے بغیر واپس

ہو گیا کیونکہ اسی دوران اس کے اپنے علاقوں میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی تھی جس کی بنا پر اسے واپس جانا پڑا۔

پندرہ سو سو سے پندرہ سو دس تک تقریباً ایک سال کا عرصہ بابر نے بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ گزرا۔ پندرہ سو دس میں بابر کو شیبانی خان اور ایران کے بادشاہ اسماعیل صفوی کے درمیان جھڑپوں کی اطلاع ملی شیبانی خان اور اسماعیل صفوی کے درمیان دو دسمبر سن پندرہ سو دس کو مروہ کے مقام پر فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ بابر کی ہمدردیاں اسماعیل صفوی کے ساتھ تھیں حالانکہ شیبانی خان کے ہاتھوں خراسان کی فتح اور ازبکوں کے کرمان میں داخلے کے بعد اسماعیل صفوی کی فتح نامکن نظر آئی تھی لیکن قسمت نے اسماعیل صفوی کا ساتھ دیا اور اس جنگ میں شیبانی خان ہار گیا۔

شیبانی خان کی وفات کے بعد بابر کی بہن نام جس کا خازنہ بیگم تھا وہ اپنے والدین کی بجائے اسماعیل صفوی نے باعزت طور پر بابر کے پاس بھیج دیا اس طرح بابر اور اسماعیل صفوی کے درمیان دوستانہ تعلقات کا آغاز ہوا۔

اسماعیل صفوی نے محسوس کیا کہ اگر اسے اپنی حکومت قائم رکھنا تھی تو بہر حال تیور لنگ کی اولاد سے صلہ کن رویہ اختیار کرنا ضروری تھا۔ بابر بھی اسماعیل صفوی کی دوستی کو غور لیے عظیم حکومت قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ بہر حال اسماعیل صفوی اور بابر کے درمیان طے پایا کہ بابر صفوی کے نام کا سکہ جاری کر لے گا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھائے گا تاہم بابر نے فرغانہ اور کابل میں اپنے نام کا سکہ جاری کرنے کا حق محفوظ رکھا۔

شیبانی کے علاقے اسماعیل صفوی کی فتح کے بعد بابر اور صفوی کی عسکری قوت مستحکم ہو گئی اور انہوں نے بخارا کا رخ کیا معمولی مزاحمت کے بعد یہ شہر فتح کر لیا بعد ازاں سر قند کی طرف پیش قدمی کی گئی عوام نے بابر کا شان دار انداز میں استقبال کیا اس طرح

بابر اپنے دادا ابو سعید مرزا کے دور میں اس کے تمام زیر اثر علاقوں کی فرماں برداری کا مدعی ہو گیا۔ اکتوبر پندرہ سو گیارہ میں بابر نے سر قند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اب اس کی سلطنت میں تاشقند، کابل، قندوز، حصار، سر قند، بخارا اور فرغانہ جیسے علاقے شامل تھے۔

دوسری طرف ازبک سرداروں نے ایک بار پھر بابر کے خلاف حملہ کرنے کا عزم کیا۔ شیبانی خان کے بیٹے عبداللہ خان کو بخارا سے محرومی کا بڑا دکھ اور رنج تھا۔ مئی پندرہ سو بارہ میں بابر اور عبداللہ کے درمیان ہولناک لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں بابر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے لیے سر قند میں رہنا مشکل ہو گیا لہذا وہ حصار کے علاقے کی طرف ہجرت کر گیا۔

ازبکوں نے اس کا تعاقب کیا اسماعیل صفوی نے اپنے ایک سالار نجم بیگ کی قیادت میں باجوہ کی مدد کے لیے لشکر روانہ کیا مگر راستے ہی میں بابر کی طرف جانے سے پہلے اس نے رخ کا رخ کیا اس طرح رخ سے ہوتا ہوا وہ اکتوبر میں در بند کے مقام پر بابر سے جاملے۔ اس طرح اسماعیل صفوی اور بابر کی مشترکہ عسکری قوت نے ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد قرشی شہر کی طرف پیش قدمی کی۔

قرشی پر قبضہ کرنے کے بعد ایرانی سالار نے بخارا کی طرف کوچ کیا۔ بخارا پر ان دنوں شیبانی خان کے ازبکوں کا قبضہ تھا نجم بیگ ان سے ٹکرایا لیکن ناکام رہا لہذا اسے ناکامی کے بعد واپس قرشی شہر کا رخ کرنا پڑا۔ اس وقت بابر کی حالت یہ تھی کہ وہ تین بار سر قند حاصل کرنے اور محروم ہونے کے بعد چوٹی بار اس پر قبضہ سے مایوس ہو چکا تھا اس موقع پر اس کے مشکوک اتحادی بھی اس کے خلاف ہو چکے تھے بابر کو پہلے حصار شہر لوٹنا پڑا پھر وہ قندوز شہر پہنچا ایک بار پھر وہ ہندوس عبور کرنے کے بعد وہ کابل کی طرف گیا۔

سن پندرہ سو اٹھارہ تک بابر نے نہایت خاموش

زندگی گزاری تاہم وہ اس تمام مدت میں کابل اور غزنی کے آزاد قبائل کے خلاف نیرو ڈ زما رہا اس کا واحد مقصد ان قبائل کو آداب اطاعت سکھانا تھا اور یہ بلاشبہ اس کے لیے بہت ضروری تھا اس لیے کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے وہ اپنی پشت کو دشمن سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا اور وہاں استحکام پیدا کر کے اس کے بعد ہندوستان کا رخ کرنا چاہتا تھا اب پندرہ سو اٹھیں کا زمانہ آ گیا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب بابر نے ہندوستان پر حملوں کی ابتدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

گوالیار کے راج محل میں ایک روز راجہ بکرماجیت کی رانی بھوجہ حسین بمیل ٹھیکل خوبرو وجہہ اور رعب دار راج کماری راویکا، اس کا بھائی رام نرائن، اگلے بیٹھے کی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ راج محل کے اس کمرے میں راجہ بکرماجیت نمودار ہوا اور اس وقت گہری سوچ و بچار میں تھا۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ رانی بھوجہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ رانی بھوجہ، راج کماری راویکا اور رام نرائن کچھ دیر تک غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے پھر راج کماری راویکا نے گفتگو کا آغاز کیا اور راجہ بکرماجیت کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

”پتا چلی آپ کچھ عجیبہ سنجیدہ ہیں کیا معاملہ ہے۔“ اس پر ہلکا سا سیم بکرماجیت کے چہرے پر نمودار ہوا اور اپنی راج کماری راویکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”پتا! اپنی کوئی بات نہیں ہے۔“ بکرماجیت اپنی بات مکمل نہ کر سکا اس لیے کہ راج میں رانی بھوجہ بول اٹھی اور بکرماجیت کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ”آپ تو مستقر میں اپنے لشکر کا جائزہ لینے گئے تھے کیا معاملہ ہوا؟“

بکرماجیت نے ایک لمبا سانس لیا پھر کہنے لگا۔ ”آپ تینوں کو پتا ہوگا کہ جس وقت رانا ساگا نے ہماری طرف قاصد بھیجا تھا کہ وہ بابر کو ہندوستان

پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے رہا ہے اور ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے نظر ہو تو رانا ساٹگا کے قاصد کو میں اسی وقت مطمئن کر دیتا تھا ساتھ ہی ایک قاصد میں نے ابراہیم لودی کی طرف بھی روانہ کیا تھا اور اس پر انکشاف کر دیا تھا کہ رانا ساٹگا اور ہواگ کے دوسرے راجے سب مل کر بابر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے رہے ہیں اور اپنے لاؤ فکٹر کے ساتھ باہر اس وقت کاٹل میں قیام کیے ہوئے ہے۔ ہمارا پیغام ابراہیم لودی کو مل گیا تو وہ رانا ساٹگا کے خلاف تو حرکت میں نہیں آ سکا اس کے ساتھ بنا کر کھے گا اس لیے کہ وہ اپنے لیے بیک وقت دو خطرے کھڑے نہیں کرنا چاہتا ایک باہر آندھی اور طوفان کی طرح اس کی سرحدوں پر منڈلا رہا ہے اور ان حالات میں وہ یقیناً رانا ساٹگا کے ساتھ اپنے تعلقات خراب نہیں کرے گا۔

ابراہیم لودی کے خبر اسے یہ خبر دے چکے ہیں کہ بابر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے پہلے دو علاقوں پر حملہ آور ہونے کی ٹھان چکا ہے ایک باجوڑ و دوسرا بھیمیر۔

اب جو قاصد ابراہیم لودی کی طرف سے ہمارے پاس آیا ہے اس نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ ایک لشکر ابراہیم کی طرف سے اور پچھ لشکر کی جو چند دستوں پر مشتمل ہوں گے ہماری طرف سے ابراہیم لودی کے لشکر میں شامل ہو جائیں گے اور یہ متحدہ لشکر بابر کا مقابلہ کرے گا اسے بھیمیر رخ نہیں کرنے دے گا کافی الحال باجوڑ کو اس کے حال پر چھوڑا جا رہا ہے اس لیے کہ باجوڑ ایک طرح سے ابراہیم لودی کی دسترس سے باہر ہے۔

اسی سلسلے میں، میں نے اپنے سے سالار باس دیونا تب سے سالار بھیمیر تک سے بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور اس سلسلے میں جو فیصلہ ہوا ہے۔ وہ یہ کہ باس دیونا بنا رائے کرن ایک لشکر لے کر ابراہیم لودی کے لشکر میں شامل ہوگا اور یہ متحدہ لشکر بابر کا مقابلہ کرے گا۔

یہاں تک کہنے کے بعد بکر ماجیت رکا پھر ایک گہری نگاہ پہلے اس نے اپنی راج کماری راڈیکا پر ڈالی پھر رانی بھوجپہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا چونکہ باس دیونا کے ساتھ ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ راج کماری راڈیکا کی سگائی اگلے سال جب یہ بالغ ہو جائے گی رائے کرن کے ساتھ کر دی جائے گی لہذا باس دیونا چاہتا ہے کہ سگائی سے پہلے ہی پہلے رائے کرن لشکر میں اپنا ایک مقام اور اپنی ایک جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائے اسی بنا پر اس نے لشکر کی کمانداری خود اپنے بیٹے رائے کرن کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اب چند روز تیاری کرنے کے بعد رائے کرن لشکر کے ساتھ یہاں سے کوچ کر لے گا۔ ادھر ابراہیم لودی کا لشکر بھی کوچ کرے گا اور رائے کرن اس سے جا ملے گا یہاں تک کہنے کے بعد بکر ماجیت تھوڑی دیر کے لیے رکا کچھ سوچا اس کے بعد دوبارہ لاوا اور کہنے لگا۔

”مگر ہم نے اور ابراہیم لودی سے مل کر کیا کیا؟“

فکست دے دی اور اسے ہندوستان میں داخل ہونے دیا تو پھر ہندوستان میں ابراہیم لودی کے بعد سب سے زیادہ ہماری دھاک بیٹھ جائے گی ایسی دھاک جس کے سامنے رانا ساٹگا بھی سر اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا میں جانتا ہوں رانا ساٹگا باطنی طور پر اس میں اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر اسے خلاف ہے لیکن ہم اس کے ساتھ ظاہری تعلقات کو ٹھیک رکھنا بھی نہیں چاہتے اور باطن میں ہم پوری طرح ابراہیم لودی کا ساتھ دیں گے۔ اگر ابراہیم لودی کا ساتھ دیتے ہیں تو پھر یہ رانا ساٹگا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ہو سکتا ہے وہ بھی وقت آئے گا رانا ساٹگا کو ہم اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیں۔“

رانی بھوجپہ راج کماری راڈیکا اور راج کمار رام نرائن نے بکر ماجیت کی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا قبل اس کے کہ کوئی گفتگو کا آغاز کرتا راج محل کا ایک ملازم وہاں آیا اور رات کا کھانا تیار ہونے کی اطلاع

دی اس پر وہ چاروں اٹھ کر راج محل کے دوسرے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔

ابراہیم لودی اور گوالیار کے راجہ بکر ماجیت کا متحدہ لشکر بڑی تیزی اور برق رفتاری کے ساتھ بھیمیر کے دفاع کے لیے بڑھا تھا اور بھیمیر کے نواح میں انہوں نے بڑاؤ کر لیا تھا دوسری طرف بابر کا لشکر ابھی تک حملہ آور ہونے کے لیے نہیں پہنچا تھا۔

ابراہیم لودی کی طرف سے اس کے لشکر کا سالار قطب خان تھا یہ قطب خان بھی بقول مورخین عجیب و غریب قسم کا انسان تھا کمالی طور پر کم کا تھا خیالی پلاؤ بہت بناتا تھا اس سے متعلق تاریخ کے اوراق میں ایک حکایت بھی ہے جو پچھاسی طرح ہے۔

مورخین کہتے ہیں کہ قطب خان جو ایک حسین و جمیل نوجوان تھا سخاوت اور شجاعت میں اپنی مثال آپ تھا۔ اسی قطب خان نے اپنے متعلق ایک حکایت خود ہی بیان کی جو پورے ہندوستان میں مشہور ہوئی۔ یہ حکایت پچھاسی طرح ہے۔

کہتے ہیں جی جیوں سلطان ابراہیم لودی اپنے مرکزی شہر سے باہر گیا ہوا تھا قطب خان ایک روز شکار کے لیے نکلا۔ اچانک اسے ایک سفید کھال والا ہرن نظر آیا تو اس نے اس کی طرف اپنا ٹھوڑا دوڑایا ہرن آہستہ آہستہ بھاگتا رہا یہاں تک کہ اس کے پیچھے پیچھے قطب خان اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو گیا جب بڑا اور اس کے بڑا ٹھوڑا سے ایک وسیع میدان نظر آیا۔

کیا دیکھتا ہے کہ وہاں پر خیرے برپا ہیں وہ ہرن ان میں سے ایک خیرے میں گھس گیا۔ قطب خان بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں جا پہنچا اس نے دیکھا کہ وہاں ایک رنگین قاتلین پچھا ہوا تھا جس کے حاشیے پر موٹی اور جواہر نگے ہوئے تھے اور جس پر مرصع تخت بچھا ہوا تھا لیکن وہاں پر کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔

بقول مورخین وہ وہاں حیرت زدہ سا ہو کر کھڑا رہا نہ اس بات کا خیال تھا کہ لوٹ جائے نہ اس کی ہمت کے اندر چلا جائے وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس

سر بہت حکمت کا راز معلوم کرے اور کھون لگائے کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔

مورخین مزید لکھتے ہیں کہ اسی اثنا میں ایک دراز قد اور انتہائی دلکش اور خوب صورت دھندلہ خیمے سے باہر آئی اور انتہائی مٹھی گفتار کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت ہی رسک آواز میں قطب خان کو مخاطب کیا۔ ”حیران کیوں ہو کھوڑے سے اتر اور ہمارے کاشانے کی روشنی میں اضافہ کر دو تاکہ وہ مردست راز جو جو جانا چاہتا ہے جان جائے۔“

قطب خان چونکہ اپنے آپ کو شجاع اور بہادرتو سمجھتا تھا اور اس کے لیے اس کی شہرت بھی تھی۔ کھوڑے سے اتر کھوڑے کو اس نے خیمے کی طتاب سے باندھ دیا وہ خیمہ کئی حصوں پر مشتمل تھا جب وہ خیمے کے پہلے حصے میں داخل ہوا تو اسے لگا جیسے وہ پہر کا وقت تھا اور جب دوسرے حصے سے پردہ ہٹا کر پہنچا تو دیکھا چاروں طرف رات چھائی ہے اور ہزاروں مشعلیں روشن ہیں ایک بساط چمکی ہے اس پر ایک مرصع تخت بچھا ہے جس پر ایک انتہائی خوب صورت لڑکی بیٹی ہے اور اس کے ارد گرد کئی لالہ رخ کنیریں دست بستہ اور خدمت کے لیے کمر بستہ اور مستعد تھیں۔

چنانچہ جب تخت پر بیٹھی ہوئی لڑکی کی نگاہ قطب خان پر پڑی تو تخت سے اتر کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا مشروب کا جام اسے پینے کے لیے دیا اور اسے کہا۔

”آؤ اور کسی طرح کا خوف دل میں نہ لاؤ۔“ قطب خان نے مشروب کے دو تین جام لیے اور اس کے بعد گانا شروع ہوا گانا بھی ایسا کہ سننے والا مست ہو کر رہ جائے۔

قطب خان اس مجلس میں ان حوران حسین و جمیل کے ساتھ مشروب کے جام کے جام چڑھاتا رہا اور ان خوب صورتیوں کے اندر دل بھلاتا رہا یہاں تک کہ اسے اپنے کھوڑے اور گھڑی یاد تک نہ آئی۔ جب رات اختتام کو پہنچی تو اس نے راج کا سامان طلوع

ہوا تو بقول اس کے بے خوابی کے باعث اس پر نیند کا غلبہ چھا گیا اور ٹھوڑی دیر کے لیے اسے اوندھی آگئی جب آنکھ کھلی تو وہ جس کی نہ خیر نہ بد خوب صورت لڑکیاں تھیں۔

کیا دیکھتا ہے کہ اس کا ٹھوڑا ایک کھونٹے کے ساتھ بندھا ہے اس کے آگے دانا اور گھاس رکھا ہے اور وہ حیران رہ گیا اس کا خیال چاہا کہ ان خوب صورت لڑکیوں کی یاد میں گریبان چاک کر کے جنوں بن جائے پھر جب اپنے آپ میں آیا تو بڑا اداس افسردہ اور شرمسار بھی ہوا اور اپنے لشکر کی راہ لی۔

مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ جب اس نے یہ ماجرا سلطان ابراہیم لودھی کے سامنے بیان کیا تو سلطان بھی حیران رہ گیا بہر حال قطب خان جب تک زندہ رہا اس کے دل سے یہ حیرانگی نہ گئی اور بقول مورخین ان لالہ رخنوں کی یاد اس کے ذہن سے کبھی ختم نہ ہو سکی۔

بہر حال یہی قطب خان ایک روز اپنے لشکر کے اندر بکر حاجت کے سہ سالار پاس دیو کے بیٹے رائے کرن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ان خیموں میں سے ایک ان کے پاس آیا جو تیرا نہیں نے دکن پر نگاہ رکھنے کے لیے پھیلا رکھے تھے۔

جب وہ ان کے قریب آیا تب قطب خان نے اسے اپنے قریب بٹھایا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی کیا خبر لے کر آئے ہو؟“

اس پر آنے والا خبر بولا اور کہنے لگا بابر کا لشکر بھیرہ کی طرف کوچ کر چکا ہے اور اس سے پہلے بابر باجوڑ کوچ کر چکا ہے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد قاصد جب رکاب قطب خان نے اسے مخاطب کیا۔

”لشکر کا سالار کون ہے؟“

اس پر وہ خبر بولا اور کہنے لگا۔

”لشکر کا سالار جہانگیر قلی بیگ ہے اور اس کے ساتھ اس کا ایک نائب بھی ہے جس کا نام نورنگ

بیگ ہے۔“ قطب خان نے کچھ سوچا دو بارہ اس نے خبر کو غلط کیا۔

یہ جہانگیر قلی بیگ کیسا سالار ہے؟“ اس موقع پر خبر کے چہرے پر طنز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر قطب خان کو غلط کر کے کہنے لگا۔

”جہانگیر قلی بیگ بابر کا ایک ایسا سالار ہے جسے بابر ناپسند کرتا ہے اور اس کے لیے بابر کا حکم یہ ہے کہ وہ اس کے سامنے نہ آیا کرے۔“

یہ الفاظ سن کر قطب خان اور رائے کرن دونوں چونکے تھے پھر قطب خان نے پوچھا۔

”ایسا کیوں ہے؟ اگر بابر اس سے نفرت کرتا ہے اس نے اس کے لیے یہ حکم جاری کر رکھا ہے کہ وہ اپنا چہرہ لے کر بابر کے سامنے نہ جائے تو پھر بابر اسے اپنے لشکر یوں کا سالار بنا کر کیسے بیچ دیتا ہے؟“

اس پر خبر نے اپنے ہونٹوں پر زبان بھیری پھر اپنی بات کو آگے بڑھا تا ہوا وہ کہہ رہا تھا۔

”سالار اپنا درجہ کا نایاب اور بے مثل ہے۔ بابر اس سے نفرت اس لیے کرتا ہے کہ اس جہانگیر قلی کا باپ بابر کے بدترین دشمن شیبانی خان کا ایک بیٹا تھا۔ وہی شیبانی خان جس نے جگہ جگہ بابر کو شکستیں

دے کر اس کے آبائی وطن سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ شیبانی خان کا وہ سردار ایک معرکے میں بابر کے لشکر یوں کے ہاتھوں مارا گیا اس کے اہل خانہ بھی مارے گئے اور بے گلی ملک گرفتار ہوا۔ اس

وقت پر لڑکا تھا بابر کے لشکر میں اس کی قلی بیگ کو دس سال تک ایک غلام کی حیثیت سے رکھا گیا۔ بابر کے لشکر میں اس کا ایک برادر بھی شامل ہے جس کا

نام مہدی خواجہ ہے۔ یہ مہدی خواجہ جہانگیر قلی پر بڑا مہربان تھا اور اسی مہدی خواجہ نے جہانگیر قلی کو جبکہ وہ بابر کے لشکر میں غلام کی حیثیت رکھتا تھا حرب و ضرب

کے سارے فنون میں تاک کر کے رکھ دیا۔“

اب بابر کے لشکر میں صرف دو ہتیاں ایسی ہیں جو اس جہانگیر قلی بیگ سے بے پناہ محبت کرتی ہیں ان میں سے ایک بابر کا برادر یعنی مہدی خواجہ ہے اور

دوسری ہستی بابر کی بہن خانزادہ ہے یہی خانزادہ جو شیبانی خان کی بیوی بھی رہی تھی۔ جس وقت شیبانی خان نے سر قندق کیا تھا اور بابر کی گلوغلا صی اس بنا پر ہوئی تھی کہ وہ اپنی بہن کو شیبانی خان سے بیاہ دے

چنانچہ شیبانی خان سے خانزادہ کو بیاہ دیا گیا۔ اب خانزادہ شیبانی خان کے مرنے کے بعد بابر کے لشکر میں شامل ہے اور وہ اس جہانگیر قلی کو بیٹے جیسی محبت دیتی ہے اس لیے کہ اس جہانگیر قلی کا باپ ان دنوں جب خانزادہ شیبانی خان کی بیوی بھی خانزادہ کی عزت اس کا احترام ایک بہن کی حیثیت سے کرتا تھا

اس بنا پر خانزادہ اس جہانگیر قلی بیگ کو اپنا بھتیجا سمجھتی ہے اسے بھتیجی کہہ کر پکارتی ہے جبکہ خود جہانگیر قلی اسے چھو بھی کہہ کر پکارتا ہے۔ اب جہانگیر قلی سے نفرت کی یہی وجہ بابر کے پاس یہ ہے کہ وہ اس کے دشمن کا بیٹا تھا اسی بنا پر غلام بنایا گیا۔

اس سے نفرت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بابر اور اس کے سالار شراب پیاتے ہیں جہانگیر قلی بیگ واحد شخص ہے جو شراب کے نزدیک نہیں جاتا اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا وہ شراب سے نفرت کرتا تھا اور شریعت کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ یہ جہانگیر قلی بھی کوشش کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنانے اور شریعت کی پابندی کرے۔

دس سال کی غلامی کے بعد جب خانزادہ کے کہنے پر اس کے محلے سے غلامی کا طوق اتار دیا گیا تب ایک موقع پر بابر نے اسے اپنے دوسرے سالاروں کے ساتھ شراب کی محفل میں بلایا۔ وہ محفل میں بابر کے کہنے پر چلا تو کیا لیکن بابر کے سرداروں کے کہنے کے باوجود اس نے نہ شراب پی نہ جام کو ہاتھ لگایا۔ اس موقع پر بابر شاید نشے میں تھا اس نے حکم دے دیا کہ یہ شخص آئندہ اس کے سامنے نہ آیا کرے۔ چنانچہ جہانگیر قلی اب خود ہی بابر کے سامنے

نہیں آتا لیکن جہاں تک جنگی مہارت اور ضرب و حرب میں اس کے ہنر کا سوال ہے تو وہ بڑے بڑے تیغ زلوں اور جنگ کی مہارت رکھنے والوں کو اپنے

سامنے زیر اور سرنگوں کر کے رکھ دیتا ہے۔“

یہاں تک کہنے کے بعد وہ خبر کا پھر کنگے لگے۔

”میں نے تفصیل کے ساتھ بابر کے اس سالار سے متعلق آپ لوگوں کو بتا دیا ہے۔ جو اس کے نائب کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اس کا نام نورنگ بیگ ہے۔ یہ نورنگ بیگ بھی یوں جائیں بظاہر تو سنجیدہ نظر آتا ہے لیکن باطن میں یہ بھی جہانگیر قلی سے بے پناہ محبت کرتا ہے بہر حال یہ جہانگیر قلی بیگ اور نورنگ بیگ دونوں اپنے لشکر کو لے کر بڑی تیزی سے اور برقی رفتار کے ساتھ بھیرہ کا رخ کیے ہوئے ہیں۔“

جن دنوں بابر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ابتدا کر رہا تھا۔ ہندوستان کے حالات بھی عجیب و غریب تھے پورے ملک میں کئی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں شمالی ہند کی آزاد اور اہم ریاستوں میں دلی، گجرات، مالو، بنگال، میواڑ، خاندیش، پنجاب، سندھ اور شہر قائل ذکر ہیں یہ تمام ریاستیں باہم ہمدرد آزاد رہیں تھیں اور اس بنا پر ان کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی۔

بابر کے حملے کے وقت ابراہیم لودھی بظاہر سلطان تھا لیکن وہ ایک کمزور اور کس حد تک قابل حکمران ثابت ہوا لودھی سلطنت بھیرہ سے بہالا تک وسیع تھی لیکن درحقیقت اس کا دائرہ اقتدار صرف دلی یا آگرہ۔ دو آب، میانہ اور چندری تک محدود تھا۔ ان علاقوں میں بھی پنجاب پر دولت خان لودھی اقتدار قائم تھا۔ سندھ اور ملتان کے سوا چاندیو بنگال اور اڑیسہ آزادی حاصل کر چکے تھے اس طرح ابراہیم لودھی کی حکومت برائے نام رہی تھی اس کے بہت سے مقررین وزراء اور نمایاں درباری اس کے سخت رویے اور ضدی طبیعت کی وجہ سے تنگ آ چکے تھے اور کھلے لفظوں بغاوت پر آمادہ تھے۔

بہار کے درمیان لودھی نے مرکز کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ میواڑ کے راجہ رانا ساگ نے بھی ابراہیم لودھی کو تخت سے محروم اور دلی پر اپنا اقتدار قائم

کر لیا تھا۔

کرنے کے منصوبے بنالے تھے چنانچہ ان سازشوں کے باعث دلی کی سلطانی انتہائی کمزور پڑ گئی تھی اور حالات سازگار نہ تھے۔

دوسری مسلمان ریاست گجرات کی تھی جہاں سلطان مظفر شاہی کا اقتدار قائم تھا۔ سلطان مظفر ثانی نے اپنی ریاست کو کافی وسعت دے دی تھی اور بالوہ کے بہت سے علاقے بھی اس میں شامل کر لیے لیکن رانا ساٹگانے اس کی بددستی ہوئی حکومت کا مقابلہ کیا اور اس کی وسعت پسندی کو رد کر دیا۔

مالوہ شمالی ہند کی ایک اہم مسلمان ریاست تھی سلطان محمود ثانی باہر کے حملے کے وقت مالوہ کا حکمران تھا۔ سلطان محمود ثانی کی ریاست کے عملی اختیار پر ایک ہندو وزیر راف کی گرفت تھی۔ یہ گرفت اس حد تک مضبوط ہو چکی تھی کہ سلطان محمود اپنے اقتدار کے لیے خلیفہ محسوس کرنے لگا اس کی خواہش تھی کہ وہ گجرات کی مدد سے اپنے اس ہندو وزیر سے نجات حاصل کر لے لیکن راد کو میواڑ کے راجہ رانا ساٹگانے کی زبردست حمایت حاصل تھی اس نے رانا ساٹگانے کی مدد سے مالوں پر حملہ کیا سلطان محمود کو شکست دی اس طرح مالوہ پر براؤ قابض ہو گیا۔

شمالی ہند کی ایک اور اہم مسلمان ریاست بنگال تھی۔ باہر کے حملے کے وقت اس ریاست پر حسین شام نسل کا اقتدار قائم تھا اور سن چودہ سو اسیں میں علاؤ الدین حسین شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصرت شرت حاکم بنگال ہوا اور اسے باہر سے بھی کمر لیا پڑی۔

میواڑ شمالی ہند کی اہم ریاست تھی جو باہر کے حملے کے وقت اپنے عروج پر تھی۔ وہاں رانا ساٹگانے کا اقتدار تھا جو شب روز جنگ میں مصروف رہا۔ وہ اس وقت تک تقریباً ایک سو جنگیں لڑ چکا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی ہمدایہ ریاستیں اس کی قوت سے خائف نظر آتی تھیں رانا ساٹگانے کی دلی خواہش یہ تھی کہ پورے خطہ ہندو پاک پر اپنا اقتدار قائم کرے اسی خواہش کے تحت اس نے باہر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی

دعوت بھی دی تھی اور باہر کو براہیم لودھی کے خلاف ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے تو پنجاب سلطنت دلی کا ایک حصہ تھا اور سولہویں صدی کے آغاز میں ایک آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اس صوبے کا دلی ابراہیم لودھی کا ایک رشتہ دار دولت خان لودھی تھا لیکن وہ بھی ابراہیم لودھی کی ضدی طبیعت اور توہین آمیز رویے کے باعث بد دل ہو چکا تھا اس نے اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ رانا ساٹگانے کی طرح باہر کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی اس نے بھی دعوت دی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ ابراہیم لودھی کے خلاف باہر کی بھرپور مدد کرے گا۔

ایک اور ریاست خاندیش تھی۔ یہ سلطنت دلی کا ایک صوبہ تھا جو عادل خان فاروقی کی جدوجہد کے بعد آزاد ہو چکا تھا۔ عادل خاندان فاروقی نے چودہ سو ستاون سے پندرہ سو تین تک اس صوبے پر حکومت کی اس نے برہان پور کو خاندیش کا دار الحکومت بنایا اور عوام کی بہبود کے لیے دن رات کام کرتا رہا۔

سندھ اور کشمیر بھی آزاد ہو چکے تھے تاہم قبیلوں مورخین وہ برصغیر ہندو پاک کی سیاست میں کوئی قابل ذکر کردار نہیں کر رہے تھے۔

ہندوستان کا جنوبی حصہ یعنی دکن بھی باہر کی فتح ہند کے وقت انتہائی انتشار کے عالم میں تھا۔ اس وقت صرف باہمی حکومت اور دو بے عملی سلطنت قابل ذکر تھیں۔ باہمی حکومت دکن کی ایک شاہی اہم مسلمان ریاست تھی لیکن سولہویں صدی کے آغاز ہی میں اس کا زوال آچکا تھا اور ایک سلطنت کی جگہ پانچ مختلف حکومتیں جنم لے چکی تھیں جو اجماعی نظام شاہی حکومت کے علاوہ پنجاب پور کے عادل شاہ گولکنڈی کے علاوہ شاہ اور بیدار کے برید شاہ کی حکومت پر مشتمل تھیں یہ تمام ریاستیں باہمی تنازعات اور جھگڑوں میں جھلسا رہی تھیں۔ ہندو ریاست کے خلاف سب ہی متحد ہو جاتی تھیں۔

اس اعتبار سے باہر کے حملے کے وقت ہندو پاک پر کوئی مرکزی اور مضبوط حکومت قائم نہ تھی پورا ملک مختلف ریاستوں میں منقسم تھا اور ان ریاستوں میں بھی شدید باہمی اختلافات تھے۔ ان اختلافات کے باعث یہ ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدرد آزما رہی تھیں۔

کچھ ریاستوں نے باہر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت بھی دی۔ اس دعوت کا بنیادی مقصد سلطان دلی ابراہیم لودھی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ باہر کے لیے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہ ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اندرونی اختلافات اور انتشار کے باعث باہر کو کامیابی حاصل کرنے میں مزید مدد ملی۔

گو ہندوستان سیاسی اعتبار سے منقسم تھا لیکن اس میں تحریکیں بننے لگیں تھیں۔ اسے شامی اعتبار سے بیکار کر لیا تھا۔ ان تحریکیں بھی اہم اور نمایاں تھیں۔ تحریک تھی جس کا آغاز چودہویں صدی میں ہو چکا تھا لیکن ہندوستان میں مسلمان کی آمد کے بعد بالخصوص سولہویں صدی میں اس تحریک کو عروج حاصل ہوا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد ہندوں کے مذہبی خیالات پر خاصے اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوؤں مسلمانوں اور مسلمین نے اسلام کی روشنی میں ہندو مت کے اندر اصلاحات کی کوشش شروع کی۔ بھگتی تحریک کا پہلا مبلغ رام چچ تھا۔ بھگتی تحریک کے سب سے بڑے مبلغ کا نام دیو تھا جو مہاراشٹر کا رہنے والا تھا۔ اس نے خدا کی ذات واحد اور تمام مذاہب میں یکسانیت کی تبلیغ کی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہندو مت اور اسلام کے درمیان کوئی فرق نہیں کیونکہ بھگتی تحریک ذات بات کے اعتبار کو رد نہ کرتی تھی چنانچہ ہندوؤں میں چھوٹی ذات کے لوگوں نے بھگتی نظریات کے اثرات کو فوری طور پر قبول کر لیا۔

تاہم اس تحریک کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کے کچھ خیالات اور رسم رواج نشوونما پانے لگے۔ بھگتی تحریک کی وجہ سے

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بہت سے اختلافات بھی سر پڑ گئے اس تحریک نے فنی تعمیر اور ادب پر بھی نمایاں اثرات مرتب کیے۔ ہندو کی کتاب مہا بھارت اور ران ترنگی، ہنسکرت میں بھی ان کے فارسی تراجم ہوئے اور بہت سی فارسی اور عربی کتب کے ہندی میں ترجمے کیے گئے۔

یہی وہ حالات تھے جنہوں نے باہر کے دل میں ہندوستان کو فتح کرنے کی دلچسپی پیدا کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چوتھوں کے ہندو حکمران رانا ساٹگانے کے پاس ایک بڑی عسکری قوت تھی اور دیگر سارے مقامی راجہ اس سے خائف تھے اور اس کی اطاعت کا دہم بھرتے تھے۔

اس کے باوجود حالات ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے انتہائی سازگار تھے۔ کیونکہ رانا ساٹگانے ابراہیم لودھی سے خائف تھا۔ اس سے براہ راست ٹکرائنا نہیں چاہتا تھا جس کی بنا پر وہ دو مسلمان حکمرانوں کو آپس میں لگ کر فائدہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔

ابراہیم لودھی کا سالار قطب خان اور گوالیار کے راجہ بکر باجیت کے سپہ سالار پاس دیو کا بیٹا رائے کرن دیوؤں اپنے لشکر کو لے کر بھیمہ کے نواح میں پڑاؤ کر چکے تھے وہ دو سپہ سے پہلے بھیمہ پہنچے تھے ایک آدھادان اور پوری رات وہ اپنے لشکر کے ساتھ سستائے۔ یہاں تک کہ سامنے کی طرف سے باہر کا لشکر نمودار ہوا جس کی کمانداری باہر کا سالار جہانگیر قلی بیگ کر رہا تھا اور دوسرا سالار نورنگ بیگ اس کی نیاہت میں تھا۔

جہانگیر قلی بیگ نے اپنے لشکر کو بالکل قطب خان اور رائے کرن کے لشکر کے سامنے آگے روکا اور پڑاؤ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی قطب خان اور رائے کرن نے صلاح مشورہ کرنے کے بعد جنگ کی ابتدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس وقت دونوں اپنے لشکر کی صفیں درست کر رہے تھے اس وقت پاس دیو کا بیٹا رائے کرن ابراہیم لودھی کے

سالار قطب خان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”قطب خان میرے بھائی! میں چاہتا ہوں کہ چند دستے میں اپنے لیے مخصوص کر لوں جب جنگ اپنے زورور پر آئے گی تو میں ان دستوں کے ساتھ باہر کے سالار جہانگیر قلی بیک کا رخ کروں گا میں چاہتا ہوں کہ ہر حال میں اس کی گردن کاٹوں اگر میں ایسا کرتا ہوں تو اس کے دو فائدہ ہوں گے۔

پہلا یہ کہ باہر کے سالار جہانگیر قلی بیک کے مارے جانے کی وجہ سے اس کے لشکر کی بدول ہو کر بھاگ جائیں گے اور ہم دونوں فتح مند رہیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ میری چونکہ اگلے سال اپنے راجہ بکر ناجیت کی راج کماری کے ساتھ رگائی ہونے والی ہے چنانچہ اگر میں جہانگیر قلی بیک کا سر کاٹا ہوں اور ساتھ ہی اس کو شکست بھی دیتا ہوں تو پھر ہماری راج دہانی میں میری شہرت کا ڈھکا بچ جائے گا اور راج کماری اپنی خوشی سے میرے ساتھ بیاہ کرنے پر رضامند ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اب تک جو میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا ہے تو اس کا چہرہ بالکل سیاہ ہے اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں کے اندر میں اپنے لیے کوئی پیغام کوئی محبت بالکل نہیں دیکھتا۔“

یہاں تک کہنے کے بعد رائے کرن جب خاموش ہوا تب اس کی پیٹھ پیچھتاہوئے قطب خان کہنے لگا۔

”رائے کرن میں تمہیں ایسا کرنے کا موقع فراہم کروں گا اور اگر تم ایسا کرتے ہو تو واقعی تمہیں دو فائدے ہوں گے۔ تمہاری پوری راج دہانی میں تمہاری شہرت پھیل جائے گی اور راج کماری رادیکا اپنی خوشی سے تمہاری زندگی کی ساتھی بننے پر آمادہ ہو جائے گی۔“

قطب خان کے ان الفاظ نے رائے کرن کو مطمئن اور خوش کر دیا تھا پھر دونوں اپنے سامنے دیکھنے لگے اتنی دیر تک اپنا ہواؤ قائم کرنے کے بعد باہر کے سالار جہانگیر قلی نے اپنے لشکر کی صفیں

درست کر لی تھیں اور اس کا سالار نورنگ اس کے ساتھ تھا اس کے بعد دونوں اپنے لشکر کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

جہانگیر قلی بیک کھڑے رہے پیٹھے ہی بیٹھے لگتا تھا کہ وہ خاصا دراز قد تھا۔ عمر تھوڑی تھی لیکن جسم خوب کسا ہوا اور کڑھل تھا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی تھی شاید ایسا اس کی زندگی کے کئی حالات کی وجہ سے تھا۔ کچھ دیر تک عجیب سے انداز میں جہانگیر قلی بیک قطب خان اور رائے کرن کے لشکر کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید قطب خان اور رائے کرن اسے ہی جنگ کی پہل کرنے کا موقع دینا چاہتے تھے چنانچہ کچھ دیر تک قطب خان اور رائے کرن کے لشکر کا جائزہ لینے کے بعد جہانگیر قلی بیک کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ دشمن کے لشکر کا جائزہ لینے کے بعد وہ رگ رگ سے زندگی چھوڑنے والے فضا کے شہسواروں کو آٹھ اسرار میں ڈال دینے والے جان لیوا آنسو کی بجائے اور قسمت کی طرح اہل مرگ کا کھیل بھینچنے لگا۔ فطرت کی طرح لگنے لگا تھا۔

اس کے بعد جہانگیر قلی بیک نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس موقع پر اس کے چہرے پر عاجزی اور انکساری پھیل گئی تھی اس کے ساتھ ہی جنگ کی ابتدا کرنے سے پہلے وہ دعا مانگ رہا تھا۔

”اے اللہ تیری ہی ذات میں مثال اور عمل سے بالاتر ہے تو ہی ساری کائنات کا مالک ہے تیری کوئی مثل کوئی مثال نہیں ہے صرف تیری ذات ہی لازوال ہے۔

میرے مالک! سب روشنیاں سب اجالے یہ عرش و فرش لوح و قلم سب تیرے ہیں۔ تو ہی دریاؤں کوئی سے آٹھ کرتا ہے آسمان پر چاند تاروں کے کارروائوں کو تو ہی متحرک کرتا ہے انسان کی بند آنکھوں کو اللہ تو ہی نیند میں ڈھپاتا ہے۔

تو ہی پھولوں کو رنگ و خوشبو عطا کرتا ہے، بچوں کے لیے ماؤں کے دودھ کو تو ہی جل قہل کرتا ہے تو خالق اول ہے تو ہی کائنات کا نقش کر رہے اور قادر و عظیم

ہے ہر بیان آقا اور ہر ہنسا میرے اللہ میں نے کبھی تیری اطاعت میں کوتاہی نہیں کی ہمیشہ تیری وحدت کے چراغ روشن کیے ہیں اللہ یہ جنگ میری استقامت میری ریاضت کا امتحان ہے میرے اللہ میں تیرا ایک عاجز بندہ ہوں اس امتحان میں مجھے کامیاب اور کامران رکھنا میرے اللہ میری مدد فرماتا۔

یہاں تک کہنے کے بعد اپنی چمکی ہو گردن کو جہانگیر قلی نے سیدھا کیا ایک خشناک نگاہ اس موقع اس نے اپنے سامنے دشمن کے لشکر پر ڈالی اپنے سامنے نورنگ بیک کو مخصوص اشارہ کیا اس کے بعد اس نے شعلوں میں تپ کر موت کے جھکڑوں کی پوش کی طرح بھیریں بلند کرتے ہوئے اپنے لشکر کو آگے بڑھایا پھر وہ قطب خان اور رائے کرن کے لشکر پر چڑھ کر دشمن کے صفوں میں ڈھونڈنے والے کرب خیز فطرت کے طوفانوں، آنکھوں میں خوف ناک جیس، روجوں میں کرب کا احساس بھر دینے والی جذبول کی خوفناک حرارت دل کے آئینے گرچی کر تہی روجوں کے نیچے بارہ بارہ کر کے بر باد یوں کی دھول اڑاتے محنت کے خونی بکولوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

جوانی کا دروانی کرتے ہوئے قطب خان اور رائے کرن نے اپنے ہتھہ لشکر کو بدلتی کے درانوں میں بے راہ روی کی بدلتی آگ کی طرح آگے بڑھایا۔ پھر وہ جہانگیر قلی کے لشکر پر امیدوں کی فصلیں کاٹنے، ہولناک آگنی بھنور زرتیر یوں کو پیاس میں تبدیل کر کے دھوپ پھیلاتے تہ اور گونگے بہرے ٹیڑھے راستوں پر گرم ہواؤں کی ٹینوں کی طرح حملہ آور ہوئے تھے۔

اس طرح بھیرہ کے نواح میں میدان جنگ کے اندر موت اپنے سیاہ دروازے کھول کر ہر شے کو اپنے اندھے گردایوں کے اندر سونے لگی تھی خواہشوں کے بالا آسمان پست ہوتا شروع ہو گئے تھے جیسی جاتی آرزوئیں بے جان اور پیاسی زمین

خون مانگنے لگی تھی چاروں طرف جسموں کو روح سے جدا کرتی جھلسا دینے والی عرصیاں اور دلوں کی سطح پر ہولناک اور پر سوز اندیشے نزول کرنے لگے تھے۔

قطب خان اور رائے کرن نے کچھ دیر تک تو جم کر جہانگیر قلی کے لشکر کا مقابلہ کیا اس دوران چونکہ قطب خان کے ساتھ رائے کرن نے مشورہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے چند دستوں کے ساتھ آگے بڑھے گا اور جہانگیر قلی کا خاتمہ کر کے اپنی فتح کو یقینی بنائے گا۔

چنانچہ جب جنگ کی بھی اپنے عروج پر آ گئی تب رائے کرن اپنے مخصوص دستوں کو لے کر آگے بڑھا راستہ بناتا ہوا بالکل جہانگیر قلی کے سامنے آیا اور اس پر حملہ آور ہوا۔

جہانگیر قلی نے بڑی آسانی سے اس کے وار کو روکا۔ رائے کرن نے دوسرا وار کیا اسے بھی جہانگیر قلی نے روک دیا اس کے بعد جہانگیر قلی نے آؤ دیکھانہ تاؤ دفاع کو ترک کر کے وہ جارحیت پر اتر آ۔ پہلے ایک حملہ کیا اور اس کے دوسرے وار سے رائے کرن اپنے آپ کو بچانہ سکا اور جہانگیر قلی کی کھوار رائے کرن کی گردن کا خون چاقی ہوئی نکل گئی تھی۔

رائے کرن جب لاش کی صورت میں اپنے گھوڑے سے گر گیا تب جن دستوں کو وہ لے کر جہانگیر قلی پر حملہ آور ہونے کے لیے آیا تھا ان دستوں نے بھاگنا چاہا تو ان کی بدلتی کہ اس وقت تک جہانگیر قلی کے لشکر یوں نے انہیں گھیر لیا تھا ان میں سے کوئی بچ کر واپس نہ جاسکا اور سب کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔

رائے کرن کے مارے جانے کے بعد قطب خان اور رائے کرن کے لشکر میں بھگدڑی بچ گئی تھی انہوں نے شکست اٹھائی اور بھاگ کھڑے ہوئے دوسری طرف جہانگیر قلی اور اس کے نائب نورنگ خانی نے انہیں یوں آسانی سے بھاگ کر جانے کا موقع نہ فراہم کیا بلکہ جہانگیر قلی اور نورنگ خاں حرکت میں آئے اور بھاگتے دشمن کا انہوں نے قہروں کی طرف پکارے درد بھرے قہر موت بن کر ہر شے میں

اتر جانے والے زہر برہے کو حشرات کے نشے سے دوچار کرتے زمین کی تہہ سے ابھرتے پیاسے بگولوں اور بین کرتی اندوہناک صداؤں کی طرح تعاقب شروع کر دیا تھا۔

اس تعاقب کے دوران قطب خان اور رائے کرن کے لشکر کو مزید نقصان اٹھانا پڑا اور اپنا آپ بچانے کے لیے وہ فوراً دو حصوں میں تقسیم ہو گئے قطب خان اپنے شکست خوردہ لشکر کو لے کر دہلی کی طرف بھاگا جبکہ رائے کرن کے ساتھ جو اس کے چھوٹے سالار تھے وہ اپنے بچے بچھے لشکر کو لے کر گوالیار کی طرف بھاگ گئے تھے۔

گوالیار کے راجہ بکرماجیت کو اس کے پرچہ نویسوں نے اطلاع کر دی تھی کہ ان کے متحدہ لشکر کو شکست ہوئی ہے اور شکست اٹھانے کے بعد ان کا لشکر گوالیار کی طرف آ رہا ہے جبکہ ابراہیم لودی کا لشکر دہلی کی طرف چلا گیا ہے ساتھ ہی پرچہ نویسوں نے یہ بھی اطلاع کر دی تھی کہ جنگ کے دوران بکرماجیت کے سپہ سالار باس دیو کے بیٹے رائے کرن نے کیا حرکت کی تھی کہ اس نے جہانگیر قلی کا خاتمہ کرنا چاہا جواب میں وہ خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

رائے کرن کے مارے جانے سے گوالیار میں ایک طرح کا سوگ برپا ہو گیا تھا اس لیے کہ راجہ بکرماجیت اپنی راج کماری رادیکا کی سگائی ایک سال بعد باس دیو کے بیٹے رائے کرن کے ساتھ کرنا چاہتا تھا اب اس کے مرنے کی خبر جب گوالیار میں پہنچی تو پورے گوالیار میں ایک طرح کا ماتم اور سوز برپا ہو کر رہ گیا تھا۔

جس روز راجہ بکرماجیت کا شکست خوردہ لشکر گوالیار میں داخل ہوا اس روز راجہ بکرماجیت اپنے راج محل میں اپنے سپہ سالار اول باس دیو، سپہ سالار دوم بھیر سنگھ، رانی بھر جی، راج کماری رادیکا اور باس دیو کی بیٹی رتن دیوی سب بیٹھے لشکر کی شکست کے علاوہ رائے کرن کے مارے جانے پر بڑے اداس اور پر سوز سے ماحول میں گفتگو کر رہے تھے کہ انہیں

لشکر کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ یہ اطلاع ملتے ہی راجہ بکرماجیت نے رائے کرن کے تخت کا سر کرنے والے دو چھوٹے سالاروں کو طلب کر لیا چنانچہ ٹھوڑی دیر بعد وہ دونوں سالار بکرماجیت کے راج محل کے اس کمرے میں داخل ہوئے۔ بکرماجیت نے انہیں اپنے سامنے بٹھایا اس دوران اس کمرے میں کاٹ کھانے والی خاموش طاری رہی پھر بکرماجیت نے انہیں مخاطب کیا۔

”ذرا مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ کیا تعداد کے لحاظ سے ہمارا لشکر کم تھا؟“

اس پر ان دونوں سے ایک سالار بولا اور کہنے لگا۔

”مہاراج ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں باہر کے لشکر کے مقابلے میں ہمارا لشکر دو گنا تھا۔“

یہ الفاظ سن کر بکرماجیت ہی نہیں باس دیو اور بھیر سنگھ بھی چونکے تھے۔ اس کے بعد بکرماجیت کے بجائے سپہ سالار باس دیو بول اٹھا اور چھوٹے سالار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”اگر ہمارے لشکر کی تعداد باہر کے لشکر سے دو گنی تھی تو پھر ہمیں شکست کیسے ہوئی؟“

جواب دیتے ہوئے وہ سالار پھر بولا اور کہنے لگا۔

”در اصل بات یہ ہے کہ جنگ کی ابتدا سے پہلے جبکہ باہر کے لشکر ابھی ہمارے سامنے نہیں آیا تھا قطب خان اور رائے کرن نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ اس موقع پر رائے کرن نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے تو وہ انفرادی مقابلے کے لیے نکلے گا اور باہر کے سالار کو مقابلے کی دعوت دے گا اور اگر اس نے باہر کے سالار کو انفرادی مقابلے میں زیر کر لیا تو ہماری بیٹی رتن دیوی اور باہر کے لشکر کو شکست ہو جائے گی۔“

لیکن قطب خان نے رائے کرن کو ایسا کرنے

منع کر دیا اس کے بعد رائے کرن نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس وقت جبکہ جنگ اپنے زوروں پر آئے کی اس وقت دو تئوں کے ساتھ حرکت میں آئے گا اور اپنے لشکر کے سالار حملہ آور ہو کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے گا تاکہ اپنی فتح کو یقینی بنائے لیکن شاید بخت ہمارے ساتھ نہیں تھے اس لیے کہ جنگ جب خوب بھڑک اٹھی تو رائے کرن اپنی دستوں کے ساتھ باہر کے لشکر کے سالار کی طرف بڑھا اس پر حملہ آور ہوا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ باہر کے سالار کا ایک وار تو رائے کرن نے روک لیا دوسرا وار روک نہ سکا اور اس طرح رائے کرن اپنے پران ہار گیا۔ ہمارے سیکڑوں نے جب دیکھا کہ رائے کرن مارا گیا اور اس کی لاش اس کے گھوڑے سے نیچے گر گئی ہے تب وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ قطب خان نے یہ دیکھتے ہی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے اس پر باہر کے سالار نظام جس کا جہانگیر قلی ہے اور اس کے نائب نورنگ ایک نے بری طرح تعاقب کیا۔ ہمارے اور ابراہیم لودی کے لشکر کی تعداد مزید کم کی اور اس برپادی سے بچنے کے لیے آخر قطب خان نے یہ مشورہ دیا کہ لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو کر بھاگے چنانچہ قطب خان اپنے لشکر کو لے کر دہلی کی طرف چلا گیا اور ہمارا لشکر گوالیار کی طرف آ گیا۔

یہ ساری تفصیل جاننے کے بعد راجہ بکرماجیت نے ان دونوں چھوٹے سالاروں کو ہال سے جانے اور جا کر آرام کرنے کے لیے کہا اس پر وہ دونوں اٹھ کر راج محل کے اس کمرے سے نکل گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد ٹھوڑی دیر تک راج محل کے اس کمرے میں کاٹ کھانے والی خاموش طاری رہی پھر اس خاموشی کو باس دیوی کی بیٹی اور مرنے والے رائے کرن کی بہن رتن دیوی نے توڑا اور بے پناہ غصے کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہنے لگی۔

”مسلمانوں کے سالار نام جس کا جہانگیر قلی ہے اور جس نے میدان جنگ میں میرے بھائی کو موت کے منہ میں اتارا اب وہ زیادہ دن جی نہیں سکے

گا ہر صورت میں ہر حال میں اس کی گردن کاٹیں گے اور جب تک اس کی گردن نہیں کٹی اس وقت تک ہمارے گھر میں سکون اور چین نہیں ہو سکتا۔“

اس موقع پر راجہ بکرماجیت نے ایک گہری نگاہ رتن دیوی پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

”بیٹی! تیرا کہنا درست ہے۔ رائے کرن کا انتخاب میں اپنی بیٹی رادیکا کے لیے پران قلی کی حیثیت سے کر چکا تھا؛ مسلمانوں کے سالار جہانگیر قلی نے ایک طرح سے میدان جنگ میں میرے داماد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور اس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی ہم اگر اس کا سر میدان جنگ میں کاٹ نہ سکتے تو کسی نہ کسی طریقے سے اسے موت کے گھاٹ ضرور اتاریں گے۔“

اس موقع پر راجہ بکرماجیت کے خاموش ہو جانے کے بعد اس کی راج کماری رادیکا بھی بولی اور کہنے لگی۔

”باہر کا سالار جہانگیر قلی کہیں بھی چلا جائے ہم موت بین کر اس کا تعاقب کریں گے اور ہر صورت میں اس سے رائے کرن کا انتقام لیں گے وہ ہمارے ہاتھوں بچ نہیں سکے گا۔“

راج کماری رادیکا کے یہ الفاظ سن کر باس دیوی اور اس کی بیٹی رتن دیوی دونوں اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ اس کے بعد راجہ بکرماجیت کے کہنے پر سب راج محل کے اس کمرے سے نکل گئے تھے اس لیے کہ راجہ چاہتا تھا کہ باس دیو اور بھیر سنگھ کے ساتھ آنے والے لشکریوں کو تسلی دے اور جو لشکری میدان جنگ میں مارے گئے ہیں ان کے اہل خانہ کی بھی آسودگی کا سامان کریں۔

☆☆☆

دوسری طرف ابراہیم لودی کو بھی خبر ہو چکی تھی کہ اس کے اور گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے متحدہ لشکر کو ظہیر الدین باہر کے ایک سالار کے ہاتھوں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس کا سالار قطب خان شکست خوردہ لشکر کو لے کر دہلی کا رخ کیے



ہوئے ہے۔

جہاں تک ابراہیم لودھی کا تعلق ہے تو مورخین کا کہنا ہے کہ ابراہیم لودھی سکندر لودھی کا بیٹا بھلول لودھی کا پوتا تھا جب سکندر لودھی مر گیا تو اس کے دو بیٹے ایک ماں سے تھے ایک ابراہیم لودھی اور دوسرا جلال خان۔

چونکہ ابراہیم لودھی بڑا تھا اور بھلول مورخین حسن صورت اور سیرت سخاوت اور شجاعت جیسی صفات سے بھی متصف تھا لہذا امرائے لے گیا کہ وہ تخت پر بیٹھے۔

لہذا انہوں نے ابراہیم لودھی کو تخت نشینی کے قابل جانا اور اسے بادشاہ بنادیا۔ جس روز اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی بھلول مورخین اس روز شہنشاہی دربار کو طلائع جواہر نگار شامیانوں اور رنگ اور ذوق برق قالینوں سے آراستہ کیا گیا اور لودھی خان کا وہ تخت جس میں بڑے قیمتی اور گراں بہا موتی لگے ہوئے تھے ایک رنگ برنگ قالین پر رکھا گیا۔

امرا اور سالاران لشکر نے رنگ رنگ لباس اور کاہدار اور زرکار جیسے لباس پہنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کو بڑے خوب صورت ساز و سامان سے زیب و زینت دی گئی۔ مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ پہلے بھی کسی کی تخت نشینی کے موقع پر یوں دربار نہیں سجایا گیا تھا لہذا ابراہیم لودھی کی تخت نشینی کے وقت جو آرائش اور زیبائش کا اہتمام کیا گیا وہ قلوب یاد رکھا گیا۔

چنانچہ بھلول مورخین امرا اور سالاروں نے ابراہیم لودھی کو تخت پر بٹھایا اس کے حقیقی بھائی کو جس کا نام جلال خان تھا سلطان جلال الدین کا خطاب دے کر کچھ امرا اور اراکین سلطنت کے ہمراہ ایک لشکر دے کر جون پور کی طرف روانہ کیا اور اسے جون پور کا حاکم مقرر کیا۔ جلال خان جب جون پور کی طرف روانہ ہو گیا اس کے ساتھ اس کا خاصا بڑا لشکر بھی تھا تو اس کی روانگی کے بعد کچھ سازشوں اور فساد گروں نے طعن کی زبان کھولی اور ابراہیم لودھی کے کان میں یہ باتیں ڈالنی شروع کر دیں کہ سلطنت کے معاملے کو

مشترک رکھنا بہت بڑی غلطی ہے بادشاہی میں شرارت نہیں چل سکتی اور ان امرائے ابراہیم لودھی کو یہ بھی بتایا کہ کیا تم نے اگلے وقتوں کی وہ حکایت نہیں سن رکھی کہ ایک ہی پیام میں دو تلواریں اور ایک ہی سرزمین میں دو حکمران کس رہ سکتے۔

ابراہیم لودھی نے یہ سچے کی بات سنی تو بھائی سے جو عہد کر رکھا تھا اسے بالاطلاق رکھ دیا حالانکہ سارے امرا اور سالاروں کے سامنے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ دہلی کا تاج و تخت ابراہیم لودھی کے پاس رہے گا جبکہ جون پور اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کا حاکم اس کا بھائی جلال خان ہوگا اور اس کا مرکزی شہر جون پور ہوگا۔

چنانچہ اسے جب سازشوں اور چالپوسی کرنے والوں نے گھیرا تب وہ ان کی باتوں میں آ گیا اور کچھ قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد یہ قرار پایا کہ جلال خان کیونکہ ابھی جون پور کے باہر تخت تک نہیں پہنچا لہذا اس کی طرف قاصد بھیج کر اسے لکھتا چاہیے۔

چونکہ چند امور کی انجام دہی کے لیے اس کا تعاون اور اس کی موجودگی بہت ضروری ہے اس لیے کہ جلال خان کو چاہیے کہ نہایت تیزی سے واپس دربار دہلی کی طرف روانہ ہو جائے اور جن امور پر مشاورت کی ضرورت ہے ان کے حلق مشورہ کرنے کے بعد واپس چلا جائے ایسا کر کے نہیں ہی دونوں بھائیوں کی بھلائی ہے۔

اپنے امرا سے یہ خط لکھوانے کے بعد ابراہیم لودھی نے اپنے ایک سالار کو نام جس کا بیٹ جلال خان گرگ تھا بلکہ اس کا پورا نام بیٹ جلال خان گرگ انداز تھا اور جو کمکاری اور عیاری میں بڑا شہور تھا اسے ابراہیم لودھی نے اپنے بھائی جلال خان کی طرف روانہ کیا اور اسے یہ بھی ہدایت کی کہ خوشامد اور چالپوسی سے کام لے کر ہر صورت میں وہ جلال خان کو واپس دہلی لے کر آئے۔

لیکن حالات کی ستم ظریفی کہ ان سارے

حالات کی اطلاع پہلے ہی ابراہیم لودھی کے بھائی جلال خان کو پہنچی تھی چنانچہ ابراہیم لودھی کی نصیحت کے مطابق بیٹ جلال خان کے پاس پہنچا وہ ابھی جون پور کی طرف جارہا تھا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ بیٹ جلال خان کے ساتھ اس کے حراج کے مطابق باتیں نہیں بڑی خوشامد چالپوسی سے کام لیا، لیکن ساتھ ہی مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ جلال خان، بیٹ جلال خان کی چٹنی چڑی باتوں میں نہ آیا اور واپس دہلی جانے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔

چنانچہ بیٹ جلال خان اپنے ساتھ جن ساتھیوں کو لے کر گیا تھا ان کے ذریعے اس نے صورت حال سے ابراہیم لودھی کو مطلع کر دیا اور یہ اطلاع پا کر ابراہیم لودھی نے اپنے مقررین میں سے کچھ کو روانہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح جلال خان کو راہی کر کے دہلی لے آئیں لیکن ان مقررین کا کہنا بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔

جلال خان نے اسی کے لیے ہرگز کوئی قدم نہ اٹھایا اس صورت حال کی اطلاع جب ابراہیم لودھی کو ہوئی تو اس نے ایک آخری قدم اٹھایا اس نے جون پور صوبے کے امرا اور جاگیرداروں میں سے ہر ایک کو بڑی مہربانی اور محبت سے بھرپور فرمان بھیجے اور بڑے بڑے انعامات کی امید دلائی تاکہ جلال خان کی اطاعت سے اعتراض کریں اور جلال خان جون پور پہنچ کر جب انہیں بلائے تو وہ اس کے پاس اسے سلام کرنے کے لیے نہ چائیں۔

ایک اور خط کے ذریعے ابراہیم لودھی نے ذمہ دار لوگوں کو یہ بھی کہلا بھیجا کہ جو بھی ابراہیم لودھی کا یہ خط ان کے پاس پہنچے وہ جلال خان سے الگ رہیں اور اس کے احکامات کی تعمیل نہ کریں۔

مورخین لکھتے ہیں چونکہ قضاوند نے جلال خان کے تعصب میں سلطنت نہیں لکھی ہوئی تھی اس لیے سب بڑے بڑے امرا باغی ہو گئے اور کچھ نے اعلان مخالفت کی راہ اختیار کر لی تھی۔

لیکن جلال خان بھی بڑا تجربہ کار اور سیاستمدار تھا وہی کام کیا جو ابراہیم لودھی نے کیا تھا جس طرح ابراہیم لودھی نے تخت نشینی کے وقت کیا۔

مورخین کہتے ہیں جلال خان نے ایک جواہر نگار تخت آراستہ کیا کل کے دربار کو روک دیا آراستہ کیا۔ مجلس عالی ترتیب دے کر دربار عام منعقد کیا۔ اس دربار عام میں جلال خان نے صوبہ کے ملازمین، امرا اور سالاران لشکر کو حسب مرتبہ غلت تلوار، مکر بند بخت، گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ بہترین مناسب خطابات سے بھی نوازا۔

اس کے علاوہ جلال خان نے عوام اور خواص کو راضی کر کے قہراء اور سالکین پر خیرات کے دروازے کھول دیے ان کے معاش اور وظیفے میں اضافہ کیا اور امور سرداری کی از سر نو تازہ کرتے ہوئے سلطان ابراہیم کی مخالفت کی راہ لی۔

اس کے علاوہ جون پور پہنچ کر جلال خان نے اپنے نام کا خطبہ پڑھایا اور اپنے نام کے سکے جاری کیے جب اس نے کچھ قوت حاصل کر لی اور ایک لشکر بھی خوب ترتیب دے کر اس کی تربیت کا بھی کام سر انجام دے دیا تب اس نے ایک اور کام کیا۔

ابراہیم لودھی کے سالاروں میں سے ایک سالار جس کا نام اعظم ہمایوں تھا جو بڑا سمیٹر سردار اور سالار تھا اور ابراہیم لودھی اور جلال خان کا عزیز اور رشتہ دار بھی تھا۔ اعظم ہمایوں نے ان دنوں کا لکھر کے قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا چنانچہ جلال خان نے تیز رفتار قاصد اعظم ہمایوں کی طرف روانہ کیے اور ایک تحریری پیغام اس کی طرف بھیجا بھلول مورخین وہ پیغام کچھ اس طرح تھا۔

”آپ میرے باپ اور چچا کی جگہ ہیں اور خود جانتے ہیں کہ مجھ سے کوئی قصور سرزد نہیں ہوا اور عہد شکنی سلطان ابراہیم کی طرف سے ہوئی ہے۔ باپ کے ملک سے میرے لیے تجوز ابہت درشہ جو اس نے خود میرے لیے تجویز کیا تھا اب اس پر بھی اس نے اپنی نظریں گاڑی ہیں حالانکہ وہ میرا حقیقی بھائی ہے مگر

پھر بھی صلہ رحمی کے پیشے کو بے مردی کے پتھر سے توڑ رہا ہے اس لیے آپ کو چاہیے کہ حق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور مظلوم کی مدد کریں۔“

مورخین لکھتے ہیں کہ دوسری جانب اعظم ہمایوں دراصل سلطان ابراہیم لودھی سے آزرہ خاطر تھا اس لیے جلال الدین کی تحریر کا اس پر اثر ہوا اس نے کانچ کا محاصرہ ترک کر دیا اور جو لشکر اس وقت اس کے پاس تھا اسے لے کر وہ جلال خان کے ساتھ چلا۔

چند دن تک دونوں نے تپاری کی اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اودھ پر حملہ آور ہو کر اپنے ماتحت علاقوں میں اضافہ کریں چنانچہ جلال خان اور اعظم ہمایوں دونوں ایک لشکر لے کر اودھ کی طرف روانہ ہوئے۔ دلی اودھ مقابلے کی تاب نہ لا کر کڑھ کی طرف بھاگ گیا اور اس ساری صورت حال سے اس نے ایک قاصد کے ذریعے ابراہیم لودھی کو مطلع کر دیا۔

یہ صورت حال جان کر ابراہیم لودھی چونکا اس وقت اس کے پاس دوسرے چار بھائی بھی موجود تھے جو دوسری ماؤں سے تھے۔ ابراہیم لودھی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے ان چار بھائیوں کو اس نے ہائی کے قلعے میں بند کر دیا اور ان پر ایک لشکر کا کڑھ پہرہ بٹھایا بعض مورخین کہتے ہیں کہ ان پر نظر رکھنے کے لیے ابراہیم لودھی نے پانچ سو سواروں کو مقرر کیا اور ان سواروں کا سرکردہ اور سالار ایک شخص محمد خان کو مقرر کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ابراہیم لودھی کو یہ فکر بھی لاحق ہو گئی تھی کہ اعظم ہمایوں کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے سالار اور امرا بھی جلال خان کے ہاتھوں اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیں چنانچہ ان خدشات کو سامنے رکھتے ہوئے ابراہیم لودھی نے تمام امرا کو منصب خلف اور زر مال دے کر ان کی خوشنودی اور شکر گزاری حاصل کر لی۔ خزانچی کو حکم دیا کہ سیاہ کے واجبات سرکاری خزانے سے ادا کریں یہ بھی حکم دیا

کہ لشکریوں کو ایک ماہ کی تنخواہ بطور انعام بھی دی جائے اس کے بعد ابراہیم لودھی نے ایک جرار لشکر کے ساتھ دہلی سے جون پور کی طرف کوچ کیا تھا۔

دوسری طرف اعظم ہمایوں اور جلال خان کے درمیان بھی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے چنانچہ اعظم ہمایوں نے جلال خان کا ساتھ ترک کر دیا۔ ابراہیم لودھی اپنے لشکر کے ساتھ کھنار کو کوچ کرتے ہوئے جب بھکانو کے مقام پر پہنچا تو اسے خبر ملی کہ اعظم ہمایوں اور اس کا بیٹا جلال خان جلال خان کا ساتھ چھوڑ کر اور اس سے ناراض ہو کر ابراہیم لودھی کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔

یہ خبر سن کر ابراہیم لودھی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی جس قصبے میں وہ پہنچا تھا وہیں اس نے قیام کر لیا اور بقول مورخین وہیں اس نے دربار لگایا۔ جس روز اعظم ہمایوں اور اس کا بیٹا جلال خان دونوں وہاں پہنچے ابراہیم لودھی کے حکم پر اس کے سارے سالاروں اور امرائے شان دار انداز میں ان کا استقبال کیا چنانچہ اعظم ہمایوں اور اس کا بیٹا جلال خان جب دونوں ابراہیم لودھی کے پاس پہنچے تو مورخین کہتے ہیں ابراہیم لودھی نے انہیں اپنے حق میں کرنے اور انہیں خوش کرنے کے لیے انہیں بڑے قیمتی مرصع کمر بند خنجر اور بڑے عمدہ اور قیمتی ہاتھیوں سے نوازا۔ ساتھ ہی ایک خاصا بڑا لشکر تیار کیا اس لشکر کا کماندار اعظم ہمایوں کو مقرر کیا گیا اور اس کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ وہ جلال خان کے خلاف حرکت میں آئے۔

جلال خان نے اس وقت قلعہ کانچ کے مقام پر قیام کر رکھا تھا چنانچہ جب اسے خبر ہوئی کہ اعظم ہمایوں اس کا ساتھ چھوڑ کر ابراہیم لودھی سے چلا ہے اور اب ابراہیم لودھی نے اسے ایک خاصا بڑا لشکر دے کر اس پر حملہ آور ہونے کے لیے روانہ کیا ہے تو جلال خان نے بھی ایک قدم اٹھایا۔

چنانچہ جلال خان اپنے تئیں ہزار کے لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا اس کا خیال تھا کہ اعظم ہمایوں نے آگرہ لپی اور جون پور پر

حملہ کر دیا تو اتنی دیر تک وہ آگرہ پر قبضہ کر کے ایک طرح سے ابراہیم لودھی کو اپنے سامنے مفلوج کرنے کی کوشش کرے گا۔

ابراہیم لودھی کے لشکر نے کانچ کو محاصرے میں لے لیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس پر قابض ہو کر اسے تباہ و برباد کر دیا چنانچہ جب ابراہیم لودھی کو خبر ہوئی کہ اس کا بھائی جلال خان تو اپنا تئیں ہزار کا لشکر لے کر بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ آگرہ کا رخ کر رہا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین ٹھسک کر رہ گئی۔

چنانچہ اسی وقت اس نے ایک لشکر ملک آدم کا کڑھ کی سرکردگی میں دے کر آگرہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیا۔ آدم کا کڑھ بڑی تیزی سے آگرہ پہنچا وہ جلال خان سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ جلال خان جانتا تھا کہ کانچ کے پہلے آگرہ میں لوٹ مار کرے مگر مورخین کے مطابق آدم کا کڑھ نے جیلوں بہانوں سے اور جلال خان کے مطابق بائیس بنا کر اسے اپنے اس ارادے سے باز رکھا اور ساتھ ہی قاصد بھیج کر اپنی مدد کے لیے ابراہیم لودھی سے ایک اور لشکر طلب کر لیا۔

آدم کا کڑھ کا پیغام ملنے کے بعد ابراہیم لودھی حرکت میں آیا چنانچہ اس نے آدم کا کڑھ کی مدد کے لیے اٹھارہ ہزار سوار اور پچاس جنگی ہائی تک کے طور پر آدم کا کڑھ کی طرف روانہ کیے چنانچہ یہ لشکر جب آدم کا کڑھ کے پاس پہنچا تب اس کا حوصلہ بڑھ گیا اس نے جلال خان سے اپنا رویہ بدل لیا اور اس نے فوراً جلال خان کو پیغام بھیجا۔

”اگر سلطنت کی ہوس سے باز آ کر جیسا کہ امرا کا طریقہ ہے شامی پتر۔ آفتاب گیر نوبت اور تخت چھوڑ دو تو میں ابراہیم لودھی سے درخواست کروں گا کہ تیرا قصور معاف کر دے اور تجھے بدستور جون پور کا صوبہ دے۔“

اس موقع پر مورخین لکھتے ہیں کہ بد نصیب جلال خان نے جو کاروبار سلطنت کے ساتھ کوئی خاص محبت نہ

رکھا تھا اب جو تئیں ہزار سوار کا ہزار لشکر اپنے پاس ہونے کے علاوہ جنگی ہاتھوں کی موجودگی میں بڑے بڑے پٹن اور کمزوری کا مظاہرہ کیا اور اس شرط پر راضی ہو گیا۔ اس موقع پر اس کے لشکر میں اس کے چھوٹے بڑے سالار تھے۔ انہوں نے جلال خان کو بڑا سمجھایا کہ ان شرائط کو قبول کرنا نہ صرف بزدلی ہے بلکہ اس طرح ابراہیم لودھی کی اپنی مرضی کے مطابق تمہارے ساتھ سلوک کرے گا۔ جلال خان کو اس کے سالاروں نے یہ بھی سمجھایا کہ ہم کوشش نہ کی سال سے تمہارے تنگ خوار طے آ رہے ہیں اگر تم ان شرائط کو جو آدم کا کڑھ نے پیش کی ہیں ماننے سے انکار کر دو تو تمہارے حق میں بہترین جرات مندی اور جاں بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابراہیم لودھی کے خلاف ہم حرکت میں آئیں گے۔ انہوں نے جلال خان کو یہ بھی سمجھایا کہ حق دینے والی خداوند قدت دس ذات ہے۔

کچھ سالاروں نے جلال خان کو یہ بھی مشورہ دیا کہ ابراہیم لودھی تندر مزاج ہے وہ اپنے باپ کے سالاروں اور امروں سے بھی بدسلوکی سے پیش آتا ہے اور اس کا انجام یہ ہو گا کہ سالار اور امرا ایک نہ ایک روز اس کے خلاف ہو جائیں گے لہذا ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دو۔

لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ کیونکہ جلال خان کے برے دل اسے آوازیں دے رہے تھے اسی بنا پر وہ اس شرط کو ماننے پر تیار ہو گیا اور شامی علاقے جیسے چتر آفتاب گیر نوبت اور تخت وغیرہ اس نے آدم کا کڑھ کے حوالے کر دیے تاہم جو تئیں ہزار کا لشکر اس کے پاس تھا اسے اپنے پاس رکھا اور دہلی کی طرف بڑھا دوسری طرف آدم کا کڑھ نے ساری صورت حال سے قاصد کے ذریعے ابراہیم لودھی کو آگاہ کر دیا تھا۔

ابراہیم لودھی کو جب یہ خبر ملی تو اس نے اعظم کا کڑھ کی پیش کردہ شرائط کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ وہ ایک لشکر لے کر نکلا تا کہ دہلی پہنچنے سے پہلے ہی جلال خان پر حملہ آور ہو کر اس کے لشکر کے علاوہ اس کا بھی خاتمہ کر کے رکھ دے۔

بش ماسٹر

احمد صغیر صدیقی

اس کی سانسیں دھول سے اٹ گئیں۔ اس نے سوچا میری سانسیں بند ہو رہی ہیں۔ موت کے انکشاف پر مگر وہ حیرت انگیز طور پر پریشان نہیں ہوا

ایک نفسیاتی بیوی کی کہانی جسے لگتا تھا کہ اس کا گھر اس کی موت کا باعث بنے گا

احباب یہاں آئے تو ان کے لباس اور جوتوں وغیرہ کا کیا حال ہوگا۔ کیا وہ اس خاک میں اٹے مکان میں منہ پر دھال رکھے بغیر داخل ہو سکیں گے۔ منروا اس وقت واقعی ایک بڑے مسئلے سے دوچار تھی۔ مکان کی گرد کے خلاف اس کا سب سے مضبوط ہتھیار یعنی آٹو چیک ویکیم کلینر عارضی طور پر ناکارہ پڑا تھا۔ یہ زیادہ پرانا نہیں تھا کسی معمولی خرابی کے باعث یہ ابھی درکشاپ میں پڑا تھا۔

منروا سخت الجھن میں تھی۔ وہ سسل دیکھ رہی تھی کہ مکان میں گرد پھیل رہی ہے۔ ہرگز تاحہ بالکل غیر محسوس طریقے سے فضا میں لاکھوں نادیہ ذرات کا اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ مکان اور منروا کے درمیان ہونے والی اس کشش میں مکان کا پلہ بھاری پڑ رہا ہے۔ یہ بات منروا بھی محسوس کر رہی تھی اور وہ یہ سوچ سوچ کر کھیانی رہتی تھی کہ اگر اس کی سہیلیاں اور

ہندوستان کا سلطان سمجھنے لگا تھا چنانچہ ان حالات میں کسی خوف و خطر کو خاطر میں لانے بغیر اس نے بڑی سختی سے گوالیار کے قلعے کا محاصرہ کر لیا ان دنوں گوالیار کا راجہ موجودہ راجہ بکر ماجیت کا باپ راجہ مان سنگھ تھا۔ راجہ مان سنگھ گزشتہ کئی سالوں سے سلامین دہلی کی مزاحمت کرتا چلا آ رہا تھا لیکن اس موقع پر وہ فوت ہو گیا اور اس کے بیٹے بکر ماجیت نے اس کی جگہ لی چنانچہ کئی گھڑاؤ کے بعد ابراہیم لودھی نے قلعہ فتح کر لیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ گوالیار کے قلعے کے دروازے پر تانے کی ایک گائے تھی جو قلعے کے دروازے پر نصب تھی اور آپ ہی آپ آواز نکالتی تھی۔ ایسا وہ ہوا کہ دوش پر کرنی تھی اس گائے کو لا کر ابراہیم لودھی نے آگرہ شہر کے دروازے پر رکھ دیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اکبر کے زمانے تک یہ گائے آگرہ میں دیکھی گئی تھی۔

دراصل سلطنت اور جاہ حشمت کا مشروب ایسا میٹھا ہوتا ہے کہ حکمران اس کی خاطر بھائی کا خون بھی بہا دیتے ہیں اپنے سر پر زبرد اور چھل کا تاج رکھتے ہیں اور دوسروں کے سر پر بدھتی کی خاک ڈالتے ہیں، چنانچہ عاقبت کوئیں سوچتے ہیں کہ ابراہیم لودھی نے کیا کیا اس نے اپنے بھائی ابراہیم کا تو خون کر دیا لیکن یہ منہ سوچا کہ ہر ایسے بڑے کام کی جزا اور سزا بھی ہوتی ہے اس لیے اچھے لوگ وہی ہیں جو خلق خدا سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے اور جو بڑے کام کھاتے ہیں اس کا خمیازہ وہ ضرور دیکھتے ہیں چنانچہ اپنے بھائی کو اپنے زیر کرنے کے بعد اور گوالیار کے راجہ کو بھی اپنا حکم کرنا پڑا کے بعد ابراہیم لودھی دہلی آیا اور مورخین لکھتے ہیں کہ اس موقع پر غرور جوانی کے باعث ابراہیم لودھی جو پہلے ہی چند مزاحج تھا اب زیادہ بد مزاج ہو گیا ایک دن وہ باپ کے امرا سے بدسلوکی سے پیش آئے لگا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انہیں سزا نہیں دینے لگا۔

اس کے اس سلوک کے بعد امرا اس سے بدگمان ہونے لگے اس پر اس نے بعض کو قید میں ڈالا اور دوسروں پر سختی کرنے لگا۔

اس کے اس سلوک کے بعد امرا اس سے بدگمان ہونے لگے اس پر اس نے بعض کو قید میں ڈالا اور دوسروں پر سختی کرنے لگا۔

(جاری ہے)

ابراہیم لودھی اس وقت تک آگرہ پہنچ چکا تھا جبکہ دہلی میں اس نے ایک شخص کریم داد کو دہلی کی باہمانی کے لیے مقرر کیا اس کے بعد وہ گوالیار کی طرف بڑھا خود اس نے ایک طرف بڑا ڈ کر لیا جبکہ اپنے نامور سالار جو اس کا رشتہ دار بھی تھا جس کا نام اعظم تھاموں تھا اسے حکم دیا کہ وہ گوالیار کے قلعے پر حملہ آور ہو کر اسے فتح کرے۔

دوسری طرف جب جلال خان کو خبر ہوئی کہ ابراہیم لودھی کو اس پر حملہ آور ہونے اور اس کا خاتمہ کرنے کے لیے گوالیار کا رخ کیے ہوئے ہے تو وہ گوالیار سے نکل کر مالوہ کی طرف بھاگا لیکن مالوہ میں جب اسے کسی نے پناہ نہ دی تب جلال خان بک سنگھ کی طرف گیا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہاں کچھ نوادروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا جنہوں نے ابراہیم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے ابراہیم لودھی کے پاس بھیج دیا ابراہیم نے اس خوش خبری سے خوش ہو کر ایک بہت بڑا جشن ترتیب دیا جس میں جلال خان کے ہاتھوں کو دستار سے باندھ کر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ ابراہیم لودھی نے ظاہری طور پر یہ سزا تجویز کی کہ اسے ہاسی کے قلعے میں بند کر دیا جائے لیکن خفیہ طور پر اپنے سالار احمد خان کو مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ جس وقت اس کے سگ جوان جلال خان کو دہلی سے ہاسی کی طرف لے جا رہے ہوں تو وہ راستے ہی میں جلال خان پر حملہ آور ہو اور اسے قتل کر دے چنانچہ ایسا ہی ہوا جس وقت جلال خان دہلی سے ہاسی کی طرف جا رہا تھا احمد خان حملہ آور ہوا اور اس نے جلال خان کو قتل کر دیا۔

جلال خان کا خاتمہ کرنے کے بعد ابراہیم لودھی کے حوصلے بڑھ گئے اب وہ اپنے آپ کو تنہا



دے یہ منروا کے پاس یہ جنگ لڑنے کے لیے کچھ اور ہتھیار بھی تھے۔ مثلاً جھاڑو، ڈسٹ بن، برش، ڈسٹر وغیرہ۔ مگر یہ سارے ہتھیار کلینز کی عدم موجودگی میں زیادہ کارآمد نہیں تھے ان سے صرف سطح کی گردیں صاف ہو سکتی تھیں۔ یہ چیزوں میں بھری گرد کو بٹھکا لے سکتے تھے۔

ویکیم کلینز کی عدم موجودگی منروا کے دماغ پر سوار ہو گئی تھی۔ وہ کوئی کام دل دیتی تھی جس سے نہیں کر رہی تھی اور پھر نچالے کر بٹھکا کر فرش صاف کرنے کی بھی تو اسے ہاتھ شب اور کھڑکیوں پر بھی خاک کا خیال آنے لگا۔ وہ ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا اور بائیں لے کر جاتی تھی تو درمیان میں اسے اپنے بیڈ روم کا خیال آ جاتا تھا۔ جہاں کی اونچ موٹی گرد تھی جس کی کمی اس کے ہاں تین بیڈروم تھے یہاں اسے قاتلین، کور، پورے، بھی کچھ صاف کرنے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا۔ وہ تھک تھک کر صوفے پر جا بیٹھی تھی اور مسکن گولیوں کھاتی تھی مگر دواؤں سے بھی اسے آرام نہیں مل رہا تھا۔ ویکیم مشین کی عدم موجودگی میں گرد اور خاک کی صورت میں ایک بلا اس پر نازل ہو گئی تھی مگر اس کا ارادہ کنزور نہیں تھا۔ وہ گرد اور خاک سے گھبرا کر گھر چھوڑ کر بھاگنے والی نہیں تھی۔

اس نے سوچا راجہ گھر آ جائے تو پھر دونوں مل کر اس مسئلے پر سوچتے ہیں۔ ویکیم کلینز کے آنے تک کوئی عارضی تدبیر ضروری تھی تاکہ مکان میں پھیلی گرد سے نمٹا جا سکے۔ راجہ اس کے خیال کے مطابق ایک بہت باصلاحیت اور عملی آدمی تھا دوسرے لفظوں میں اس کی افواج کا کام ڈال رہی تھی۔

☆☆☆

راجہ کوچنگ ٹائم میں میز پر بیٹے ہوئے بالکل مزا نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ذہن پر بیوی سوار تھی۔ وہ منروا کو مٹی کہہ کر لکھتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کئی دنوں سے کچھ بڑھ چکی۔ وہ اسے مسلسل مکان کی صفائی میں جے دیکھ رہا تھا۔ صفائی اس کے لیے ایک مذاق بن رہی تھی۔ خصوصاً ویکیم کلینز کی

خرابی کے بعد تو اس نے اسے ایک بڑا مسئلہ بنا لیا تھا۔ اس محسن میں اس نے اپنے ٹیلی ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ یہ کوئی چھ مہینے پرانی بات تھی اس نے ٹیلی کا معائنہ کر کے بتایا تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں تاہم اس نے کہا تھا کہ جب عورتوں کا ماہانہ نظام بند ہو جاتا ہے تو عمر کے اس حصے میں عورتوں کی تفریبات پر اثر پڑتا ہے۔ گویا یہ فکر مندی فطری تھی لہذا اسے اس پر کوئی پریشانی نہ تھی۔

مگر منروا ابھی صرف چالیس سال کی تھی۔ اتنی جلدی۔۔۔
”ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہوتا ہے ایسا۔“ ڈاکٹر نے کہا تھا۔

پھر انہی دنوں میں راجہ نے منروا کے لیے ویپرا گھلانڈ نامی ویکیم کلینز خریدے۔ یہ مشین خاصی مہنگی تھی مگر الیکٹرک کے کڑھوں کا شاہ کار تھی۔

مشین آتے ہی منروا نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ مشین عمدہ تھی۔ منروا کو گرد و غبار کی بہت شکایت تھی مگر اس کے آنے سے تبدیلی آگئی تھی۔ کچھ دنوں میں مشین چل رہی تھی۔

اس نے شراب خانے سے نکل کر شیفر چلی ایونیو کی وہ سڑک پکڑ لی جو عموماً سنسان سی رہتی تھی۔ پھر وہ اپنی پسندیدہ دکان کی طرف گیا۔

دکان کا نام تھا ”گھنگھو کی دکان“۔ یہ دکان عرصے سے اس کی دلچسپی کا مرکز تھی۔ وہ یہاں اسرار تجسس اور رومان کی تلاش میں آتا تھا۔ اس دکان میں موجود دور کے افریقی دست کاری کے بہت سے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ یہ اشیاء اظہارِ فطرت کی طرح ممنوع تھیں۔ یہاں عجیب عجیب لباس بھی تھے اور بہت سے قدیم ہتھیار بھی یہاں پڈیوں کے ہار بھی تھے۔ کبھی کبھی وہ یہاں سے ایک آدھ چیزیں خرید بھی لیتا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ منروا ان چیزوں کو دیکھ ڈرامی خوش نہیں ہوتی تھی۔

چلتے ہوئے اس کے تصور میں مٹی ابھری اس نے رفتار بڑھا دی۔

ان تین دنوں میں اسے صفائی جاری رکھنی تھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے راجہ کو بھی میرا ہاتھ بٹانا پڑے۔ وہ پیرا گلائڈر کے آنے کی بے چینی سے منتظر تھی۔

معاس کی نگاہ کرے کے کوئی نہیں رکھے ٹی وی پر پڑی۔ اس نے بڑھ کر اسے گھمایا۔ حتیٰ کہ اس کا رخ دیواری طرف ہو گیا۔ اوہ وہ ٹی وی کا پچھلا حصہ گرد سے گندہ ہو رہا تھا جبکہ ابھی پچھلے ہی جتنے اس نے اسے بہت اچھی طرح صاف کیا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے سیٹ کو اٹھایا اور لٹکھڑاتی ہوئی اسے لے کر کچن میں گئی۔ وہاں اسے رکھ کر اس نے سوچا راجہ آ جائے تو میں اسے بائیسے میں رکھوا کر صاف کر دوں گی۔ پھر اس نے سوچا وہ یہ کام خود ہی کر لیتی ہے۔ اس نے سیٹ کو دوپٹا اور بائیسے کی طرف چلی اچانک ایک مٹی اس کے پیروں سے گر گئی اس کا توازن مگڑا اور پھر وہ ٹی وی سیٹ دونوں ٹکڑیوں کے پختہ فرش پر دھڑام سے گرے۔ ٹی وی کی پکچر ٹیوب پھٹی اور مٹی کے منہ سے ایک زور دار کراہ بلند ہوئی۔

شام کی کھڑکی دھوپ میں ٹوٹے ہوئے سیٹ سے گرد کا ایک بڑا سگولا بلند ہوا اور پھر اس خاک کا ایک بڑا حصہ مٹی کے سر پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

راجہ غامے اطمینان میں تھا جب اس کی نظریں اس پر پڑی تھیں۔ یہ ایک دور افتادہ گوشے میں کھڑی مارے موجود تھا۔ راجہ نے اسے وہاں سے ہٹایا اور ڈاروئن حصے میں لے آیا۔

بڑی حد تک یہ کسی سانپ سے ملتا جلتا تھا۔ مگر اس کا سر جو کھرے سبز رنگ کا تھا، جسم کے مقابلے میں خاصا بڑا تھا۔ یہ سر کی مضبوط مگر نرم ہادے سے بنا لگا تھا اور بناتے ہوئے کسی سانپ کی شکل دے دی گئی تھی۔ چوڑائی میں یہ کوئی سات انچ تھا اور اس کی لمبائی کوئی بارہ انچ تھی جبکہ اس کی گہرائی پانچ انچ تھی۔ اس کے منہ میں ایک خلا موجود تھا۔ اور اس کے

مخبر کی بات تھی کہ مٹی اس مکان پر پڑی۔ مٹی رانی مٹی اچھا ہوتا کہ وہ کوئی ملازمت کر سکی۔ ایک بار اس نے اشارہ اس سے کہا بھی تھا مگر اس کا جواب اسے ملتا تھا۔ ایک لمحہ اس نے کہیں گھومنے کھانے کا پروگرام بنایا تھا تو مٹی نے سختی سے مخالفت کی تھی۔ اور بولی تھی۔ ہم لوگ کہیں گئے تو اس عرصے میں اس مکان کی ایسی کچھ بھی ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا تھا۔ یہ سارے مکان خاک سے اٹ کر رہ جائے گا تم دروازہ تک نہیں کھول سکو گے۔

راجہ راجہ جی جا ہاتھ دھوئے مگر مٹی کے خوف سے اس نے خود کو روک لیا تھا۔ پھر اس نے کہا تھا اگر یہ مکان ایسا ہی برے تو ہم کیوں نا اسے بیچ دیں مگر مٹی اس پر بھی تیار نہ ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آسانی سے ہلا سنے والا عورت نہیں۔ اس کے علاوہ وہ مٹی اور بولی تھی۔ مٹی بتاؤ اس مکان کو لے گا کون۔ اس کے خیال میں مکان کوئی بھی ہوتا صفائی کا مسئلہ تو ہر جگہ تھا۔ اس نے سسٹر لوی کی مثال دی تھی۔ سسٹر لوی کو دیکھو وہ ایک نئے مکان میں رہتی ہے مگر وہ بھی پریشان رہتی ہے۔ راجہ کے خیال میں سسٹر لوی کی مثال پوری مٹی کی جگہ اسے معلوم تھا لوی کے سارے گھر انے میں خلیا جیسے امراض کا ایک سلسلہ موجود تھا۔

”گھومو کی دکان“ ایک خاموشی سے کارن میں شاپ تھی۔ یہ ایک سادہ سی جگہ پر مٹی جیسے ریگستان میں نکلتا تھا۔

راجہ نے دکان میں داخل ہو کر وہاں کے اندر سے اپنی آنکھ کو انوس ہونے دیا۔ پھر قدم بڑھایا۔ کیونکہ روٹی سے ایک دم اندر سے مٹی گھسنے سے اندیشہ تھا وہ کسی بھی چیز سے ٹکرا سکتا تھا۔

☆☆☆

مٹی سوچ رہی تھی کہ اسے تین دنوں تک کیا کرنا ہوگا۔ تین روز بعد کچھ ٹھیک ہو کر وہاں آئے والا تھا۔

جڑے کوئی ستر درجے کا زاد ہے بنا رہے تھے۔ اس کا سرم ہوتا ہوا بدن سے جڑ گیا تھا۔ جس کا قطر چار انچ رہا ہوگا اس پر سرخ اور زرد رنگ لگایا گیا تھا۔

گھومو۔۔ ایک افریقی تھا۔ بہت پرانی قسم کا اور پراسر اس۔ وہ راجر کی طرف بڑھا۔ اور اس نے بتایا۔۔ کہ یہ بٹش ماسٹر ہے (یہ نام اس نے آٹے کو دیا تھا) کوئی صرف دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔“ افریقی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے اس نے کہا۔ ”تمہیں تعجب ہوگا سن کر کہ یہ چیز مغربی افریقہ کے ملکوں میں وہی درجہ رکھتی ہے جو تمہارے یہاں صفائی مشین یعنی ویکیم کلینر کا حامل ہے۔ اس علاقے میں جہاں اسے تیار کیا گیا ہے ہر گاؤں میں ایسا بٹش ماسٹر ضرور رکھا جاتا ہے تاکہ شائق کو صاف رکھا جاسکے۔“

راجر کے چہرے پر سخرانہ سرکراہٹ ابھر آئی۔ تو گھومو کچھ جوشیلا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس شے کی کارکردگی کا مظاہرہ پیش کرنا چاہتا ہے۔

”دکان کے آخری حصے میں بہت ہی ٹوٹی پھوٹی اشیا اور خالی ڈبے گھومنے ان ڈبوں میں بھری چیزوں کو جان بوجھ کر فرش پر بھیر دیا۔ اسی وقت راجر کو اپنے سامنے فرش پر کوئی شے جیسے رنگی نظر آئی۔ اس نے اپنے بیروں کی طرف مدھم مدھم حرکت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس مشین کے سر کو جھکے سے لگ رہے ہیں پھر اس نے دیکھا کہ اس کے کوالک کا اوپری حصہ فرش پر چاٹا ہوا ہے۔ اس کے بعد عقب میں اس مشین کا حصہ ٹھٹھا شروع ہوا جیسے ری کے ٹل ٹھٹھے ہیں۔ اس کی حیرت زدہ نظروں کے سامنے ”بٹش ماسٹر“ بالکل بے آواز انداز میں حرکت میں آیا پھر وہ کچرے کے ڈھیر کی سمت بڑھا دیکھتے ہی دیکھتے خالی ڈبے، سگریٹ کے ٹوٹے خالی پیکٹ، ماچس کی ڈبیائیں، کاغذ کے ٹکڑے اور فرش پر پھری خاک تیزی سے غائب ہونے لگے۔ یہ سب چیزیں بٹش ماسٹر کے کھلے منہ میں غائب ہوئی جارہی تھیں۔ چند سیکنڈز بعد فرش تمام کچرے سے مکمل طور سے صاف ہو چکا تھا اور وہ شے

یا مشین جسے بٹش ماسٹر کا نام دیا گیا تھا اب دوبارہ فرش پر انگریزی کے حرف ”S“ کی طرح بڑبڑاتی تھی۔ بے حس و حرکت راجر نے اندازہ لگایا کہ کتنی حالت میں اس کی لمبائی کوئی دس فٹ ہوگی اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کے سر کی طرح اس کی دم بھی سائب نہیں ہے۔ یہ دم جسم کے مقابلے میں سخت نہیں لگی تھی۔ بلکہ یہ کسی تھیلے سے لٹی جلتی تھی۔ تب راجر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”بٹشلی سے چلتا ہے؟“

”جی ہاں۔“ گھومنے نے حیرت سے کہا۔ ”کیا تمہیں اس کے ساتھ یہاں کوئی دائرہ وغیرہ خشک نظر آ رہا ہے۔“ راجر نے جبکہ کار جائزہ لیا پھر سیدھا ہو گیا اس نے کہا۔ ”پھر آخر یہ کام کس طرح کرتا ہے۔“

جواب دینے سے قبل یوڈھا گھومو کچھ متذبذب سا ہوا۔ پھر اس نے کہا۔

”ہمارے ہنرمندوں اور موجودہ دنیا کے ایک علم صدیوں کی کڑی محنت کے بعد حاصل کیا تھا۔ گھومو نے کلکریکس یا موٹر کاریں یا کمپیوٹر نہیں بنائے۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں۔ جواب یہ ہے کہ انہوں نے صرف اور صرف وہی چیزیں بنائیں جن کی انہیں ضرورت تھی۔ انہیں ایسی اسلئے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان کی ایجادات بالکل سادہ تھیں۔“

اس نے اپنی سیاہ آنکھوں میں بٹش ماسٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی ایک سادہ کاری چیز ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ کم لوگ اس قدر الجھ جچے ہو کہ اب تمہیں اس کی سادہ چیز کے بارے میں بتایا جائے تو اسے سمجھتا تمہارے لیے مشکل ہوتا ہے۔ تم شاید اسے نہیں سمجھ سکو گے۔“

”اچھا۔۔ تو کیا ہے کوئی جادو کی چیز ہے۔“

راجر نے پوچھا۔

گھومو نے نیزہ انداز میں مسکرایا۔

”جب میں چھوٹا تھا اور میں نے پہلی بار ایک جہاز اڑتے دیکھا تھا تو میں نے یہی کہا تھا۔ کیا یہ ایک

جادو کی چیز ہے۔ میرے لیے وہ جادو ہی تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ہماری ٹیکنالوجی نے تمہاری مہذب دنیا سے ہٹ کر اپنا راستہ الگ بنایا ہے تو شاید غلط نہ ہو گا۔“

راجر نے سوچا یہ گھومو بڑی عمدگی سے افریقی فلسفے کو آگے بڑھا رہا ہے۔

اس نے مشین کے دو ایک مظاہرے دیکھنے کی خواہش کی اور نتیجتاً ایک بار پھر اس نے دیکھا کہ بٹش ماسٹر نے رومی کی کتنی نوکریاں بغیر ڈکار لیے گلے کی خصلتیں۔ اس دوران راجر نے کڑی نگاہ رکھی کہ اس کے پاس کوئی پاور سوورس تو نہیں۔ وہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔

”دیکھو۔“ گھومو نے کہا۔ ”کسی شاک میں یہ بھی ضرورت نہیں یہ ایجاد بھی محدود پیمانے پر ہی کام کرتی ہے۔“

”اچھا۔۔“

”ہاں ایک بار اس کا پورا بدن بھر جائے تو پھر کچھ دیر کے لیے یہ کار ہو جاتی ہے۔“

”کیا مطلب۔۔؟“

”مطلب یہ ہے کہ اسے ہضم کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ زیادہ کثیف یا بھاری اشیا لگتی پڑتی تو یہ دوبارہ کام کرنے کے لیے اسے وقت درکار ہوتا ہے۔ اس وقفے میں وہ اسے ہضم کرتا ہے۔“

راجر نے مشین کی کارکردگی خود دیکھی تھی۔ اسے قائل تو ہونا ہی تھا۔ صرف ایک خدشہ تھا کہ یہ افریقی اس کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہا۔

”تم اس کی کارڈی تو دگے۔“ راجر نے پوچھا۔

گھومو نے غماض لہجے میں جواب دیا۔ ”یہاں اگر تم نے اسے احتیاط اور خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا تو یہ پوری زندگی کام دیتا رہے گا۔“

”پھر جی۔۔ اگر یہ کام چھوڑ دے تو کیا میں اسے تمہارے پاس لاسکتا ہوں؟“

”بالکل۔۔۔“ گھومو نے اطمینان سے کہا۔

”تمہاری تسلی نہ ہو تو میں اسے واپس لے کر تمہاری رقم لوٹا دوں گا۔“ گھومو نے انگلی اٹھاتے ہوئے نتیجہی لہجے میں کہا۔

”مگر ایک بات یاد رکھنا۔۔۔ یہ بہت اہم ہے۔ کبھی اپنے بٹش ماسٹر کو بھوکا نہ رکھنا یعنی خوراک ضرور دینا۔ ضرورت ہوتے ہی یہ کوڑا کرکٹ ضرور کھاتا ہے۔ اگر اسے یہ اشیاء نہیں تو ہوسکتا ہے یہ مشغول ہو جائے۔ اس کی ذمہ داری تمہاری ہوگی۔“

وہ رکا۔ اس نے کہا۔

”تم نے بھی غور سے دیکھا ہے۔ میری دکان کس قدر صاف ستھری رہتی ہے۔ جس وقت سے بٹش ماسٹر آیا تھا۔ اس نے آتے ہی میری پوری دکان کی خاک جھول کوڑا کرکٹ سب صاف کر دیا تھا۔ اب بھی میری دکان کی صفائی یہی کرتا ہے۔ البتہ یہاں اسے پیٹ بھر کے خوراک نہیں مل رہی ہے۔ اس لیے میں اس کے لیے اپنے پڑوسیوں کا کچرا بھی لے آتا ہوں یہی نہیں میں پچرا گاڑی میں سے بھی بٹش ماسٹر کے لیے چوری چھپے خوراک حاصل کرتا ہوں۔“

راجر کو یہ ساری باتیں بڑی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ اسے سکون بھی مل رہا تھا۔ اگر گھومو کی ساری باتیں درست تھیں تو پھر اب اس کے گھر کی صفائی کوئی مسئلہ نہیں رہ سکتی تھی یعنی کوآرام ہی آرام ہوتا۔ جیسے صفائی کا مراقب ہو چلا تھا۔

”اس کی قیمت کیا ہے۔“ راجر نے پوچھا۔

”پانچس پونڈ۔“

راجر کو مزید خوشی ہوئی کہ اتنی رقم وہ دے سکتا تھا۔ راجر نے گھومو سے مشین کی دم پر موجود تھیلے کے بارے میں دریافت کیا تو گھومو نے کہا۔

”دیکھو جس طرح دوسرے ویکیم کلینرز کا معاملہ ہے اسی طرح اس تھیلے کو بھی اکثر پیشتر خالی کرنا ہوگا۔“ اس کے بعد اس نے غلت سے اس تھیلے کو مشین کی دم سے جدا کیا اور اسے راجر کے ہاتھ میں دے دیا۔

تھیلا غالباً کسی قسم کی کھال سے بنا تھا۔ اس کے اندر کوئی ایسا مادہ موجود تھا جس سے دلدلی علاقے والی بو آ رہی تھی۔

راجہ نے اس مادے میں اپنی انگلی ڈبوئی اور اسے اٹھا کر جائزہ لیا۔ تب اسے غمو کی آواز سنائی دی۔

”یہ ایک اور فائدہ کی چیز ہے۔ تم اسے ایک بہترین کھاد کہہ سکتے ہو۔“ بٹش ماسٹر ایک کلورام وزن کا پکڑا کھانے کے بعد اپنے بدن کے اندر یہ مادہ بناتا ہے۔ یہ ایک کارآمد شے ہے ہمارے ہاں افریقا میں دیہاتی لوگ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے ہیں اس سے بنریاں اگاتے ہیں۔ تم اسے باغیچے میں استعمال کر کے پھول اور پودے لگا سکتے ہو۔“

راجہ کو یہ ساری باتیں پاگل کی بولگ رہی تھیں۔ ”تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے جیسے یہ شے خوراک سے فضلہ بناتی ہے۔“

جواباً غمو مسکرایا۔ ”میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ نہایت فضول چیز کو کارآمد بناتا ہے۔ تم اسے فضلہ نہیں کہہ سکتے۔“

راجہ نے جبکہ ماسٹر کے آخری حصے کو اٹھا لیا۔ اپنے سائز اور حیثیت میں رنگ سے ہٹ کر یہ دوسرے ویکیم کلینرز جیسا ہی لگ رہا تھا۔ غمو نے یہ حصہ راجہ کے ہاتھ سے لیا اور اس نے اس کے ساتھ نکالے ہوئے حصے کو دوباراً جوڑ دیا۔ اس نے یہ کام انگلیوں کے حلقے سے کیا اور کہا ”تم اسے اسی طرح کرتے رہنا۔ تھیلے پائے کے ساتھ آپ سے آپ جڑ جائے گا۔“

شاید غمو نے راجہ کے خدشات سمجھ لیے تھے۔ اس نے کہا۔ ”دیکھو ماسٹر اگر تمہیں میری باتوں پر اعتبار نہیں تو تم پڑوس والی دکائوں پر چلے جاؤ وہاں جتنی پتھر فروخت ہوتے ہیں۔ وہ بہت قابل اعتبار لوگ ہیں۔ وہ مجھے اپنے ہاں کا پکڑا دیتے رہتے ہیں اور معاوضے میں انہیں میں بننے میں ایک بار بٹش ماسٹر کی بنائی کھاد فراہم کرتا ہوں جسے وہ اپنے باغیچے

میں استعمال کرتے ہیں۔ پورے علاقے میں ماسٹر برگ کا باغیچہ مشہور ہے۔“

”نہجہ۔۔۔ وہ آخر بٹش ماسٹر کو خرید کیوں نہیں لیتے۔“ غمو مسکرایا۔ ”وہ تو اسے بڑی تعداد میں چاہتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کے ہنرمند ایشیا بڑی تعداد میں نہیں بناتے۔ ویسے بھی ماسٹر برگ کو اس کی چاہ صرف نفع کمانے کے لیے ہے۔۔۔ اور میں یہ کام نہیں کرتا۔“

راجہ کو حیرت ہوئی۔ یہ غمو بہر حال اسے بٹش ماسٹر پہنچانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے اس کی کارکردگی بھی دکھائی تھی ورنہ اس سے قبل وہ مکان میں متعدد بار آیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ غمو نے خود سے کبھی کسی چیز کو پونچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے غمو سے پوچھا۔

”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ مجھے اس بٹش ماسٹر کی ضرورت ہے۔“

”یہ چمچی حس کا معاملہ ہے۔ غمو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری چمچی حس بہت کم ہے۔ مجھے احساس ہوا تھا تم کچھ پریشان ہو اور یہ پریشانی خاک اور گرد وغیرہ سے تعلق رکھتی ہے۔“

واقعی راجہ پریشان تھا۔ وہ جی پی کے رویے سے مریض بن گیا تھا۔ اس نے غصے سے سوچا کہ اگر یہ بٹش ماسٹر کو فضول چیز ثابت ہوئی تو اسے اسے لاکر اس غمو کے سر پر دے ماروں گا۔

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں اسے لیتا ہوں۔“

تب غمو نے کہا۔ ”ماسٹر اتم انگینڈ میں واحد شخص ہوں گے جس کے پاس ایک بٹش ماسٹر ہوگا۔ جنہیں اس سے ذہنی سکون ملے گا تمہارا مکان صاف ستھرا رہے گا اور تمہارا باغیچہ بھی خوب صورت ہو جائے گا۔“

اس بٹش ماسٹر کو چمکی کی شکل میں لپیٹا اور اسے ایک بھورے کاغذ میں لفٹوف کر دیا۔

اپنے وہ چمکاؤنگلینز کے بارے میں راجہ نے

سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ خراب ہو جائے یا ٹوٹ جائے تو ٹھیک ہو سکے گا؟“

غمو کے زبردانت چٹکلے۔۔۔ ”تم لوگوں کی تمام ایجادیں ہمیشہ صحیح سلامت نہیں رہیں تمہارا شہر درست ہے۔ مگر تم مطمئن رہو ہمیں آج تک کوئی اطلاع ایسی نہیں ملی کہ بٹش ماسٹر نے کام بند کیا ہو۔ ویسے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کے اندر دوتے حصے کچھ مدت کے بعد اپنی خرابیوں کو خود دور کر لیتے ہیں۔ تم یہ فکّر نہ کرو۔“

”خوب۔“ راجہ نے کہا۔ ”اور یہ کیسے معلوم ہو گا کہ یہ بٹش ماسٹر پرانا نہیں ہے؟“

غمو نے بٹش ماسٹر کو لفافے سے تھوڑا اور پھینچ لیا اور کہا۔ ”اس کے سر کا رنگ اگر اڑ جائے تو سمجھو یہ پرانا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے کہ اس کے مالک کو چاہیے کہ وہ اسے صرف ہلکا کام لے یا کوئی دوسرا بٹش ماسٹر خریدے۔ یہ بٹش ماسٹر پچاس سال سے پہلے پرانا نہیں ہوگا۔ یہ پچاس سال سے ساتھ بیٹھ رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں تم تقریباً پچاس سال کے ہو رہے اور یہی زمانہ آدمی کی اوسط عمر۔۔۔“

راجہ اسے منہ کھولے سن رہا تھا۔ غمو نے جملہ قسم کر دیا اور بولا۔ ”یہ بالکل نیا ہے اور جدید بھی۔“

غمو یقیناً عمدہ قسم کا کیلنڈر میں تھا مگر جو پارسل اس نے بنایا وہ بہت بڑھ چکا تھا۔

راجہ نے چیک بنا کر اسے دے دیا۔ غمو نے اسے لے کر چند ایسے کاغذوں پر کچھ لکھا جس پر مغربی افریقا کی کسی جتنی کا نام چھپا ہوا تھا۔ پھر اس نے یہ کاغذات اسے دے دیے۔

”اب چند ہدایات۔“ اس نے کہا۔ ”کئی ایک تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ تاہم ریفریش کے لیے انہیں رکھنا اور غور سے پڑھ لینا۔ اور ہاں۔۔۔“

وہ جلدی سے گھومنا اور شاپ کے اندر دوتے حصے میں چلا گیا جس پر وہ پڑا ہوا تھا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں ایک کھال کا بنا ہوا لفافہ تھا۔

”یہ ایک زائد تھیلا ہے۔ جب ایک کو خالی کرنا

ہو تو اسے استعمال کر لو۔“

راجہ نے کاغذات اور تھیلے کو جیب میں ٹھونس لیا۔ پھر اس نے وہ پارسل اٹھایا جس میں بٹش ماسٹر تھا۔

”دیکھو اگر اس نے کام نہیں کیا تو تمہیں میرے پیسے واپس کرنے ہوں گے۔“ اس نے غمو سے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔“ غمو نے سکون سے کہا۔

”اس کی ٹوبہ ہی نہیں آئے گی۔“

☆☆☆

اتفاق سے اس سہ پہر کام نہیں تھا۔ ایسا جب بھی ہوتا تھا۔ راجہ ہمیشہ اپنی حسینی مسکری میس بیگل کو بلا لیتا تھا۔ بھانپا یہ ہوتا تھا کہ ڈکٹیشن دیتا ہے۔ پھر وہ فرضی لوگوں کے نام خطوط ڈکلیٹ کرتا تھا اور اس کی نظریں سامنے ٹیپی پر شاپ لڑکی کے خدوخال کا جائزہ لیتی رہتی تھیں۔

جس وقت وہ اپنے چھوٹے سے آفس میں پارسل سے لدا چند اندر داخل ہوا مس بیگل نے اسے جھس سے دیکھا۔ اندر چکر اس نے بٹش ماسٹر کو ایک کونے میں رکھ دیا۔ اپنی جیکٹ اتار کر کھوتی پر لٹکائی اس بار اس نے مس بیگل کو پیش بلایا۔ اس کے بجائے وہ ان کاغذات کو دیکھنے لگا جو اسے غمو نے دیے تھے۔

”بٹش ماسٹر ایک اور ایجاد۔۔۔“

افریقی انٹر پرائز کی طرف سے۔۔۔

طریقہ استعمال یاد رکھیے کہ بٹش ماسٹر بھوکا رہتا پسند نہیں کرتا۔ اس کے لیے ہر وقت کوڑے پکڑے اور گردوغبار کا بندوبست رکھیں۔

اس سے کام لے کر تھوڑا وقت دے دیں تاکہ وہ ایشیا ہضم کر سکے۔

وہ وقفہ دیکھیں یہ ہے جیسی چیزیں یہ کھائے گا اسی مناسبت سے وقفہ ہوگا۔ دس عدد پکڑا بھری ٹوکریاں کھانے پر تقریباً تین گھنٹے کا وقفہ درکار ہوگا۔ اس دوران یہ کام نہیں کرتے بلکہ آپ کے لیے کھاد

39

مران خان جیٹ

بنائے گا۔ آدھے آدھے گھٹنے کے وقت سے اسے خوراک کھلائی جاسکتی ہے اس کے علاوہ بہت ہی امیرجنسی میں بٹش ماسٹر آپ کے کام آسکتا ہے۔ مثلاً چھت کر جائے تو یہ اس کی ساری مٹی چٹ کر جائے گا اگر اس میں لوبا ہوا وہ بھی۔ مگر پھر اسے ہاتھ کے لیے لہا وقت درکار ہوگا۔ نئے مکان استعمال کے ساتھ ساتھ اس سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔

تنبیہ!!

بھوکا ہونے پر یعنی خالی ہونے پر بٹش ماسٹر کی کارکردگی عروج پر ہوتی ہے اس حالت میں یہ ہر قسم کی مٹی وصول کھالے گا لہذا کوشش یہ کی جائے کہ اسے زیادہ بھوکا نہ رکھا جائے اور نہ ہی کافی پیٹ بھرا۔ تھوڑی غذا۔ تھوڑا آرام روزمرہ کے لیے۔

جب بٹش ماسٹر کی دم فٹ بال کی طرح پھول جائے تو اسے پیچھے مکر کے دوسری دم جوڑ دیں۔ بس ماسٹر کو ایک کلورکام تک کھیلے کو بھرنے کے لیے پچاس کلورکام کے خام پتھرے کی ضرورت ہو گی۔ اس سے حاصل کردہ کھاد بہترین ہوتی ہے۔ اسے کیاریوں میں ڈال دیں یا گولوں میں بھردیں۔ احتیاط!!

بس اتنی کر اسے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے۔ اسے کبھی کبھی کپڑے سے پونچھ دیں۔

ہدایات کو اس نے مٹی بار بڑھا۔ پھر کونے میں دھڑے بٹش ماسٹر پر نظر پڑ ڈالنے ہوئے اس نے سوچا۔ گویا اب مٹی کو صرف ایک مشین نہیں مل رہی ہے بلکہ اسے ایک ہاتھو جانور بھی مل رہا ہے جسے تھوڑے تھوڑے وقتوں سے کھانا بھی ہوگا اس نے سوچا اب مٹی کو یہ ساری باتیں سمجھنا بھی ہوں گی جو کسی دوسری سے کم نہیں۔ اسے بتایا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں کی طرح سمجھے۔ بس فرق یہ ہوگا کہ اسے دودھ کے پیالے نہیں پھرے کی نوکریں چاہیے ہوں گی۔

تصور سے اس نے دیکھا کہ مٹی مارے حیرت کے لگ ہوئی ہے۔ اسے ہنسی محسوس ہوئی۔ بدبخت

عورت پہلے ہی سے پاگل ہے کہیں بالکل ہی نہ چل جائے۔

اس نے سوچا میں ایسا کیوں نہ کروں کہ مشین کے سلسلے میں اسے کچھ نہ بتاؤں۔ کیا ضروری ہے اسے بتایا جائے کہ مشین کو بھوکا نہیں رکھنا مٹی تو پہلے ہی سے شاکی ہے کہ اس مکان میں خاک دھول بہت جمع ہوتی ہے ایسی صورت میں بٹش ماسٹر کا بھوکا رہنا کہاں ممکن تھا۔ اس نے سوچا اگر بٹش ماسٹر مٹی کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا بھی کرتا ہے تو یہی کوئی ہرج مچی کے زیادہ سے زیادہ مٹی پاگل ہو جائے گی۔ یہ یاہ پتال داخل ہو جائے گی۔۔۔ ویسے بھی کسی پاگل بیوی کے مقابلے میں ہر شخص کو اپنی حسین سکرٹری ہی اچھی لگتی ہے۔

اسی لمحے وہ پارسل متحرک سا ہوا۔ راجر ایک دم چونک اٹھا۔ اس نے غلت سے اپنے سامنے رکھے ہدایات والے کاغذ کو دیکھا اسے نظر آیا کہ اگر رومی کی دس نوکریاں اسے کھلا دی جائیں تو یہ تین گھنٹے میں سکون رہے گا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ دکان پر اسے چار عدد رومی کی نوکریاں کھلائی گئی تھیں جب سے اب تک ڈیڑھ گھنٹا ہوا تھا۔ اور اب محض بٹش ماسٹر پھر سے پکرا مانگ رہا تھا۔

پارسل اپنی جگہ بٹھ گیا تھا۔ راجر کی آنکھیں اسی برجی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے کاغذ پھر سے پھٹا اور بٹش ماسٹر نے اس میں سے اپنا سر نکالا اس وقت وہ کسی طرح کی طرح لگ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے بٹش ماسٹر اسی کو گھور رہا ہے حالانکہ اس کی آنکھیں نہیں تھیں۔

غلت سے وہ اٹھا اس نے رومی کی نوکری اٹھائی اس میں صرف بڑے مزے کاغذ تھے اس سے کیا کام چلے۔ اس نے اپنی دروازہ کھولی اس کے اندر گولوں کی ایک آدھ شیشی رکھی تھی ایک کیلکو لیٹر رکھا ہوا تھا اور ایک مٹی کی فریم شدہ تصویر بھی تھی۔ اس نے یہ سب رومی کی نوکری میں ڈال دیے پھر اس نے اس میں

الٹش ٹرے بھی خالی کر دی۔ اس کے بعد اس نے نوکری بٹش ماسٹر کی طرف کھسکا دی اس نے اپنے گھونے سر کو جھکا اور فرش سے لگا دیا۔ پھر وہ نوکری کے پکڑے سے ہٹنے لگا۔

راجر کو فائلنگ کیپٹ کا خیال آیا۔ اس نے دروازے سے سب سے مونی فائل ختیب کی۔ یہ دس لاکھ ڈالر کے ایک پرانے معاہدے کی تفصیلات تھیں۔ راجر نے زیادہ غور نہیں کیا فائل کو پھاڑ کر دھولے کتے اور اسے زمین پر پڑی شے کو کھلا دیا۔

اس خوراک سے بٹش ماسٹر تھوڑا سا پرسکون ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر فرش پر لیٹ گیا تھا۔ راجر نے کسی طرح اس کے سر کو پارسل کے پتے کاغذ میں غولس دیا۔

اسے یاد آیا کہ اسے ابھی اس شے کو اپنے گھر بھی لے جانا ہے۔ اسے غولین کے ذریعے جانا تھا۔ اور ٹرین میں بھی شے جی ہوتا ہے۔ اس نے سوچا اگر اس نے وہاں کوئی گڑبڑ شروع کیا جب کیا ہوگا؟

وہ اس بٹش ماسٹر کو اسی طرح لے جاسکتا تھا کہ وہ پوری طرح پیٹ بھرا ہوتا۔ مگر اس کے لیے مقولہ خوراک درکار تھی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اسے وہ اس قدر بھی نہ کھلا دے کہ پھر یہ عین مٹی کے سامنے کارکردگی ہی نہ دیکھ سکے۔ گویا اسے بس اسی قدر کھانا تھا کہ ٹرین کا سفر کی الجھن کے بغیر کٹ جاتا۔

”ذرا تم اپنی رومی کی نوکری دینا۔“ اس نے اپنی سکرٹری سے کہا پھر وہ جھک کر خود اسے اٹھانے لگا سمجھتے ہوئے اس نے مس بیگل کی ٹانگوں کا جائزہ بھی لیا۔ جو بھری بھری ہی تھیں۔

مس بیگل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مگر زیادہ بات نہیں کی اور نوکری لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ آتے ہی اس نے نوکری مشین کے پاس رکھ دی اور خود وہ آنکڑوں پیٹھ گیا نوکری پہنچنے ہی وہ کھانا سر کاغذ سے پھر برآمد ہوا۔

راجر کی نظریں اس کے کھلے ہوئے منہ پر تھیں اور وہ دیکھ رہا تھا کہ جو کچھ اس کے اندر جا رہا تھا۔ اندر

پہنچنے ہی شاید کھیلنے لگتا تھا۔

آخر یہ کیا طریقہ کار ہے۔ کیا یہ گرمی کا کرشمہ ہے یا یہ کسی ٹیکنیک کا کمال ہے۔ مگر یہ ٹیکنیک تھا کیا۔ اور یہ افریقہ کے کسی جنگلی ذہن میں اس کا خیال آیا کیسے۔ بھلا وہ ٹیکنیک تھا کیا جو چاروں کو فوراً گلا دیتا تھا اور خود اس سے مشین بالکل محفوظ رہتی تھی۔

پارسل میں اسے ٹھونسنے کے بعد راجر کو ان مسکوں سے بھی پتہ چلتا تھا۔ پہلا اسے ٹرین پر لے جانا۔ دوسرا مٹی کے سامنے اس کی کارکردگی کا مظاہرہ۔

وہ اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ بٹش ماسٹر کا پیٹ اس قدر بھرے کہ موقع پر وہ مشین کے سامنے اپنا کمال نہ دکھاسکے۔

گویا اس سلسلے میں کچھ حساب کتاب ضروری تھا۔ اس نے ایک سادہ کاغذ نکالا۔

اگر دس نوکریاں کھانے پر دو وقتیں کھنے کا ہوتا ہے تو ایک نوکری کھانے پر کیا وقت ہوگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جواب اٹھارہ منٹ اسی وقت موثر ہو سکتا ہے جب ماسٹر کو ایک ساتھ دس نوکریاں کھلائی جائیں۔ یعنی وہ ایک بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ہدایت میں لکھا تھا کہ اسے صرف آدھ آدھ کھنے سے بہت کچھ کھلایا جاسکتا ہے جبکہ درمیان میں کوئی وقفہ نہ ہو۔ اس نے اچھے کر اپنا سر تھام لیا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ کمرے سے باہر آیا۔ اس مس بیگل سے کہا کہ وہ اپنی ساتھی دوسری سکرٹریوں سے ان کی رومی کی نوکریاں مانگ لائے۔

یہ بڑا عجیب مطالبہ تھا مگر اس کا لہجہ ایسا تھا کہ پکرائی ہوئی سکرٹری نے کچھ نہیں پوچھا۔ پھر وہ نوکریاں لانے لگی اور راجر انہیں لے جا کر بٹش ماسٹر کو کھانے لگا۔۔۔ بیگل بہت فکرمند تھی۔ وہ راجر سے سوالات کرتا چاہتا تھا مگر اس نے موقع نہیں دیا۔ وہ خود دروازے پر جم جاتا تھا کہ بیگل اندر جا کر بٹش ماسٹر کو نہ دیکھ سکے۔ اگر وہ بیگل اور اس کی ساتھیوں کی باتیں سنتا جو وہ کر رہی تھیں تو اسے پتہ چل جاتا کہ وہ

سب اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں۔
 ”مس جینی۔۔۔ مس جینی۔ کیا میں تمہاری
 ردی کی نوکری لے سکتی ہوں۔“ بھوس اٹھاتے ہوئے
 مس جینی نے کہا۔ ”کیا۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو
 بیگل!“

”وہ۔۔۔ میرا باس۔ راجر مجھے لگتا ہے اس کے
 دامر پر کچھ اثر ہو گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“
 ”مجھے سے ردی کی نوکریاں منگوارا ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“
 ”ہاں۔“

”اچھا میں نے سنا ہے اس کی پوی بھی سنگی
 ہوئی ہے۔ گنیں یہ کوئی چھوٹ کی بیماری تو نہیں۔“

”فدا جانے۔۔۔“
 ”ارے تو تم ہی کچھ مدد کرنا اس کی (ہونٹوں
 پر شرارت آمیز سمرکراہٹ)

”بشت۔۔۔“
 جس وقت راجر بٹش ماسٹر کو لے کر ٹرین کے سفر

پر نکلا اس نے ایک وقت تین عدد بھری ہوئی نوکریاں
 اسے کھلا دی گئیں چلتے چلتے اس نے پچھے ہوئے کاغذ

پر ایک شپ بھی لگا دیا۔
 ۵:۳۰ والی ٹرین خاصی بھری ہوئی تھی اور دن

بھی گرم تھا ۵۰ منٹ کا سفر راجر پر خاصا بھاری تھا
 اسے بیٹنے کو جگہ بھی نہیں لی تھی۔ اس نے بڑا سا پارسل

بغل میں دبا رکھا تھا۔
 اس کے سامنے والا سر بالوں سے بھرا ہوا تھا۔

جس میں کوئی شے سورج کی روشنی پڑنے سے مسلسل
 اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ یہ بھی ایک منصبت

تھی۔ یکا یک اس میں وقفہ آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ
 ایک بہت جاذب نظر حسینہ ہے۔ وہ خالی ہاتھ ہوتا تو

آرام سے اس حسینہ کے پیچھے جا کھڑا ہوتا اور یہاں
 کاٹی رہتا تھا۔

وہ ڈراما آگے بڑھا پارسل کا ایک کونا حسینہ کی
 پیٹھ سے لڑکھائی گا تو وہ سر مڑا۔

”اے مسٹر۔“ اس نے کہا۔ ”ڈرا پیچھے ہٹ کر
 کھڑے ہو۔“

”معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔
 تبھی اسے احساس ہوا کہ اس کے پیروں پر

کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔
 بٹش ماسٹر کا پچھلا حصہ پارسل کھٹنے سے لٹک گیا

تھا۔
 راجر کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔ بڑی بری

صورت حال تھی۔ قسمت اچھی تھی کہ اسٹیشن بس آنے
 ہی والا تھا۔

اس کے آگے والی لڑکی نے برا سا منہ بنایا اور
 بھیڑ میں آگے نکل گئی۔

بٹش ماسٹر کا لٹکا ہوا حصہ رش کی وجہ سے کوئی
 نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر کسی نے کسی طرح گاڑی ٹھہری۔ وہ

دروازے کی طرف لپکا۔
 یہ منظر بھی خوب تھا۔ ایک معقول سا آدمی جس

کے بال اچھے ہوئے تھے جس نے اپنے سینے سے
 ایک پارسل دبا رکھا تھا۔ جس میں ایک پائپ لٹک رہی

تھی۔
 ادھر سے ہی وہ اسٹیشن پر دھرے ڈسٹ بن گئی

طرف دوڑا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اس میں
 کچھ زیادہ پکھرا نہ تھا۔ تاہم ضرورت پھر کر ضرور تھا۔

کچھ پھلوں کے چٹکے، چٹکے کاغذات کچھ باسی سینڈویچ
 وغیرہ۔

اس نے ادھر دیکھا۔ لوگ مصروف تھے۔ اس
 نے جلدی سے بٹش ماسٹر کو باہر نکالا اور ڈسٹ بین میں

ڈال دیا۔
 میر ہونے پر اس نے بٹش ماسٹر کا سر آسانی سے

کھینچ لیا۔ یہاں سے اسے دوسری ٹرین پکڑنی تھی۔
 تا کہ وہ اس اسٹیشن پر جا سکتا جہاں اس کی کار کھڑی

تھی۔
 بقیہ سفر آرام سے کٹ گیا۔ اس نے اپنی کار
 سنبھال لی۔

الٹھا تو نہیں گزرا۔ اس نجس شے کو جس کا نام بٹش ماسٹر
 تھا اس نے نہ جانے کیوں خرید لیا تھا۔ جب سے اس

نے اسے خریدا تھا مسلسل الجھنوں میں پڑا ہوا تھا۔
 ردی کی نوکری کی خفت، ٹرین میں لڑکی کی جھڑپ شاید

کسی کا لے افریقہ نے بٹش ماسٹر ایجاد کر کے گورے
 لوگوں کے مظالم کا بدلہ لیا تھا۔ جھلاہٹ میں اس نے

سوچا میں کل ہی اسے بوڑھے غومو کو واپس کر کے
 جان چھڑاؤں گا۔ رہی جینی تو وہ جانے جہنم میں۔ اس

کی دماغی حالت زیادہ بگڑی تو میں اسے پاگل خانے
 بھجوا دوں گا۔

یکا یک اسے یاد آیا ٹرین والی لڑکی بگڑی کیوں
 تھی۔

یقیناً یہ بٹش ماسٹر کے نچلے حصہ کی کوئی غلط
 کارروائی تھی جس کی بنا پر لڑکی کو شہ ہوا تھا کہ کوئی اس

کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔۔۔ تو کیا یہ شے۔۔۔
 اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہے۔

چوہے ڈرائیو دے پر کار چلا تے ہوئے
 اس کو فضا بہت چمکی گئی۔

اس نے کار کو اپنے کیرج میں روکا۔ پھر اس
 نے بٹش ماسٹر کو مینٹا اور اس عجیب دروازے میں گھسا جو

بارغ میں کھٹا تھا۔
 وہ اسے اپنا تین ہزار پونڈ کا خریدا ہوائی وی پکٹا

چور حالت میں پڑا نظر آیا۔
 راجر کا بارہ ایک دم سے چڑھ گیا۔

”اجنق خورت۔“ وہ کھلی کھلیوں اور بے داغ
 فرش کو دیکھ کر چپٹا۔ پھر وہ بھٹاتا ہوا چٹاں میں گیا وہاں

اسے کڑھنڈی حالت میں نظر آیا۔ تو اسے معلوم ہو گیا
 کہ آج ڈرنہیں ملنے والا۔

اب۔۔۔
 وہ بالی میں گیا۔ وہاں اسے ایک طرف جینی

ایک میز پر بیٹھی نظر آئی۔ وہ دور ہی تھی۔ اس نے اس
 پر کوئی توجہ نہیں دی۔

”یعنی تم نے ٹی وی کیوں توڑا؟“
 اس سے کوئی جواب نہیں نکلا۔ اس نے غور

سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ جینی کے لباس پر دھبے
 ہیں۔ شاید وہ فرش پر گر گئی تھی۔ اس نے لہجہ نرم کرتے

ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا تھا؟“
 یہ سب اس مکان کا کھیل ہے۔“ اسے

جواب ملا۔
 ”پوری بات بتاؤ۔“

جواب میں جینی سسکی۔
 ”راجر۔۔۔ ہم لوگ کس مکان میں بچپن گئے

ہیں۔ ہم اس مکان کے قیدی بن گئے ہیں۔ ہمیں
 موت کی سزا سنائی گئی ہے۔ مگر تم کیا بھجوتے تم تو ایک

بد عقیدہ آدمی ہو۔ ہم گردوغبار کے اندر دم گھٹ کے
 مرنے والے ہیں۔“

راجر نے ایک لمبی سانس لی۔ اس نے ادھر
 ادھر دیکھا۔ گھر کی صفائی عمدگی سے کی گئی تھی ہر شے

چمک رہی تھی۔
 اس نے اپنی بائیں ہوی کو آواز دی۔

اس نے اپنی بائیں ہوی کو آواز دی۔
 ”جینی۔۔۔! میری بات سنو۔ میں تمہارے

لیے ایک عمدہ چیز لایا ہوں۔ یہ ایک ویکیم کلینر ہے
 ہمارے پرانے کلینر سے کہیں بہتر۔ یہ جہیں بالکل

فارغ کر دے گا۔“
 مگر جینی نے کوئی دلچسپی نہیں ظاہر کی۔

”میں نہیں دکھاؤں گا یہ کس طرح کام کرتا
 ہے۔ میں برتنوں کا سارا گند فرش پر بکھیر رہا ہوں۔

میں کار پٹ پر بھی کچرا پھیلا رہا ہوں۔“
 ”کیا۔۔۔ یعنی تم کو گھر پر کچھا۔“

اب جبکہ جینی دلچسپی لے رہی تھی اس نے جلدی
 سے کاغذ پھاڑا اور بٹش ماسٹر کو براہ کیا۔ اس نے

سے کاغذ پھاڑا اور بٹش ماسٹر کو براہ کیا۔ اس نے

دونوں کچرے کے ڈبے اس کے آگے پلٹ دیے۔
فضائیں بدبوئی پھیل گئی۔
یعنی چٹکی۔ ”اس آدی یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم
نے سارا فرش گندہ کر دیا۔“ رک کر وہ چٹی سے بولا۔
”اچھا تو یہ بات ہے۔ تم بھی اس مکان کی
طرح مجھے ختم کرنے کی سازش میں شریک ہو۔“ وہ
بالکل پاگلوں کی طرح بول رہی تھی۔
راجہ نے صبر سے اسے دیکھا۔ اور بولا۔ ”ایک
منٹ۔ جتنی کوئی بھی تمہارے خلاف نہیں۔ ذرا اسے
دیکھو۔“ اس نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ بش ماسٹر
اطمینان فرما کر پچھلے کچرے کی سمت بڑھ رہا تھا۔
”دیکھو۔“ یہ تختہ میں تمہارے لیے لایا
ہوں۔“

یعنی اچھی۔ اس نے کارنس پر رکھے گل دان کو
اٹھایا اور اسے تولتے ہوئے چٹکی۔
”سانپ۔۔۔ یہ تو ایک سانپ ہے۔“
”اوہ مٹا! راجہ گرا۔“ یہ سانپ نہیں ہے یہ
ایک کلیز ہے۔“
”تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو۔“ وہ چٹکی اور
رونے لگی۔ اس نے بڑھ کر گل دان سے نیچے پڑے
بش ماسٹر پر ضربیں لگانا شروع کر دیں۔ مگر وہ شے
اس سے بے نیاز لگ رہی تھی۔
وہ کچرے تک پہنچ کر اب اسے تیزی سے گل
رہا تھا۔

زمین پر پڑا بش ماسٹر سامنے چٹکی ہوئی
بیوی۔۔۔ اور ہراساں پریشان وہ۔
اس نے اپنی زندگی پر لعنت بھیجی شروع کر
دی۔

معاں کے کندھے پر ضرب پڑی اور اس نے
دیکھا کہ جتنی اس اب پر حملہ آور ہو گئی ہے۔
اس نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے گل دان
چھین لیا۔ لیکن جھکے سے جتنی فرش پر گر گئی۔ وہ ٹھیک
یہاں گری تھی جہاں بش ماسٹر کچرے کو گل رہا تھا۔
اور پھر اس نے جتنی کی پیچ سنی جو پوری طرح

ابھرنے سے پہلے ہی حلق میں پھنس گئی تھی۔۔۔ اور
جب اس نے ادھر دیکھا تو حیرت سے آنکھیں اٹل
پڑیں۔
جتنی کا سر گردن کے پاس سے غائب ہو چکا
تھا۔ صرف چند بال نظر آ رہے تھے۔ مگر اب یہ بھی
غائب ہو رہے تھے کیونکہ بش ماسٹر اسے گل رہا تھا۔
خوف سے خود وہ بھی چٹی پڑا۔ اس نے لپک کر
جتنی کو پیروں سے گھسیٹا تاکہ اس کے سر کو بش ماسٹر کے
منہ سے نکال سکے۔
وہ ایک کوشش میں کامیاب رہا۔ جتنی کا بدن تو
بچ گیا مگر اس کا سر غائب ہو چکا تھا۔ وہاں تو ذرا سا
خون بھی نہیں تھا۔
اس کا صدمہ کم ہونے لگا۔

بش ماسٹر کا رویہ عجیب تھا۔ اسے لگا جیسے بش
ماسٹر اسے دیکھ رہا ہے۔ اپنی آنکھوں سے جو جتنی
ہی نہیں۔
وہ ایک گلی سے باہر کی طرف چلا۔
اب یہی ضروری تھا۔ جتنی تو جانی چٹکی کی جتنی
ماسٹر ہر قسم کے پھڑے سے نشتے والی چیز تھی۔ وہ اس
کی لاش سے بھی نیٹ سکتا تھا۔
وہ اسی کی سمت دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ رہا تھا
کہ دروازے سے کھرایا۔ جلنے کا۔ وہ گھوما اور باہر
نکل گیا۔

جس وقت فضا میں راجہ کی گاڑی اشارے ہوئے
کی آواز ابھری۔ بش ماسٹر نے بھی طے کیا کہ وہ اب
اپنی جگہ سے مزید آگے بڑھے گا۔
☆☆☆

بار میں چند گلاس شراب پینے سے اس کے
کشیہ و اعصاب میں کچھ سکون سا ہوا۔ وہ بہر حال بار
ہی میں تو نہیں رگ سکتا تھا اسے کھر تو جانا ہی تھا۔
اس نے سوچا کہ میں پولیس کو مطلع کر دوں۔ مگر
یہ فیصلہ اسے معقول نہیں لگا۔ پولیس والے لاش ہوا
دیتے وہ بش ماسٹر کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے
سب سے پہلے تو وہ اسی پر شبہ کرتے بات نہیں ختم نہ

ہوتی۔ خبریں جھجکتی، تصاویر آتیں، سوال جواب
ہوتے، مقدمہ چلتا۔
پھر۔۔۔

اس نے سوچا اگر بش ماسٹر غائب کر دیا جائے
اور لاش ٹھکانے لگا دی جائے تو وہ آرام سے کھ سکتا
ہے کہ جتنی اسے چھوڑ کر گئیں چلی گئی ہے۔ اسے کیا
معلوم کہاں۔ وہ کبھی آشیہ کے ساتھ جا سکتی تھی۔
مطلب میں ہو کر اسی نے سگریٹ جلائی۔

اسے جتنی کی موت کا ذرا بھی دکھ نہ تھا۔ بس وہ
پریشان ضرور تھا۔
گھر جاتے ہوئے اس نے راستے میں ایک
پولیس کا روک دیکھا تو اس کے پیٹ میں گولا سا ہنا۔ وہ
ڈرا، اسے ہنسی آئی ایک بڑی مصیبت میں پھنس کر
آئی کا کیا حال ہو جاتا ہے۔

(سوال تھا کہ بش ماسٹر کوئی خطرناک چیز تھا۔ یا
اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ آخر یہ شے کچرے اور
دوسری چیزوں میں اچھا کیسے کرتا تھا اس کا علم اسے نہ
تھا۔ ویسے تو وہ اپنا پیٹ کچرے سے ہی بھر رہا تھا مگر
یہ جتنی والا معاملہ بالکل ایک تھا اور اس سے اس شے
کی خطرناکیت واضح ہوتی تھی اور پھر یہ سوچا جا سکتا تھا
کہ بش ماسٹر کسی بھی طرح کیلہ استعمال میں آنے
والی اشیاء کے خانے میں فٹ نہیں تھا۔

اس شے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ وہ
گھر کے قریب ہو رہا تھا۔ اسے مکانوں کی کھڑکیوں
میں روشنی ہوتی نظر آ رہی تھی۔

کار سے اتر کر وہ باغ کے گیٹ میں داخل ہوا۔
شید میں پہنچ کر اس نے آنکھیں میاڑیں ادھر ایک
اندھیرا تھا۔ اسے لائٹ کا خیال آیا۔ اس کی روشنی میں
اس نے وہ کپھاڑی تلاش کی جو وہاں رکھی ہوئی تھی۔
کپھاڑی ہاتھ آتے ہی اس کا اعتماد بحال ہو گیا۔ وہ
بش ماسٹر سے منٹ سکتا تھا۔ اس کے سر پر تاروں بھرا
آسمان تھا۔ اور پاؤں تلے بزم گراس۔

اس کے سامنے وہ کھلا ہوا دروازہ تھا جو جتنی کے
مقبرے کا تھا۔ جہاں وہ پاگل کر دیئے والی شے بش

ماسٹر بھی موجود تھی۔

دروازے سے ہلکی سی بو آ رہی تھی۔ راجہ نے
کسی قدر ہمت کر کے دروازے پر گھٹنیں کو دبانا چاہا
مگر خوف نے اسے روک دیا۔ کہیں اس طرح وہ
چوک نہ ہو جائے اس نے سوچا۔ اس لمحے اس کے
غیروں کے پاس کسی شے کی حرکت کا احساس ہوا۔ وہ
بڑے زور سے بدکا۔ غلج سے اس نے ہاتھ میں دہلی
کپھاڑی اٹھائی اور اسے نیچے موجود شے کے گلچے سے
بیولے پر دے مارا۔

کپھاڑی نے فرش پر موجود شے کو دو ٹکڑوں میں
بانٹ دیا۔ اور اس کا پھل زمین پر اتر گیا۔
”لارلیا۔“ وہ بڑبڑایا۔

اس نے بڑھ کر دیوار کے شٹن کو دبایا۔ روشنی
ہوتے ہی اس نے فرش پر نگاہ ڈالی اور اس کے منہ
سے ایک کراہی نکلی۔ ”اوہ۔۔۔“

اس کے سامنے اس کی پائلوٹ کی کاسم دو حصوں
میں پڑا ہوا تھا۔ وہ دیوار سے ٹک کر پھٹنے لگا۔
بڑی مشکل سے اس نے زمین میں گڑی ہوئی
کپھاڑی جدا کی اس کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں گھس
گیا۔ اس نے شٹن دب کر روشنی کی۔

وہاں ہر چیز پچھلے جیسی تھی بس ایک بات نئی تھی
یعنی کالا شہ موجود نہ تھا۔ قریب ہی بش ماسٹر لٹا پڑا
تھا۔ بالکل سبکت اس کی دم کچرے کے ڈھیر میں
پھنسی ہوئی تھی۔ اس وقت یہ شے بے ضروری تھی۔ اس
نے بڑھ کر اس کا جائزہ لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ جتنی
کیوں غائب تھی۔

بش ماسٹر کے منہ میں اس کے دونوں پیر پھنسے
ہوئے تھے۔

بش ماسٹر کو اسے ہضم کرنے کے لیے وقت
درکار تھا۔

اس لمحے اس کا جی چاہا کہ وہ کپھاڑی کا وار
کر کے اس شے کو ٹکڑوں میں بدل دے۔ مگر وہ رک
گیا۔ بش ماسٹر نے تو جتنی جیسی بالکل عورت سے اس
کی جان چھڑا دی تھی۔ یہ احسان کا بدلہ نہ تھا۔

اس نے بش ماسٹر کو تھا ما اور گھینٹا ہوا باہر کی طرف چلا اسے وہ کار تک لایا۔ پھر اس نے اسے لپیٹ کر کار میں ٹھونس دیا۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے کار چلائی اور ریلوے لائن کی طرف چل دیا۔ راستے پر اسے خوف رہا کہ کہیں کوئی پولیس کار نہ آ جائے۔

بالآخر وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ گھر سے دو میل کے فاصلے پر بنجر زمینوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔ ادھر شہر بھر کا کچرا لا کر ڈالا جاتا تھا۔ ساری فضا میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کچرے کے اونچے اونچے ڈھیر جمع تھے۔ ایک جگہ پر اس نے کار روک دی۔

کار سے اتر کر اس نے اس کا پچھلا دروازہ کھولا اس نے دیکھا بش ماسٹر کے آخری حصے سے ملتی تھی کسی بڑے غبارے کی طرح پھولا ہوا ہے۔ گھومو کی ہدایت کے مطابق اس بیک کو اس کے بدن سے علیحدہ کرنا تھا۔ اس نے اسے علیحدہ کیا اور اس کے مادے کو وہیں زمین پر نکمیر دیا۔

اس کوشش میں اس کے ہاتھ اور کپڑے گندے ہو گئے۔ اسی لمحے سوئے ہوئے بش ماسٹر میں جیسے زندگی جاگئی۔ دوسرے لمحے اس کے منہ میں ہنسنے ہوئے مٹی کے دھڑ کا حصہ غائب ہو گیا۔ شاید وہ جنس کی کیفیت میں تھا۔

اس نے بش ماسٹر کو الوداع کہا۔ چلتے ہوئے اس نے نوٹ کیا بش ماسٹر پیکر میں بڑا ہوا ہے کہ اپنا کام کہاں سے آغاز کرے۔۔۔ کیونکہ یہاں تو ہر طرف ہی کچرا انبار کی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جلدی میں اس نے اس کا تھپلا بھی وہیں پھینک دیا ہے۔ گویا بش ماسٹر اب مکمل طور سے آزاد تھا۔

گھر آ کر راجہ نے گھر میں پھیلی گند کی صاف کی۔۔۔ دونوں کچرے کے ڈبے بھر گئے۔ اس نے مردہ مٹی کی لاش کو مٹی میں ڈالا۔ پھر اسے ترکاری کی کیاری میں گڑھا کھودو دفن کر دیا۔

جب وہ صفائی کے لیے کام سے فارغ ہوا۔ تو سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔ البتہ فرش کے وہ ٹائل ابھی تک ٹوٹے ہوئے تھے جہاں کلبازی و جنسی تھی۔

اس کے ذہن میں اب ایک پورا منصوبہ ابھر چکا تھا کہ وہ بیوی کی کم شدگی کی وضاحت کس طرح کرے گا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے وہ اس کے چند عزیزوں سے رابطہ کرے گا جنہیں اس عورت سے مراق کا مل تھا۔

رات کوئی ڈھائی بجے تک وہ مصروف رہا مگر وہ شاور تلے اس نے دیکھا کہ وہ گھٹکتا رہا ہے۔ تاہم جب وہ سوئے کے لیے بیڈ روم میں گیا تو اسے بے حد وحشت ہوئی۔ اس نے تکیہ اور چادر لیا اور اپنی کار میں جا بسا۔

☆☆☆

مس بیگل جس کا نام پورا نام جینی بیگل تھا، نے اسے دیکھا تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ راجہ کا حال بدلا ہوا تھا۔ وہ خاصی تاخیر سے آفس پہنچا تھا۔ اس کا سوٹ بھی بہتر تھا اور اس کی آنکھیں بھی سوچی ہوئی تھیں۔

”بیک کافی۔“ آتے ہی وہ غرایا ”اور چند سینڈوچ بھی۔“

”میں سر۔“ اس سے قبل اس بیگل کچھ کہتی وہ دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔

راجہ بہر حال خوش تھا۔ اسے ایک نئی لڑکی ملی تھی۔ اب دفتر اس کے لیے مٹی سے بچنے کے لیے پناہ گاہ جیسا نہیں تھا۔ اس نے انٹرکام پر مسکری کو طلب کیا۔

”جی ابھی آئی۔“ مس بیگل نے کہا۔ ”میں کافی بیمار ہیں۔“

”اسے پھوڑو۔“ اس نے کہا۔

جب وہ آئی تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ مڑ کر راجہ نے کہا۔ ”مس بیگل میں پچھٹی پر جا رہا ہوں۔ تین یا چار ہفتے کے لیے۔“

”میں چاہتا ہوں تم جی میرے ساتھ چلو۔“

”جی۔“ مس بیگل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

اسے راجہ ایک دم سے اچھا لگنے لگا۔ وہ مدت سے اس آفس میں تھی۔

”مگر مسٹرنگ۔۔۔“

”تم مجھے راجہ کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں ابھی چیئر مین کے پاس جا رہا ہوں کوشش کروں گا کہ میری یہ رخصت و رنگ یو سے بدل دی جائے۔ اس طرح میں کمپنی کے خرچ پر گھوم سکوں گا۔ یورپ کے اس دورے پر مجھے سیکرٹیری کی ضرورت ہوگی۔“ رک کر وہ آگے بڑھا اس نے مس بیگل کو کمرے کے کچرے پر چٹا لیا۔

”راجہ چیئر مین بتا رہیں ہوا تو ہم اپنے خرچ پر جائیں گے تم بیماری و رنگ کا بھانا کر کے چھٹی لے سکتی ہو۔“

”مگر اخراجات۔۔۔“

”کہنا یہ سب میں کروں گا تم فکر ہی نہ کرو۔“

”ٹھیک ہے۔“ مس بیگل مسکرائی۔

چیئر مین نے نہ صرف اس کی درخواست مان لی بلکہ یہ سن کر راجہ کی بیوی کہیں چلی گئی ہے۔ اس نے اس سے اظہارِ تسلی بھی کیا اور کہا کہ خود اس کے ساتھ بھی ایسا واقعہ بھی پیش آ گیا ہے۔ اس نے کہا۔

”مبارک ہو۔ اس عورت کے جانے سے میرے ادھر سے خواہش مٹ گئی تھی۔ دیکھو آج میں ان کی بڑی پتی کا چیئر مین ہوں۔“

گھر جاتے ہوئے اسے فکر لاحق بھی ہوئی اس سے کوئی چوک ہو گئی ہو۔ اس وقت ممکن ہے مکان میں پولیس والے بھرے ہوں۔

جب وہ گھر پہنچا تو ہر چیز نارمل تھی۔ اس نے سوچا اب مجھے آخری کام یہ کرنا ہوتا کہ اس مکان کو فروخت کر دیا جائے۔ اس نے ملے کیا کہ یورپ

کے دورے سے واپسی پر وہ بھی یہی کام کر کے گا اس کے بعد وہ لندن میں کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ خرید لے گا۔

وہ اب آزاد تھا اور یہ آزادی اسے بش ماسٹر کے توسط سے ملی تھی۔ اسے اپنے کانوں میں گھومو کی آواز سنائی دی۔ ”میں دیکھ رہا ہوں تم پریشان ہو اور یہ پریشانی تمہارے کوڑے کچرے سے مشتاق ہے۔“

خوب اس نے سوچا بلاشبہ مٹی کی مسکے سے کم نہ تھی۔

اس پر بے کیفی طاری ہونے لگی۔ شاید اس کا تعلق مکان سے تھا۔ اسے یہ جگہ بہت ہی ڈل اور بورنگ لگ رہی تھی۔ اس میں رہنا دائمی پاگل کر سکتا تھا۔ مٹی کے پاگل پن میں ضرور اس کا ہاتھ تھا۔ اس کے ہاں جو بچے پیدا ہوتے ہی نہ مر جاتے تو شاید وہ پاگل نہ ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ مٹی بچپن ہی سے کچھ مراق تھی۔

اس نے بش ماسٹر کا شکر یہ ادا کیا۔

ورنہ ممکن ہے مٹی کی طرح وہ بھی مراق ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

روم، ویانا، جینوا، جنس اور میڈرڈ۔۔۔ یہ منزلیں راجہ اور جینی کے پیار کی منزلیں بنی تھیں۔ رخصت کے دن ہوا کے جھوکے کے طرح گزر گئے۔

جب وہ ملے تو ان کے دلوں میں کوئی حسرت نہیں رہی تھی۔ جینی نے بیگل کو اس کے گھر کے پاس اتار دیا۔

بیگل کے جانے کے بعد اس نے جنسی کو لیور پول انیشین کی طرف چلنے کو کہا اس وقت انیشین پرش نہیں تھا۔ اسٹافورڈ انیشین پر جہاں ایک بار ایک لڑکی نے اسے جھڑکا تھا اس نے سوچا، گھر پر کیا کچھ اس کی فتنہ ہو سکتی ہے پولیس۔ وارنٹ۔ اور کہیں بش ماسٹر واپس نہ آ گیا ہو۔

راستے بھر اسے وحشت رہی۔ جب اس کا اپنا

اشٹین آگیا تو وہ اتر گیا۔ یہاں سے وہ جگہ زیادہ دور
نہی جہاں پھر پڑا تھا۔ جس جگہ اس نے بش ماسٹر کو
چھوڑا تھا۔

اشٹین کے باہر اسے لمبی سی سفید فورڈ نظر آئی
جس پر لکھا تھا شرلی کی ٹیکسیاں۔ ڈرائیور کی سیٹ
پر ایک پختہ عمر کی عورت بیٹھی تھی جس نے بالوں کو
قدیم انداز میں باندھ رکھا تھا۔ راجر نے ایک
سامان کھلی سیٹ پر ڈال دیا اور عورت کے ساتھ
والی سیٹ پر بیٹھا۔ نزدیک ہو کر اس نے عورت کا
چانزہ لیا۔ اسے وہ ایک شاندار کسے ہوئے جسم کی
مالک محسوس ہوئی لیکن اس کے نقوش بھی ایک
جاذب نظر تھے۔

ان دنوں نہ جانے کیوں راجر عورتوں کو لالچی
انداز میں دیکھنے لگتا تھا۔

ڈرائیور عورت نے پوچھا۔ ”کیا یورپ کے
دورے سے ملے ہو؟“
راجر مسکرایا۔ ”گویا دوستی ہو سکتی تھی۔“ اس نے
کہا۔

”ہاں امین سے آ رہا ہوں۔“ لہجہ بھر بعد اس
نے پوچھا۔

”کیا تمہارا نام شرلی ہے۔“ ساتھ ہی اس نے
اپنا بازو عورت کی سیٹ کی پشت پر رکھ دیا۔ عورت نے
ایک لمبی سی سانس لی۔ انداز ایسا ہی تھا۔ جیسے اس نے
یہ ترکیب ہزار بار دیکھی ہو۔

”میں دوسری شرلی ہوں۔“
”کیا مطلب؟“

اسی لمحے ایک اور سفید فورڈ ٹیکسی قریب سے
گزری اس کے اندر سے کئی ہاتھ ہلایا۔

”میرا نام پٹیلی شرلی ہے۔“

پھر اس نے آگے جاتی ٹیکسی کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں میرا شوہر ”رتج“ تھا
سانہ تم نے اس کا نام۔“

راجر نے ٹیکسی میں سر ہلایا تو عورت نے کہا۔
”حیرت سے کیا تم کشتیاں نہیں دیکھتے۔ اونچے پیر

اشارہ پہلوانوں میں شامل ہے۔“
راجر کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ اس نے
آہستگی سے اپنا بازو عورت کی پشت سے ہٹا لیا۔

”رتج خوب صورت تو نہیں ہے مگر بہت قائلو
آدی ہے۔ طبیعت کا بھی اچھا ہے بس غصہ کا بہت تیز
ہے۔ ایک بار تو رتج نے پورا دروازہ ہی اکٹھا کر دیا
تھا۔“

عورت یوتی ری وہ سن رہا۔ وہ سوچ رہا تھا اس
عورت سے معاشرے سے پہلے مجھے کرائے میں ایک
ٹیکسی اس کے گھر کے نزدیک ہی تھی کہ ڈرائیور
شرلی نے پوچھا۔ ”تم نے شہر کے پچرا گھر کے بارے
میں سنا ہے؟“

”نہیں کیوں؟“
”بڑا۔۔۔ بڑا معاملہ ہے۔ اخباروں میں ہفتوں
سے اس کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ دیکھنا اس ہفتے کا اخبار
سامنے ڈیش بورڈ تلے ہوگا۔“ پچھلے دن رتج نے جھپٹ کر
لائٹ بھی جلادی۔

راجر نے اخبار کھولا۔
اچھی بڑی سی سرخی تھی۔ ”پچرا گھر۔۔۔ ٹیکسی
اجرت کے بغیر صاف کر دیا گیا۔“

راجر نے جلدی سے تفصیل پڑھی۔ معلوم ہوا
کہ ہفتے بھر کے اندر چھوڑ دی گئی تھی۔ ڈمپ کے ایک
بڑے حصے کو صاف کر دیا گیا تھا۔ اس کوئی گھاس نہ تھی
وہاں گھاس اگ رہی تھی۔ یہ کام بلا اجازت کیا گیا تھا
لہذا ایسی حکام سخت خفا تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ کام کسی
غیر اہلی فرم کا ہو سکتا ہے۔

اخباروں نے اس جگہ کو پارک بنانے کی جو یز
دے دی تھی۔ مگر شی حکام مصر تھے کہ اسے بطور پچرا
گھر ہی استعمال کیا جائے گا۔

اخبار کے آخری پیرے میں البتہ چند باتیں
ایسی تھیں جن سے راجر کا دل کتا دل پکھ پر سکون ہو
گیا تھا۔ اس میں بش ماسٹر کا کوئی ذکر نہ تھا۔ نہ کسی
گردہ کا کام ہے گردہ اپنی کاروائی کسی اور جگہ کر

رہا ہے۔
”خوب۔“ راجر نے اخبار بند کرتے ہوئے
کہا۔

”میں خود ادھر دیکھنے گئی تھی۔“ عورت ڈرائیور
نے کہا۔ ”وہاں انہوں نے ہر طرف ٹھیلے لگا کر اسے
گھیر لیا ہے۔“ رتج اس پر بے کراتا بڑا پچرا گھر
صرف چند دنوں میں صاف کیے کر دیا گیا۔
”ہو سکتا ہے یہ کوئی فراڈ خبر ہو۔“ راجر نے
کہا۔

اس کا گھر آ گیا تھا۔ اس نے اتر کر سامان
ٹکالا۔ اس نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا مگر اس نے عورت
کو ایک کوڑی بھی زیادہ نہیں دی حالانکہ ابتدا میں اس
کا ارادہ تھا۔ اس عورت سے مایوس ہو کر کچھ افسردہ
ہو گیا تھا۔ پھر اسی نے کہا۔

”ہاں اچھے شوہر رتج سے ملکر سلام کہنا۔“
عورت نے منہ بند کر کے دیکھا گاڑی چلا دی۔
اس نے گھر کے اپنے مکان کی طرف دیکھا اسے
یہ بڑا سراگ۔

سڑک پر لگا لیب وینڈل سا تھا۔ وہ اسی روشنی
میں آگے بڑھا اس نے اپنا سامان پورچ میں رکھ دیا۔
بچی نکالی۔ نقل کو لا کر فضول۔ شاید یہ اندر سے بند تھا
اور وہ غالباً بچن والے راستے سے نکلا تھا۔ وہ دباغ کے
عقبی حصے میں گیا۔ کوئی ٹھوس سی شے اندر حصے میں
بچن کے دروازے پر اسے نظر آئی اس نے اپنا لائبر
جلا یا مگر اس میں پرنٹ نہیں تھا۔ شعلہ جلتے ہی بجھ گیا
تھا۔ بہت بری رات تھی۔ بہر حال اس نے اس کی
معمولی چمک میں دیکھ لیا تھا پچرا اور اس کے حواس
اڑانے کے لیے یہ جھلک کافی تھی۔ سامنے ہی
بجورے رنگ کے اونچے لفافے میں ایک پارسل پڑا
تھا۔ اس نے اسے چھو کر دیکھا۔ یہ دراصل وہ گینز
تھا جو اس نے حرمت کے لیے بیچا تھا۔ ریپیرنگ
کرنے والے گھر میں کسی کو نہ پا کر اسے اس کے
دروازے پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ مسکرایا۔ وہ خواہ مخواہ ڈر
گیا تھا۔

رتج کر اس نے اپنے کپڑے جھاڑے۔ پھر
اس نے بچن کے دروازے کی بجلی کی تھوڑی سی
جھڑک سے قفل کھل گیا۔

بش ماسٹر اب یہاں سے کوسوں دور تھا۔ یہ
بات اس نے اخبار میں دیکھ لی تھی۔ لہذا اب ادھر سے
اسے کوئی فکر نہ تھی۔
اس نے کندھے سے دروازہ کھولنے کی کوشش
کی تو دروازہ تھوڑا سا کھل گیا۔

اس نے اپنے ایک اور دھکا دیا۔ اب دروازے
میں اپنی جگہ بن گئی تھی کہ وہ گزر سکتا تھا۔
وہ بچن میں گھسا اندر بہت سخت اندر جھرا تھا۔
وہاں کی بو نے اس کا استقبال کیا۔ اسے اپنی آنکھ میں
پانی آتا محسوس ہوا ساتھ ہی اس کی سانس بھی جیسے
تھمنے لگی۔ پھر اس کا پاؤں کسی چیز میں پھنس گیا۔ اس
کے کانوں میں ایسی سرسراہٹ ہو رہی تھی جیسے چھت
آہستہ آہستہ سرگ رہی ہو اور ریت کے ذرات گھبر
رہے ہوں۔

کھانستے ہوئے اس نے آنکھیں صاف کیں
پھر وہ اس حصے تک پہنچ گیا جہاں لائٹ کا بٹن تھا۔
جو بجلی بجلی چلی اس کے دماغ میں بھی بہت سے بلب
جل اٹھے۔ اسے مردہ بچی کی بات یاد آئی جس میں
اس نے کہا تھا۔ ”جھپٹ پکھ پتا ہے۔ گردوغبار کے بادل
بچن میں مسلسل آ رہے ہیں۔“

اب اس کے پیر کی انچ موٹی گرد کی تہہ میں
پھنسے ہوئے تھے۔

راجر نے دیکھا کہ کھچت کئی جگہوں سے چٹری رہی
ہے۔ فرش کا بھی کچلی حال تھا۔ دیواروں میں بھی
دراڑیں تھیں۔ ہاتھ روم میں شاید ٹکا لیک کر رہا تھا
جس کی وجہ سے وہاں بچہ بھرا ہوا تھا۔

گرد کی وجہ سے بچن اور بال کو جوڑنے والا
دروازہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ کھل نہیں رہا تھا۔
”ہم چلے گئے تو اس گھر کی حالت کیا ہو جائے گی۔“
کچھ آنڈیا ہے جھپٹ۔۔۔“ اسے مردہ بچی کی گفتگو
پھر سنائی دینے لگی۔

دوشادہ

ایم ایاس

ایک شخص کا قصہ، وہ اپنے علاقے کی چوکیداری کیا کرتا تھا۔ اس کے حالات بہت ہی دگرگوں تھے، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اپنے حالات کو سنوارے۔۔۔۔۔ مگر اس کی کوئی راہ نظر نہ آ رہی تھی۔ ایک شخص نے اسے پیش کش کی کہ وہ اگر اس کا ایک معمولی سا کام کر دے تو اس کے بدلے میں وہ ٹھیک ٹھاک معاوضہ دے گا۔ وہ شاید راضی نہ ہوتا۔۔۔۔۔ مگر اس کے سامنے گھر کی مجبوریاں اگلی تھیں۔۔۔۔۔

اس شمارے کی ایک خوبصورت۔۔۔۔۔ فکر انگیز کہانی!

سے ادا کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی کو فرض عبادت کے برابر سمجھتا تھا۔ بچہ کی اذان تک اپنی ڈیوٹی سنبھالنے سے انعام دیتا تھا۔ عام چوکیداروں والی عادتیں اسے چھو کر بھی گھسیٹتی تھیں۔ اس نے معمول کے مطابق بڑی تیزی کے ساتھ اپنا آخری راولڈ مکمل کیا اور مسجد جا پہنچا۔ آج بھی مسجد میں روز کی طرح نمازیوں کی تعداد اٹھنے میں نمک کے برابر تھی۔ جس وقت وہ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آیا

نئی مسجد سے بچہ کی اذان ہونے لگی تو اپنے دل میں سوچا کہ وہ جلدی سے اپنے علاقے کا آخری راولڈ مکمل کر مسجد پہنچے پھر نماز پڑھ کر سیدھے گھر چلا جائے گا۔ برسوں سے اس کا یہ معمول بن گیا تھا۔ گریوں کے دن ہوں یا شدید سردیوں کے، چاہے سوळा دھار بارش ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ گھر پر کوئی سخت بیماریوں نہ ہو، وہ کوئی دس برس سے رہتا تھا۔ بڑی ذمہ داری، خوش اسلوبی اور باقاعدگی



دستخط

خان صاحب برسوں چیک پر انگوٹھا لگاتے رہے لیکن جس دن ان کا بینک بیلنس ایک لاکھ روپے ہو گیا انہوں نے اردو میں دستخط کرنے سکھ لیے فرماتے تھے ”انگوٹھا لگا کر سود خوریوں سے اور ڈرافٹ لینے میں تو کوئی حرج نہیں، پر حلال کی کمائی کی رقم سوچ سمجھ کر ہٹانی چاہیے۔“

دستخط کیا تھے لگتا تھا کوئی لنگڑا کا کوچ دوڑاتے ہیں غسل کر کے کاغذ پر سے گزر گیا ہے۔ دستخط کے دوران ان کا ہاتھ ایسی تو ڈراموڈی سے گزرتا اور ہر چھوٹا بڑا دائرہ بناتے وقت ان کے کھلے ہوئے منہ کی گولائی اس طرح کھتی پڑتی تھی کہ ایک ہی دستخط کے بعد ان کے ہاتھ اور دیکھنے والے کی آنکھ میں ہلکا سا آجاتا۔ اس زمانے میں خان صاحب کا لاکھ ڈرافٹ مسلم کرش بینک، چوک یا دیگر برانچ میں تھا، جہاں اردو میں دستخط کرنے والوں کو اسٹامپ کاغذ پر پھینک دیتے تھے۔ تو وہاں آئینہ خانا دینی ہوتی تھی کہ اگر ان کے اکاؤنٹ میں جعلی دستخطوں کے سبب کوئی فراڈ ہو جائے تو بینک ذمہ دار نہ ہوگا بلکہ اگر اس کے نتیجے میں بینک کو کوئی نقصان ہوا تو اسے لایا جلا واسطہ پہنچے تو اسے بھی وہی بھریں گے۔ خان صاحب کے بینک اس کا مطلب پشتو میں سمجھا گیا تو مشتعل ہو گئے کہتے تھے بینک کے انگریز مینیجر سڑاے میں کلن کے پاس احتجاج کرنے گئے کہنے لگے ”میرے دستخط اتنے خراب ہیں کہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی بنا ہی نہیں سکتا۔ جب میں خود اپنے دستخط اتنی مصیبت سے کرتا ہوں تو دوسرا کیسے بنا سکتا ہے؟“

اس دوران سے کوکھو لے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بیلنس سے اندازہ لگا سکتا تھا زینوں سے آنے والی دھول نے دروازے سے ایک موٹا ستر بچھا دیا ہوگا۔ دروازہ مکمل طور سے جام ہو گیا تھا۔ راجہ کی ہمت جواب دے گئی۔ پکارتے ہوئے ذہن اور بوجھل دماغ کے ساتھ وہ پلٹا اور دوبارہ بارش کی طرف چلا جہاں مشین رکھی تھی۔ ابھی وہ آدھے راستے پر ہی تھا کہ اس کے اوپر چھت کا ایک حصہ آواز کے ساتھ گرا۔ خاک، دھول، ٹنگروں، پتھروں کا ایک طوفان تھا۔

اس کی سانسیں دھول سے اٹ گئیں۔ اس نے سوچا میری سانس بند ہو رہی ہیں۔ موت کے انکشاف پر مگر وہ حیرت انگیز طور پر پریشان نہیں ہوا۔ اسے راجہ کی خوف نہ تھا کہ وہ چھت سے تلوہب گیا ہے اور مرنے والا ہے۔ بلکہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ کسی منصوبے کے عین مطابق ہو رہا ہے۔

وہ بہت آہستگی سے اٹھایا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ اٹھ رہا تھا۔ ایک آسمان کی طرف جہاں ستارے کھڑے ہوئے تھے۔ دور اسے ایک ہیوا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ روشنی سے بنا ہوا ہیوا۔

اس ہیوا کے نقش اس کے لیے ابھی نہ تھے اور پھر اس نے اسے پہچان لیا۔

یہ جتنی تھی۔ اس کے جسم سے ایک باریک لباس لپٹا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال روشنی میں سنہرے تاروں کی طرح دکھ رہے تھے۔ پھر جتنی نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اسے بلارہی ہو۔ اور جب۔۔۔۔۔ دہشت نے اسے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ راجہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔۔۔۔۔ اور بہت سی دھول اور مٹی اس کے منہ کے اندر حلق تک بھر گئی۔

اس نے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ راجہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔۔۔۔۔ اور بہت سی دھول اور مٹی اس کے منہ کے اندر حلق تک بھر گئی۔

اس نے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ راجہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔۔۔۔۔ اور بہت سی دھول اور مٹی اس کے منہ کے اندر حلق تک بھر گئی۔

اس نے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ راجہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔۔۔۔۔ اور بہت سی دھول اور مٹی اس کے منہ کے اندر حلق تک بھر گئی۔

اس نے اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ راجہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولا۔۔۔۔۔ اور بہت سی دھول اور مٹی اس کے منہ کے اندر حلق تک بھر گئی۔

تو خاصا بالا پھیل چکا تھا۔ شرقی افق خاصا روشن تھا۔ جیسے اب سورج طلوع ہونے ہی والا ہو۔ بڑی خوشگوار فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ بس اس میں جیسے امرت گھلتا جا رہا ہو۔ ساری سحر اور سحر مند ہی ایک عجیب سی فرحت میں تبدیل ہوئی تھی۔ وہ اس راستے پر چل پڑا جو پارک کے سامنے سے ہوتا ہوا اس کے گھر کی سمت جاتا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد اس راستے پر چلتے چلتے معاً اسے احساس ہوا کہ کوئی غیر محسوس انداز سے اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہے۔ اس نے دل میں ایک بل کے لیے سوچا کہ اس کا تعاقب کون کر رہا ہوگا؟ کس لئے تعاقب کر سکتا ہے؟ وہ کوئی دولت مند اور خوش پوشاک تو نہیں۔ جس کی جیب میں کوئی بڑی رقم موجود ہو۔ وہ محض ایک چوکیدار ہے۔ اس کے علاقے میں جتنے مکانات آتے ہیں اس سے اسے ماہانہ آمدنی سات آٹھ سو روپے ہوتا ہے۔ اس کی جیب میں اس وقت چار پانچ روپے بڑے ہوئے ہیں۔ یہ اس کا دامن ہے۔ پھر یہ کہ رات کا وقت بھی نہیں ہے اور اندھیرا بھی نہیں ہے۔ دن کا اجالا ہے جو ہر لمحہ روشن ہو رہا ہے۔ مگر سناٹا اور پرانہ ضرور ہے۔ پھر بھی وہ اپنا شک دور کرنے کی غرض سے رکا اور پلٹا۔ یہ دیکھ کر اسے شدید حیرت ہوئی کہ یہ اس کا دم نہیں تھا اور اس کا اندازہ درست تھا ایک خوش پوشاک شخص تیزی سے اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اندازاً تعاقب جیسا ہی تھا۔ راجو نے اس شخص کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اسے پہچانتے ہی وہ چونک گیا اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ اس کا نام جشید احمد تھا۔ جو دو ہزار گزی کی گلی میں رہتا تھا۔ اس علاقے میں اسے ہی بڑا آدمی مانا جاتا تھا جو بڑی گلی میں رہتا تھا۔ پھر بڑائی کی دوسری پہچان کا ریں ہوئی تھیں۔ جشید احمد کی لال رنگ کوئی کے وسیع احاطے میں ہمیشہ پانچ چھ ماڈل کی کاریں دو تیز گاڑیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ جن کی خوب صورتی بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ راجو دل میں ہنسنا۔ اتنے بڑے آدمی کو اس کا تعاقب

کرنے کی کیا ضرورت پڑی۔ اسے غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہر شخص کی ہوا خوری کے لئے نکلا ہوگا۔ مگر اس نے بھی اس سے پہلے جشید احمد کو گھٹلے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں اور عجیب بھی ہوتی ہیں۔ پھر وہ پلٹنے لگا تو اس نے دیکھا کہ دفعتاً جشید احمد نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اسے رکھنے کا اشارہ کیا ہے۔ پھر بھی اس نے پلٹ کر دیکھا کہ کہیں کوئی اور شخص تو نہیں ہے جسے رکھنے کے لئے کہا جا رہا ہو۔ مگر اس کے سوا یہاں کوئی اور شخص نہ تھا۔ پھر راجو اس کی جانب محوم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ راجو کو خواب کا سا گمان ہو رہا تھا اس لئے کہ جشید احمد بڑا مغرور اور تیز مزاج شخص تھا۔ اپنی بڑائی کا ضرورت سے زیادہ ٹھنڈ تھا۔ یہ تو وہ شخص تھا جسے سلام کرو تو نگوار سا محسوس ہوتا تھا اور سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا تھا مگر آج تو جیسے کوئی مجبور ہو گیا تھا۔ جشید احمد جیسا شخص ایک معمولی چوکیدار کے پیچھے بھی نہ جانے کہاں سے چلا آ رہا تھا اور پھر اس نے اسے رکھنے کا اشارہ کیا تھا۔ تو کیا آج وہ جشید احمد کی نظر واپس لے کر کوئی اہم آدمی ہو گیا ہے؟ وہ ایک حقیر سے آدمی کو کس لئے اتنی اہمیت دے رہا ہے؟ پھر راجو کے ذہن میں ایک خیال بجلی کا کوندان لڑ لڑا۔ اسے اہمیت دینے کے پیچھے جشید احمد کی کوئی گہری غرض یقیناً چھپی ہوئی ہوگی۔ ورنہ یہ لوگ تو بغیر مطلب کے اپنے ماں باپ کی خدمت بھی نہیں کرتے۔ جشید احمد گھنٹوں بعد اس کے قریب آ کر کھڑا ہوا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ تیز چلنے کی وجہ سے جشید احمد کا سانس پھول رہا تھا۔ جشید احمد نے جلد ہی اپنی سانس پر قابو پا کر بڑی تیزی سے خود کشی سے پوچھا۔ ”تمہارا نام راجو ہے؟ تم ہی ایف ایریا کے چوکیدار ہونا؟“ جشید احمد کے منہ پانچا من کر کے احساس کے تحت راجو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ

صاحب اس کے نام سے واقف ہیں۔ ورنہ اس علاقے میں چوکیدار کا نام..... صرف چوکیدار ہی ہوتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”جی جناب میرا راجو ہے اور میں یہاں کا چوکیدار ہوں۔“ ”دیر کی گڈ!“ جشید احمد کا چہرہ دمک گیا۔ اس کے لیوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ ”بھئی تم بہت تیز چلتے ہو۔ جیسے ریل گاڑی چلتی ہے۔“ ”عادت سی ہوگی ہے جناب۔“ راجو نے افسار دیکھا۔ ”رات میں کئی راولڈ لگانے بڑے ہیں۔ اس وجہ سے تیز چلنے کی عادت پڑ گئی ہے۔“ ”میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے کہ تم اس علاقے کے پرانے چوکیدار ہو، کوئی دس بارہ برس چوکیداری کر رہے ہو؟“ جشید احمد کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”جی جناب آپ لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کی عنایت رہی آخری سانس تک خدمت کرتا ہوں گا۔“ اس نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ ”میں نے تمہاری بڑی تعریف سنی ہے کہ تم بڑے ذمہ دار، مقرر شاس اور انتہائی شریف آدمی ہو۔ آج تک ایسا چوکیدار اس علاقے میں نہیں آیا ہے۔“ جشید احمد جیسے شخص کی زبان سے اپنے بارے میں تعریفی کلمات سن کر اس کے جسم میں ایک عجیب سی خوشگوار کھینچی دوڑ گئی۔ ایسی ششاس آج تک کسی نے اس کے کانوں میں نہیں سنی تھی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ جیسے کسی کنواری لڑکی کی طرح شرما سا گیا۔ اس کے دل میں جشید احمد کے خلاف جو کثافت تھی وہ واصل ہو گئی۔ ”بھئی راجو!“ جشید احمد نے بڑی محبت سے اپنا ہاتھ کے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”میں کئی دنوں سے تمہیں کہاں کہاں تلاش کر رہا ہوں۔ کئی بار گلی کوچہ تمہاری حلاں میں نکلا تو بتا چلا تم اپنی ڈیوٹی ختم کر کے گھر چل چکے ہو۔ تمہارے گھر کا پتا معلوم نہ تھا ورنہ

وہاں پہنچ جاتا۔ چلو آج تمہیں پائی لیا۔“ ”آپ اپنے کسی ملازم سے کہہ دیتے تو وہ میرے گھر آکر اطلاع دے دیتا اور میں حاضر ہو جاتا جناب۔“ وہ ایک ہی سانس ہی کہہ گیا۔ ”میں کسی وجہ سے ان کے ذریعہ سے تمہیں بلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں خود ہی تم سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا۔“ جشید احمد مسکرایا۔ ”بھئی!“ نامعلوم خوف سے اس کے سینے میں دل دھک دھک کرنے لگا۔ ”کوئی خاص بات ہے جناب؟“ اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔ ”ہاں بھئی!“ جشید احمد نے سر ہلایا۔ ”میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں کھڑے کھڑے کب تک بائیں کرتے رہیں گے۔“ اس نے توقف کر کے ادھر ادھر دیکھا اور بولا ”چلو۔“ پارک میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہیں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ ایک سرد دلہن نے راجو کی ریڑھ کی ہڈی کو چھو لیا تھا اور اس کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ جشید احمد تو چونک اور دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتا تو چونک جاتا اس نے جلد ہی اپنے خوف کی کیفیت پر پوری طرح قابو پا لیا۔ اس کا اندیشہ درست نکلا تھا وہ سمجھ گیا کہ جشید احمد کی سلسلے میں اس بات کرنا چاہتا ہے۔ کوئی دس پندرہ دن پہلے پہلے والے بنگلے پر پولیس نے دن دھاڑے چھاپے مار کر مشات کا بہت بڑا ذخیرہ برآمد کیا تھا جو غیر ملکی مال کو سمجھا جا رہا تھا وہ اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوگا۔ کیونکہ اس پھانسی کے بعد محلے میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ اس محلے کے کسی شخص نے پولیس کو اطلاع دی تھی کہ اس بنگلے میں مشات کا ذخیرہ دافتر مقدار میں موجود ہے۔ وہ شخص محلے کا چوکیدار راجو ہے جب کہ اس نے اس افواہ کی بڑی سختی سے تردید کی تھی۔ وہ حیران تھا کہ یہ افواہ کیسے پھیلی جب کہ اس نے پولیس کو پہلی فون کسی دوسرے علاقے سے کیا تھا۔ اس کا ذکر اپنے کسی ملنے والے حتیٰ کہ گھر والوں سے تک نہیں کیا تھا۔ کیونکہ افشاںے راز کا

بھولے سے بھی یاد نہیں کرتے۔۔۔ تم اسے ہر وقت یاد کرتے رہتے ہو۔ مگر تمہیں اس سے تنگ دست بنا کر رکھا ہوا ہے۔ کیا یہ اس کی انصافی نہیں ہے۔“ شاید اس میں اس کی کوئی مصلحت ہو اور اس حال میں میری کوئی بہتری پوشیدہ ہو۔“

”تم جہالت کی باتیں کر رہے ہو۔“ جشید احمد نے اس سے کہا۔ ”خدا انسان کو اپنا مستقبل اور زندگی کا بنانا کا ایک سوچ دیتا ہے جو قوت کی قدر کرتے ہیں وہ اپنی زندگی بناتے ہیں۔ تم بھی بنا سکتے ہو تمہیں بنانا ہوگا۔ اپنے لئے نہیں اپنے گمراہ لوگوں کے لئے ہم جو ان لوگوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کے باپ ہو۔ کل خدا خواست مرچاؤ کے تو تمہاری لڑکیاں اور بچے کیا کریں گے؟“ پھر اس نے دنیا کے نشیب و فراز پر ایک لمبا سچر پایا۔ اسے بھیاک مستقبل سے ڈرایا اس نے راجو کے بشر سے سے محسوس کیا کہ وہ کی قدر پریشان اور خوفزدہ ہو گیا ہے۔ جب جشید احمد نے دیکھا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے تب ایک زوردار ضرب لگائی پھر اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے اپنا منصوبہ بتایا جو وہ جانے کب سے بنایا تھا۔

راجو ایک انمحنس ہوا کہ فضا میں ایک زبردست دھماکا ہوا ہوا اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ پھر اسے ایسا لگا کہ جشید احمد انسان نہیں شیطاں ہے۔ راجو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ چند لمحوں کے کسی ہی حالت میں رہا۔ اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ جشید احمد نے اسے ہلکے پا کر پوچھا۔ ”کیا سوچتے تھے؟ کیا میرا منصوبہ پسند نہیں آیا؟ اچھی طرح سوچ کر دیکھو یہ منصوبہ تمہیں راتوں رات دولت مند بنا سکتا ہے۔“

”مگر جناب!“ راجو چلتے ہوئے اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔ ”آپ جو چاہتے ہیں وہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تم جاؤ تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کی جتنی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”ذرا آپ یہ تو سوچئے کہ میں ایک چوکیدار ہوں جو رات بھر گشت لگا کر جگہ گھر چلا جاتا ہے مجھے کیا معلوم کہ کون کیا ہے؟ کیا کرتا پھرتا ہے۔ اس کے دھندے کیا ہیں؟“

”تم مجھ سے چپارہ ہے ہو؟“ جشید احمد کا لہجہ بیک یک تند ہو گیا۔ ”مجھ سے کوئی بات چمپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے علم ہے کہ تم اس علاقے میں دس برس ڈیوٹی دے رہے ہو اور ایک ایک گھر کے بارے میں پوری طرح واقف رکھتے ہو کس گھر میں کون رہتا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے؟ رات کے اندھیرے میں کیسے کیسے گورکھ دھندے ہوتے ہیں۔“

”مگر صاحب جی، وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”اس محلے میں تو سب ہی معزز شہری رہتے ہیں۔ وہ سب کے سب شرفا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پھر دولت مند الگ ہیں۔ انہیں کیا ضرورت پڑی کہ گورکھ دھندے کریں۔ آپ کو شاید غلطی ہوئی ہو۔“

”جو لوگ ایمانداری اور محنت سے دولت مند بننے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ بھی راتوں رات دولت مند نہیں بن سکتے۔“ جشید احمد نے بلند آواز میں کہا۔ ”ایسے لوگوں کو بڑا آدمی بننے میں میں پچیس برس کا عرصہ لگتا ہے۔ مگر یہاں جو اکثر لوگ بے ہوئے ہیں وہ راتوں رات باہر بنے ہیں۔ لوگ کس طرح اچانک امیر بن جاتے ہیں یہ تم بھی جانتے ہو گے؟“

”میں نے تو سنا ہے کہ لوگ کالہ بیل دھندا کر کے ایک ہی رات میں دولت مند بن جاتے ہیں۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ ان لوگوں میں سے کون کس طرح بڑا آدمی بنایا؟“

”اس محلے میں رہنے والوں میں سے کوئی بھی سیدھے راستے سے دولت مند نہیں بناتا ہے۔“ جشید احمد نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ٹوٹا جو تے سے مسل دیا۔ ”انہیں سبق دینا ایک نیا کام ہوگا۔ اس کام سے خدا بھی خوش ہوگا۔ ثواب بھی ملے گا۔“

”مگر انہیں سبق کیسے دیا جاسکتا ہے ان پر ہاتھ

الہا آسان نہیں ہوگا۔ اس لئے بڑے لوگ بہت بار سوخ ہوتے ہیں۔“

”میں نے تمہیں ابھی تو اپنا منصوبہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کو اپنا غلام بنانا ہے جو کوئی شخص غلام بن جاتا ہے تو وہ کسی کسے کی مانند اشاروں پر چلتا ہے۔“

”مگر انہیں غلام کیسے بنایا جاسکتا ہے؟“ راجو نے اپنی پلکیں چپکی گئیں۔ ”وہ ہمارے غلام کیوں بننے لگے۔“

”ان بڑے آدمیوں کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہمارے ہاتھ لگ گئی تو وہ سدا کے لئے ہمارے غلام بنے رہیں گے۔ ان لوگوں کی کمزوری ہی سے فائدہ اٹھا کر ہم بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔“

”کیا کسی کی کمزوری فائدہ پہنچاتی ہے؟“

”سیاہ کاروں کی بعض کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں جو ان کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ کہیں کے نہیں رہتے ہیں۔ پھر ان کا ٹھکانہ جنیل ہوتا ہے۔ ہمیں ایسی کمزوریاں کا پتا چلانا ہے۔ تم ان کمزوریوں کا پتا چلا سکتے ہو؟“

”کون میں؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ ”میں ان لوگوں کی کمزوریاں کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟ جب کہ ان لوگوں سے میرا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔“

”ان لوگوں کی کمزوریوں کا پتا چلانے کی تدبیر مجھے معلوم ہے۔“ جشید احمد جتنی تیز انداز میں مسکرایا۔ ”میں تمہیں ایک انتہائی قیمتی اور شاندار قسم کا کیمرو ویڈیو دوں گا۔ تم اس کیمرو سے ان لوگوں کی تصویریں اتارو گے جو رات کے اندھیرے میں غیر قانونی اور سانحہ دکن سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کیمرو کی خوبی ہے کہ وہ ہلکی سے ہلکی روشنی میں بڑی صاف اور واضح تصویریں کھینچتا ہے۔ بڑا لا جواب کیمرو ہے۔“

”آپ ان تصویروں کا کیا کریں گے؟ کیا ان پولیس کے حوالے کریں گے؟“

”پولیس کے حوالے کرنے حماقت کبھی نہیں کروں گا۔ اپنے پاس رکھوں گا۔ یہی تصویریں تو ان

لوگوں کو غلام بنائیں گی۔“

”تو کیا ان تصویروں سے ان لوگوں کو بلیک میل کر سگے؟“

”بھئی تم میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور سمجھدار نکلے۔“ وہ جھپکی ہنسی چٹا۔ ”ایسے لوگوں کو بلیک میل کرنا ثواب کا کام ہے جو پورے معاشرے کو بگاڑ رہے ہیں۔“

”مگر جناب! مجھے تو یہ کام بڑا ہی خطرناک اور مشکل نظر آ رہا ہے۔ میں ان لوگوں کی تصویریں کہاں اور کیسے اتاروں؟“

”تم اس محلے کے ہر گھر کے محل وقوع سے خوب واقف ہو۔ لہذا کسی بھی گھر میں آسانی سے اتر سکتے ہو۔ کسی بھی مناسب جگہ کھڑے ہو کر تصویر کھینچ سکتے ہو۔ یہ کیمرو پردے اور شیشہ یار کی ایسی تصویریں اتار سکتا ہے جو انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے یہ سمجھو یہ کیمرو نہیں بلکہ انسانی آنکھیں ہیں۔ میں تمہیں چند لمحوں میں سمجھا دوں گا کہ نزدیک اور دور کی تصویریں کس طرح کھینچی جاتی ہیں۔“

پھر جشید احمد نے اپنی جیب سے سگریٹ کیس ساڑ کا ایک کیمرو نکالا جو کیس کی مانند نظر آ رہا تھا۔ راجو نے بڑی حیرت سے اس کیمرو کو دیکھا۔ جشید احمد نے پانچ سات منٹ میں اس کیمرو کے استعمال کرنے کا طریقہ سمجھا دیا جن کو وہ اچھی طرح سمجھ گیا تو جشید احمد اس کی ذہانت سے خوش ہو گیا۔

”جناب! نامعلوم کیوں مجھے اس کام کے تصور سے خوف آ رہا ہے۔“ راجو کا لہجہ مرعش تھا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں؟“

”اگر اس طرح ڈر دے تو پھر جتنی نہ سو گے اور نہ ہی بڑے آدمی بن سکو گے۔“ جشید احمد نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”اس کیمرو میں جو فلم رول ہے وہ بیس تصویروں کا ہے۔ ان بیس تصویروں کے عوض میں تمہیں چوتھہ ہزار دوں گا۔ کتنے دول گا! پورے چوتھہ ہزار روپے، بلکہ اس میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر کے بیسٹھ کر دوں گا۔ اب تو خوش ہونا؟“

سنے کون نہیں دیکھتا۔ سننے تو سبھی دیکھتے ہیں۔ اس لئے بہت سے لوگ پہنوں جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی زندگی کو دیکھتے ہوئے راجو نے سننے دیکھے تھے۔ یہ بہت دنوں کی بات تھی۔ پھر اس نے سننے دیکھنے چھوڑ دیئے تھے۔ اس نے سچ حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس کا باپ بھی چوکیدار تھا۔ اس لئے وہ بھی چوکیدار بنے گا اور ایک دن اسے باپ کی طرح چوکیدار بن گیا۔ لیکن وہ اپنے باپ کی طرح خدا سے شاک نہیں تھا۔ اسے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ تھا کہ زندگی کسی موڑ پر آکر ایک دم بدل جائے گی۔ اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ پینتالیس برس کا ہو گیا۔ خدا نے اس کی سنی سگر آج اچانک اور غیر متوقع طور پر اس کی زندگی میں ایک لحد ہوا کے کسی خوش گوار کھوجنے کی طرح آیا تھا۔ اس نے ایک بار سوچا بھی تھا کیا وہ اسی لئے کا انتظار کر رہا تھا۔ گھر کی جانب تیزی جاتے ہوئے اس کا دماغ سنسنار ہوا تھا، طرح طرح کے خیالوں کی ایک پورش تھی جن کے آگے اس کے خیر نہیں رہے تھے۔ پھر وہ ایک دورا پر پرکھڑا ہو گیا تھا۔ ایک طرف بدی تھی جو اسے سب کچھ دینے کے لئے تیار تھی جس کے لئے آج تک انسان ترستا ہے۔ دوسری طرف نیکی تھی جو عاقبت میں جڑا دینے کا وعدہ کر رہی تھی۔ بات عاقبت کی نہ تھی اس دنیا کی تھی۔ یہ دنیا جو کسی جہنم سے کم نہ تھی اور پھر اس دنیا میں سب بڑا عذاب احساس محرومی تھا۔ تنگ دینی اور غربت سے بڑھ کر انسان کے لئے کوئی سزا نہ تھی۔

اس نے دوسرے لمبے اپنے ذہن سے عاقبت کا خیال بھٹک دیا۔ خدا کا خوف، انسان کا فرض، نیکی کا تصور، قاعدت اور توکل۔ اب سب اس کے لئے بے معنی ہو گئے تھے۔ سب پیچھے رہ گئے تھے۔ اس نے زندگی کے دوسرے راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایک انتخاب راستہ آیا تھا۔ وہ اسی راستے پر چلنا چاہتا تھا۔ اسے نہ راستہ بھولنے کا ڈر تھا اور نہ لوٹنے کی فکر۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی

جیب میں کیرہ نہیں ہے بلکہ جینٹل ہزار روپے ہیں پھر وہ تصور میں کھو گیا۔ اس تصور میں کچھ کر اس بے رحم دنیا کو بھول گیا جس میں بھی اسے راحت نہیں ملتی تھی۔ سکھ نہیں ملا تھا۔ اب وہ اس دنیا کی سیر کر رہا تھا جو بہت خوبصورت تھی اس میں راتیں اور آسائشیں تھیں۔ یہاں کوئی دکھ، غم اور کرب نہ تھا، آذیت نہ تھی، جہنم نہ تھا، یہ دنیا جنت جیسی تھی۔ اس کا دل عجیب سا سرور محسوس ہو رہا تھا۔

جب اس نے اپنے دروازے پر دستک دی تو اس کی بڑی بیٹی جیلہ نے دروازہ کھولا تھا۔ سفید دوپٹے کی محراب میں ایک حسین سا چہرہ ادا تھا۔ بہت ہی اداس۔ ایسی ہی اداسی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چھا چک رہی تھی۔ وہ غم و کرب کی تصویر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جیلہ اپنی اداس کیوں ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا رشتہ ایسی جگہ لے ہو رہا تھا جو اس کے سوا کسی کو پسند نہ تھا لڑکا موچی تھا، موچی کا بیٹا تھا، لڑکا کی شہر شاہ میں بہت چھوٹی سی دکان تھی۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا، اپنی بیٹی کا رشتہ وہاں کرنے کے لئے یہ سوچ رہا تھا کہ لڑکے کا کوئی مطالبہ نہ تھا۔ نہ جوڑے کا نہ کچھ چیز کا۔ اس کی بیٹی کے لئے اچھے رشتے بھی آئے تھے مگر وہ منہ کھول کر انعام تک رہے تھے کہ جی ان کا کوئی مطالبہ پورا نہ کر سکتا تھا۔ جیلہ نے وہ لڑکے کے پاس سے ہٹ کر اسے اندر کا راستہ دیا اور اس نے اندر داخل ہوتے ہی بیٹی کے سر پر اپنی چھتی سی نظر ڈالی، چل بسا نے دل میں سوچا وہ اس موچی کے لڑکے کے بیٹی کا رشتہ لے نہیں کرے گا بلکہ اپنی جگہ بیٹی کا رشتہ لے کر دے گا۔ اب اس کے پاس لڑکے والوں کا مطالبہ پورے کرنے کے لئے رقم جو ہوگی۔

پھر اس نے گھر میں داخل ہو کر اپنے بوڑھے بیمار اور لاغر باپ کو دیکھا جو نیند کی گولی کھا کر سو رہا تھا۔ جو برسوں سے بیمار تھا۔ سرکاری اسپتال کے علاج سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا بلکہ بیماری میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ موت قریب

ہوتے ہوئے بھی دھڑکی۔ اسے جیسے ترسا ترسا کر مارنا چاہتی ہو۔ وہ اپنے باپ کا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے کروانے کے بارے میں سوچ کر رہا تھا۔ اس کے پاس فیس کی رقم ہی جمع نہیں پائی تھی۔ فیس کے بعد بھی دواؤں کا تصور بھی تو بڑا دھشت ناک تھا، وہ اتنی مہنگی دواں میں کیسے خریدتا؟ وہ باپ کے بستر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باپ کو دل میں مخاطب کر کے کہا۔ ”تم نے جہاں اتنے برس دکھ درد اور تکلیف سہی ہے وہاں چند دن اور سہ لو۔ میں تمہیں جلد ہی ماہر ڈاکٹر کو کھدائوں گا۔ اچھا علاج کراؤں گا۔ کسی اچھے اسپتال میں داخل کراؤں گا۔“

راجوئن میں آیا تو ٹھک کر رہ گیا۔ باورچی خانہ میں ایک گول مٹول اور بھر دی سی عورت روٹی پکارتی تھی۔ جس کے چہرے اور جسم میں اب کوئی حسن اور جھلک نہیں رہی تھی۔ جو بچوں کو رکھا ہوئی تھی۔ وقت اس نے اس کا چہرہ بھٹا دیا تھا۔ یہ اس کی بیوی تھی۔ بیس برس پہلے وہ چیلہ کی طرح تھی۔ آج جیلہ اپنی ماں کی جوانی کا عکس تھی۔ بچے کیا ہوئے انہوں نے اس کے عورت کے حسن اور فرش کو چھین لیا تھا۔ وہ باورچی خانہ میں بچوں سے اچھے رہی تھی۔ کسی کو مار رہی تھی تو کسی کو ڈانٹ رہی تھی۔ بچے روٹی کے لئے خند کر رہے تھے۔ جیسے دو وقت کے قافے سے ہونے ملے چلے لباس میں یہ بچے فقیروں کے بچوں سے بھی گئے ناز رہے تھے۔

وہ روز ہی کوٹھی اور بنگلوں میں رہنے والوں کے ان بچوں کو دیکھتا تھا جو گاڑیوں اور اسکولوں کی بسوں میں بڑھنے اسکول جاتے تھے۔ ان کے جیسوں میں صاف ستھرے لباس ہوتے تھے۔ وہ ثقافت اور تروتازہ پھولوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ منہ پٹے ہوئے محسوس ہوتے تھے، وہ باوجود کوشش کے اپنے کسی بچے کو اسکول میں بڑھا نہیں سکتا تھا، سرکاری اسکولوں میں تعلیم مفت تھی لیکن کتابوں کا پیوں کی خریداری اس کے بس میں نہ تھی۔ اس کے دل میں بڑی حسرت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بڑھا لکھا کر ایک

اچھا انسان بنائے۔ وہ بھی اس کی طرح چوکیدار نہ کرتے پھیریں۔ مگر وہ اپنی کوئی خواہش پوری نہ کر سکتا تھا وہ یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ اگر اس کے بچوں کو چوکیدار بننا ہے اور لڑکیوں کو کسی موچی یا بس کنڈیکٹر، یا ڈرائیور کی بیوی ہونا ہے تو قدرت کے اس فیصلے کے آگے وہ کیا کر سکتا ہے۔

مخرومیں کی ایک لمبی داستان تھی۔ بچے کبھی اس سے آنکرم اور جا کلپٹ کی فرمائش کرتے تو کبھی ان کھلونوں کے لئے چل جاتے جو دکھانوں اور بوڑے گھرانوں کے بچوں کے ہاتھوں میں نظر آتے تھے۔ اگر صرف ایک بچہ ہوتا تو وہ اس کی فرمائش پوری کر دیتا۔ پانچ بچوں کو آنکرم کھانا اس کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔ کھلونے اتنے سستے نہ تھے پھر یہ بچے سستے کھلونوں سے بھرتے نہ تھے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہیں بیٹھا ہوا ہے، کوئی دوست پر تکلف کھانا منگواتا تو گھر والوں کے چہرے اس تصور میں گھوم جاتے تھے۔ پھر نوالے اس کے حلق میں اٹکتے گلتے تھے۔ وہ چند لمحوں سے زیادہ کھا نہیں سکتا تھا۔ دل میں سرور بھر کر رہا تھا۔

بچے اس سے پوچھتے تھے۔ ”ہم لوگ اتنے چھوٹے سے گھر میں کیوں رہتے ہیں۔ آپ بڑا گھر کیوں نہیں خرید لیتے؟“

”کوئیوں اور بنگلوں میں رہنے والے بچے کتنے اچھے اچھے کپڑے پہن کر نکلے ہیں؟“ ہمارے لئے ایسے کپڑے کیوں نہیں ملواتے ہیں؟“ ”آپ ہمیں اسکول بڑھنے کے لئے کیوں نہیں بھیجتے۔ ہمیں بھی اسکول کے کپڑے اور کتابیں لے کر دیں اور اسکول میں داخل کرا میں؟“

وہ انہیں مال دیتا تھا تین لڑکیاں جوان ہو چکی تھیں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سینے پر چٹائیں رکھ دی گئیں ہوں۔ ان چٹائوں کے پوچھ کے احساس سے بھی کبھی اس کا دم سینے میں گھٹنے لگتا تھا۔ لڑکیاں بڑی بھجھداری تھیں۔ ان کی آنکھوں میں درد، صبر اور احساس جھماک رہا تھا۔ گودہ

اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں جو ملا کھالیا اپنے گڑلوں میں بیوند لگا کر اس کا بوجھ جیسے ہلکا کر دیتی تھیں۔ اس لئے کہ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ باپ کی کمائی اور گھر کا خرچ کیا ہے؟ مگر وہ سمجھتا تھا کہ ان کے سینوں میں کیسے کیسے ارمان لاواہن کر رکھ رہے ہیں مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ بیوی تو شادی کے بعد ہی برس تک کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کرتی رہی تھی۔ اب تو وہ جیسے انعامی بہری گولی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے چند برس سے گھٹیا کا مرض تھا وہ گھٹیا کا درد سیسے کی تھی مگر اس سے دوا کی اور علاج کے لئے نہیں کہتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے زندگی کا ٹر رہی تھی۔ بچے کچھ کہتے تو ان سنی کر جاتی تھی۔ اس نے بھی شکایت نہیں کی کہ یہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی زبان سے احتجاج کا ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔ بس وہ اپنے پیار ساس، سر، شوہر اور بچوں کی خدمت کرتی جا رہی تھی۔ ایک بیشین کی طرح، اس پر بے زبان جانور کا گمان ہوتا تھا جیسی تھی۔

راجو نے اپنی جیب میں رکھے ہوئے کبیرے کو تھپتھپایا۔ اسے لگا کہ اس گھر اور اس کی زندگی پر جو بادل چھائے ہوئے ہیں وہ ایک ایک کر کے چھٹتے جا رہے ہیں۔ جلد ہی سارے بادل چھٹ جائیں گے۔ پھر روٹی ہوگی ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔ ان سب کو ایک نئی زندگی ملے گی۔ ایک نئی صبح سے ان سب کی زندگی کا آغاز ہوگا۔

رات دس بج رہے تھے۔ وہ فخر الزماں کے بنگلے میں عقب میں بیٹھ کر کڑکا۔ اس نے فخر الزماں کے بارے میں سنا ہوا تھا۔ بظاہر تو اس کے کارخانے ہیں اور شہر کے بارون علاقوں میں چیلری کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ مگر وہ بہت بڑا امیر ہے۔ سونا اکٹھا کرتا ہے۔ اسے ہیرے جواہرات کے کاروبار کا بادشاہ کہا جاتا ہے پھر وہ بے پناہ دولت مند تھا۔ اس نے اپنی کی شادی کے موقع پر اپنے علاقے کی تمام خوشیاں اپنے خرچ پر سجا کر ان تمام گھروالوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کیا تھا۔ ہر کوئی کی سجاوٹ پر دس ہزار کا خرچ آیا تھا اپنی لڑکی کی شادی ایک اعلیٰ

درجے کے ہوٹل میں کی تھی صرف مہمانوں کو کھانا کھلانے پر پانچ لاکھ کا خرچ آیا تھا۔ لڑکی کے چیمبر پر پچاس لاکھ کی ایک گولی اور دو کپڑے دی تھیں۔ پیرے جواہرات اور دوسری چیزیں لاکھوں روپے کی تھیں۔ راجو نے سوچا جو پیر پانی کی طرح بہاتے ہیں وہ پیرہ ختم سے کیا ہوا نہیں ہوتا۔ فخر الزماں کے پاس بھی کالے دھندے کا روپیہ ہے۔ وہ آج بھی کالا دھندہ ہی کرتا ہوگا۔ شاید مجھے اس بنگلے سے کوئی تصویر کھینچنے کا موقع مل جائے جو جیسا اچھے کے مطلب کی ہو۔ اس نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اچول پر قبرستان جیسا سناٹا طاری تھا اسے دیوار پر چڑھ کر اندر اترنے میں صرف پانچ منٹ لگے۔ بنگلے کا احاطہ اور برآمدہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بنگلے کے اطراف میں بھی تاریکی تھی۔ صرف ایک کمرے میں روشنی اور کچھ چمچے نظر آرہے تھے۔ اس کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کمرے کی کھڑکی سے دو کمرے کا قافلہ چلنے پر درخت تھا۔ یہ درخت اس کے لئے آڑ کا کام دے گا۔ وہ دبے قدموں اس درخت کی آڑ میں جا کھڑا ہوا تو اس کے کانوں میں سسکیوں کی آوازیں گونجیں۔ وہ ایک دم سے چونکا جیسے اسے اپنی ساعت پر فوراً کا احساس ہوا ہو۔ اس گھر میں سسکیوں کا کیا کام۔ یہاں کی فضا میں تو کسی چیز کا گرجا نہیں ہے۔ یہ لوگ رونا کہاں جانتے ہیں۔ رونا تو بچوں کا مقدر ہے۔ پھر اس کے کانوں کے پردوں میں سسکیاں گونجیں۔ اس نے چونک کر کھڑکی سے اندر بھاٹکا۔ پانچ پر فخر الزماں کسی بے جان لاش کی طرح پڑے تھے۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ان کی بیوی، ایک لڑکی اور ایک لڑکا پانچ کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نرس چہرہ ہانے کھڑی تھی۔ بیوی رو رہی تھی۔ لڑکی بے حد ممکن نظر آرہی تھی۔ لڑکا گم میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیوی نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔ "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" بچ بچ بتاؤ مجھ سے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

لڑکی ہلکتی ہوئی بولی۔ "مئی ڈاکٹر نے آج ہی صاف صاف جواب دے دیا ہے کہ اب ڈیڈی کا علاج ممکن نہیں رہا ہے۔ میڈیکل بورڈ کا بھی یہی فیصلہ ہے۔"

"مگر مجھے ڈاکٹر ڈاکٹر اللہ نے کہا تھا کہ آپ فکر نہ کریں۔ ہم اپنی پوری توجہ سے صرف ان کا علاج کر رہے ہیں۔ وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔" ان کی آواز بھرا آئی۔

"ڈاکٹر نے آپ کو بہت ممکن بہت پریشان دیکھ کر تسلی دینے کی غرض سے کہا تھا۔ میں میڈیکل بورڈ کی رپورٹ لے کر آیا ہوں۔ آپ اسے دیکھ لیں۔" لڑکا بولا۔

"میں کسی رپورٹ کو نہیں مانتی ہوں۔" وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ "علاج ممکن کیوں نہیں ہے۔ میں انہیں یورپ لے جا کر علاج کراؤں گی۔ وہاں تمہارے باپ کا علاج بہت اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر اور اسپتال موجود ہیں۔ ان کے علاج سے تمہارا فائدہ ہوگا۔"

"مجھے آپ کی بات سے پورا اتفاق ہے مئی۔" لڑکے نے ان کی تائید کی۔ "میں نے ڈاکٹروں سے یہ بھی کچھ کہا تو وہ بولے۔ اگر آپ اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں تو آپ یورپ جا کر علاج کروائیں۔ اس طرح آپ اپنا پیسہ اور وقت برباد کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو غریب بھی دیں گے۔"

"میں اپنے شوہر کی زندگی بچانے کے لئے وقت اور پیسہ برباد کرنے کے لئے تیار ہوں۔" وہ تیز لہجے میں بولیں۔ "آخر یہ بے پناہ دولت کس روز کام آئے گی۔ اس کا اصل حقدار کون ہے؟ تمہارا باپ جس نے رات دن ایک کر کے کمایا ہو کیا میں اس کی ذات پر اس کا کمایا ہوا روپیہ خرچ نہیں کروں؟ میں جلدی اپنے شوہر کو یورپ لے جاؤں گی۔"

"کیا ہمیں اپنے باپ کی زندگی عزیز نہیں ہے؟" لڑکے نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

"پھر تو وقت اور پیسے کی بربادی ذکر میرے

سامنے کس لئے کر رہے ہو؟" ماں نے تنک کر جواب دیا۔ "یہ باپ کی باتیں کیوں ستارے ہو مجھے؟"

"مئی آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔" بیٹی نے ماں کے قریب جا کر کہا۔ "ڈیڈی ایک مرض سے تو نہیں، انہیں شوگر ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، دل کی شکایت ہے، گردے کی تکلیف، دہہ اور پیسہ دے کا کینسر بھی ہے۔ انہیں اتنی ساری بیماریاں لاحق ہو گئی ہیں۔ آخر کس کس کا علاج کیا جائے؟ اگر ہماری دولت بھی علاج پر خرچ کر دیں تو وہ صحت یاب نہیں ہوں گے۔ ہر دوا کچھ بیکار ہو گئی ہے۔"

"تو کیا میں انہیں مرنے کے لئے چھوڑ دوں ان کا علاج نہیں کراؤں؟ اور تو یہی ہو کر اپنے باپ کے بارے میں ناامیدی کی باتیں کر رہی ہو؟" وہ برس پڑیں۔

"ہم ڈیڈی کا علاج کرائیں گے مئی! ان کا علاج یہاں بھی ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں سسکیوں کو دکھائیں گے۔" لڑکے نے تسلی دی۔

"اب علاج کے ساتھ انہیں دعا کی ضرورت ہے۔" نرس بولی "میں نے دیکھا ہے جب دوا کام چھوڑ دیتی ہے تو پھر دعا اپنا اثر دکھاتی ہے۔ آپ لوگ بھی دعا کریں۔ خدا کے حضور گڑگڑائیں۔ جہاں دوا اور دولت کام نہیں آتی ہے وہاں صرف دعا کام آتی ہے۔"

"دعا۔" وہ تھکی سے مسکرائیں۔ "میں اپنی ہی دعاؤں کی سزا بھگت رہی ہوں نرس! جب ہم نئی کراچی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے تنگ دینی تو کسی مگر ایسی ہی فاقے نہیں ہو رہے تھے بس گزر جاتی تھی۔ میں، بچے اور اور شوہر صحت کی دولت سے مالا مال تھے۔ انہیں کوئی بیماری نہیں تھی روٹی سوکھی کھاتے تھے۔ سادگی اور قناعت کی زندگی ہر بیماری کو گھٹ لیتی ہے۔ ہم لوگ شاذ و نادر ہی بیمار پڑتے تھے۔ دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی دیکھ کر اور دوسروں کے گھروں کے جھانک کر خدا سے شکوہ کرتی، مگر کڑا دعا مانگتی کہ اسے ختم نہیں اس جہنم

برداشت

ایک عورت اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ قانونی مشورے کے لیے ایک وکیل کے پاس پہنچی۔ اس نے وکیل کو اپنے خاوند کے ظلم و ستم کی ایک دردناک داستان سنائی۔ بیان میں اتنی شدت تھی کہ وکیل بھی جذباتی ہو گیا اور بولا۔

”معلوم ہوتا ہے تمہارا شوہر انسان نہیں درندہ ہے۔“ یہ سننے ہی عورت آگ بگولا ہو کر بولی۔

”میں یہاں قانونی مشورے کے لیے آئی تھی۔ اپنے خاوند کے خلاف ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔“

☆

بیٹا: ”میں حیران ہوں کہ میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں یا کانوں کا۔“

باپ: میرے خیال میں دانتوں کی ڈاکٹری بہتر ہے کیونکہ ہر شخص کے دانت نہیں ہوتے ہیں اور کان صرف دو۔“

نمایاں ہے۔ یہ ایک اور تصویر ہے جس میں وہ کار پیچھے کر رہا ہے اور اس تصویر میں وہ کار لے کر فرار ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اس لڑکے کو بالکل خبر نہیں ہو سکی کہ اس کی تصویریں کوئی دھڑا دھڑا تار رہا ہے۔ میں نے ایسی جگہ چھپ کر یہ تصویریں اتاری ہیں کہ اس کے فرشتوں کی خبر نہیں ہوئی ہوگی۔ اب یہ مجرم لڑکا قانون کے ہاتھوں سے جک نہیں سکتا۔ ہر تصویر اس لڑکے کے جرم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس لڑکے کے نشے نے ایک غریب آدمی کی جان لے لی ہے۔ اس خاندان کے کندھوں پر دس افراد کی کفالت کا بوجھ تھا۔ اس غریب کے گھر پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی۔ کیا معلوم اس کے بیوی بچے قاتل کر رہے ہوں۔“

راجو نے محسوس کیا کہ اس کی جذباتی سن کر

دیکھئے تاش کے تے اور سو کے ٹوٹ اور ان کے نمبر کس قدر صاف نظر آ رہے ہیں پھر یہ شراب کی بوتل ہے۔ بوتل پر جو لیبل چپکا ہے اس کا نام بھی صاف پڑھا جا رہا ہے اور گلاسوں میں جو شراب بھری ہوئی ان لوگوں کے سامنے رکھی ہے اس کا رنگ بھی کتنا واضح ہے۔ دوسری تصویر میں یکم صاحب نے گلاس منہ سے لگایا ہوا ہے۔ تیسری تصویر میں وہ میز پر سے ٹوٹ سمیٹ رہی ہیں۔ جیسے انہوں نے بازی جیت لی ہے۔“ اس نے دوسری اور تیسری تصویر کو بڑھا دیا۔

جسید احمد نے دونوں تصویریں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور انہیں دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر زردی سی چھائی اس کی آنکھیں پٹی پٹی ہو گئیں تو راجو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ان تصویروں کے ان سب کے چہرے کس قدر واضح ہیں، چہرے وہ لوگ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں۔ اچھا اب یہ تصویریں دیکھئے میرے لڑکے کا کمال، سرخ رنگ کی ٹوپی کا کس قدر تیزی سے آئی دکھائی دے رہی ہے اور چلانے والے کا چہرہ کس قدر صاف ہے۔ ایک نوجوان لڑکا اس کا رو چلاتا آ رہا تھا میں نے اسے کار کی رفتار دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ کوئی شراب پی کر چلا رہا ہے۔ کیونکہ کار بھی دائیں جا رہی تھی، بائیں بھی فٹ ہاتھ پر چڑھ رہی ہے تو بھی سڑک کے کنارے کنارے، سانپ کی طرح لہرائی تل کھائی اور بڑی تیز رفتاری سے آ رہی ہے۔ رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ دن ہوتا تو ایک سیٹ فٹ ہو چکا ہوتا۔ میں نے کیرہ سنبھال لیا۔ اس لڑکے اور کار کی بہت ساری تصویریں لینا پڑیں۔ یہ دیکھئے اس تصویر سے صاف پتا چل رہا ہے کہ لڑکا نشے میں دھت ہے اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ اس تصویر میں ایک سیٹ فٹ کا منظر کس قدر صاف نظر آ رہا ہے۔ ایک راہ گیر کار کے پیچھے کے نیچے پکڑا ہوا ہے۔ یہ راہ گیر سیٹھ بٹھرا ہوا تھا۔ اس خاندان کا اس تصویر میں کار، اس کی نمبر پلیٹ پر لکھے نمبر اور کار چلانے والے کا چہرہ

نان سنس۔“

”ہم بھی کو یہ کیوں نہ بتا دیں کہ ڈیڑی کی زندگی..... بھائی نے پوچھا۔“

”ڈونٹ کی سکی۔“ بہن بولی ”یہ دیکھو۔“

ڈیڑی کی سانسیں اکھڑ رہی ہیں۔ میں جا کر نرس اور می کو بلا لائی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

راجو کوئی پندرہ دن کے بعد جسید احمد کی کوشی پر پہنچا۔ جسید احمد اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ”تم نے بہت دن لگا دیے؟“

”آپ نے میرے ڈسے کچھ کام ہی ایسا سوچنا تھا“ اس میں دیر تو لگی تھی۔“ راجو نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں یہ بڑا اچھا کام ہے۔“ جسید احمد نے ملازمین کے سامنے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا اور بڑی بے تابانی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے تصویریں اتاریں؟“

”جی ہاں جناب۔“ راجو نے جواب دیا۔

کمرے کا کافی جواب نہیں ہے۔ بڑا لا جواب ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے کمرے کا ذکر نہیں سنا تھا۔ میں نے جو چند تصویریں اتاری ہیں واقعی وہ بڑی صاف اور واضح آئی ہیں۔ دور سے لی ہوئی تصویریں ہوں یا کھڑکی کے پردے یا شیشے کے پار اتاری ہوئی تصویر ہوں اس میں میرے ہر ایک کا چہرہ اور خود خال پوری طرح واضح کر دیے ہیں۔ یہ کیرہ انسانی آنکھ سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر ہے۔“

”اس کا اندازہ تمہیں کیسے ہوا؟ کیا تم نے تصویریں اتار کر قلم دھلائی ہے؟“ جسید احمد نے حیرت سے تیز لہجے میں پوچھا۔

”جی جناب۔“ راجو گردن ہلاتے ہوئے جب سے ایک پھولا ہوا لفاظہ نکالا۔ ”یہ تصویریں دیکھئے جناب! میری پہلی کوشش۔“ اس نے لفافے سے ایک تصویر نکال کر جسید احمد کی طرف بڑھائی۔ ”یہ یکم صاحب چند مردوں اور لڑکیوں کے ساتھ نہ صرف سے ٹوٹی کر رہی ہیں بلکہ جو ابھی ٹھیک رہی ہیں۔ میز پر

اپنے دل میں

عمرین ناز

ایک شخص کی داستان جس کا پیچھا ایک انگریز کر رہا تھا

کی اولاد باپ پر نہ جائے۔ لڑکا کالا ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن لڑکی کالی نہ ہو۔ اسے اس کی بڑی عورت نے مشورہ دیا کہ لڑکی بالڑکا ہو اور وہ یہ چاہتی ہے کہ وہ گوری ہو تو زچلی تک کچا ناریل کھائی رہے۔ اس کی اولاد گوری ہوگی۔ جب دود پیدا ہوا تو اس کی رنگت انگریزوں کی طرح تھی۔ ہندوستان میں بھی مرد اور عورتیں گوری اور چنی ہوئی ہیں۔ وہ گورا پیدا ہوا۔ جب وہ جوان ہوا تو دیکھنے میں بالکل انگریز

ایک شخص کا قصہ، ایک انگریز اس کا تعاقب کر رہا تھا، وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر چکا تو ایک دن اس کے پیچھے پڑ گیا تاکہ یہ جان سکے کہ وہ کون ہے اور اس سے کیا چاہتا ہے.....؟

انگریز تھا، نہ ہی اس کی ماں انگریز تھی۔ نہ ہی اس کا باپ انگریز تھا۔ اور پھر نہ وہ انگلستان میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ کالا تھا جیسے نگرہ ہوتے ہیں۔ البتہ اس کی ماں کی رنگت قدرے اجلی سی تھی۔ جب دود اس کے پیٹ میں پرورش پا رہا تھا، اس کی ماں اس سے بہت متشکر، خوف زدہ اور پریشان تھی کہ اس

میں اتنے زور سے چیخا کہ راجو ایک دم سہم گیا۔ ”تم مجھے بے وقوف بنارہے ہو یا بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں نے تم سے یہ تو نہیں تو کہا تھا کہ تم میرے خاندان کے پیچھے پڑ جاؤ۔“ میرے خاندان کی تصویریں کھینچے پھر۔

”آپ کا خاندان؟“ راجو کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”یہ میرا نہیں تو تمہارے باپ کا خاندان ہے۔“ وہ دباؤا۔ ”جو عورت مردوں اور عورتوں اور ساتھ بیٹھی شراب پی رہی اور جوا کھیل رہی ہے وہ میری بیوی ہے جس لڑکے نے راہ گیر کو چل دیا وہ میرا بیٹا ہے اور وہ کار میری اپنی ہے جو لڑکیاں نشر کر رہی ہیں ان میں میری بیٹی بھی ہے۔ جو ہر دن ایک کر رہی ہیں وہ میری لڑکیاں ہیں جو آج کل یورپ گئی ہوئی ہیں پھر تم نے مجھے بھی نہیں بخشا، ہماری بی بی ہم سے میاؤں.....“

”میں اور کیا کرتا جناب آپ کی بیٹی کی طرح کار کر دے گا۔“ وہ ان کی بی بی کے بارہ دونوں میں سے ایک کوئی قابل اعتراض بات کہیں نظر نہیں آئی۔ ”میں نے آپ کی تصویریں کھینچیں۔“ ”بھئی اتفاق.....“

”بند کرو یہ گواہ..... ذلیل کیسے۔“ وہ گرجا۔

”اس کے ٹیکو کہاں ہیں؟“ ”ٹیکو پولیس کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ انیسٹر صاحب آپ سب کی گرفتاری کے وارنٹ لے کر پہنچنے والے ہیں۔ ویسے جناب آپ کا منصوبہ بڑا شاندار تھا۔ مگر بد قسمتی سے آپ نے غلط آدمی کا انتخاب کیا۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے۔ جو شخص ہر حال میں اللہ توکل ہوتا ہے اسے کسی قیمت پر خرید نہیں جاسکتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے توکل پر بڑی سے بڑی ناجائز دولت کو قربان کر دیتا ہے اور پھر آپ سب تو مجرم ہیں۔ مجرموں کو کبھی گرفتار نہ کر دیتا۔“ راجو نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ انیسٹر اپنے ماتحتوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔

جسید احمد کے چہرے پر ناگواری ابھری ہے اور چہرہ متمرد رہا ہے..... راجو نے لفافے سے ایک اور تصویر نکالی اس کا نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ اس محلے کے لڑکے اور لڑکیاں معلوم ہوتے ہیں اس کے ساتھ یہ دوسری تصویریں اور ہیں۔ یہاں غشیات کا آڈو ہے۔ لڑکے لڑکیاں نشر کر رہے ہیں اور نشے کے انجکشن لگوا رہے ہیں۔ نشر اور سرکینٹ پی رہے ہیں۔ اسی بنگلے کی دیکروں کی تصویریں اور بھی ہیں انہیں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ دیکھئے اس تصویر میں وہ لڑکا بھی نظر آ رہا ہے جس نے وحشیانہ انداز سے کارائیکڈنٹ کر کے خاندان کو کچل دیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس لڑکے کو اس غریب کی موت کا کوئی دکھ رہنما اور احساس ہی نہیں ہے۔ جب ہی وہ کسی بات دل کھول کر قہقہے لگا رہا ہے۔ کتنا خوش دکھائی دیتا ہے کیا جناب ان لوگوں کے پاس ضمیر نام کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ اگر میں اس لڑکے کی جگہ ہوتا تو ایک دن بھی چین و سکون سے نہیں رہ پاتا اور اپنے آپ کو قاتلون کے حوالے کر دیتا۔“

راجو جب لفافے سے تصویریں نکال رہا تھا تب معاس کی نظر جسید احمد کے چہرے پر پڑی۔ اس نے محسوس کیا کہ جسید احمد کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی ابھی خون ٹپک پڑے گا۔ جیسے اسے معاشرے پر سخت غصہ آ رہا ہو اور ان لوگوں کو مزہ چکھانا چاہتا ہو پھر اس نے جلدی سے تین تصویریں نکال کر بڑھادیں۔ ”یہ تصویریں بھی کیلا جواب ہیں ایک تصویر میں آپ آپ کی لڑکیاں مل کر ہر دن چھوٹی چھوٹی تصویریں میں بیک کر کے وزن کر رہی ہیں۔ دوسری تصویر میں آپ اور آپ کی لڑکیاں مل کر سوٹ کپس کے خفیہ حصے میں بیکٹ چھپا رہی ہیں تیسری تصویر میں دونوں لڑکیاں اپنے اپنے پاسپورٹ اور سفری کاغذات کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دو ایسی تصویریں بھی جن.....“

”بھڑا میں گئیں تصویریں۔“ وہ بذیانی انداز



جیسا لگتا تھا۔ رنگت کے لحاظ سے بلکہ خدا کو ال کی وجہ سے بھی، اس کے بالوں کا رنگ بھی انگریزوں جیسا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کی طرح بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھائی تھی۔ اس کی آنکھیں انگریزوں جیسی نہ تھیں۔ اس نے یہ کی کاٹھنکٹ لیس سے پوری کر لی۔ لوگ اسے انگریز سمجھتے اور انجینی لوگ اسے انگریز کہتے تھے۔ وہ بہت خوش ہو جاتا تھا۔

ہندوستان انگریزوں کی غلامی کی غلامی سے نجات حاصل کر چکی تھی لیکن وہ اب بھی اور آج بھی اپنی غلام تھے اور احساس کسری کا شکار تھے۔ انگریزوں نے انگریزوں کی غلامی کو پسند کرتے تھے۔ انگلستان جاکر انگریزوں کی غلامی کر رہے تھے اور ان کی تہذیب کے گردیدہ تھے اور انگریزوں کی طرح رہتا ان کے لئے فخر کی بات تھی۔ جب کوئی انگریز سامنے آتا تو وہ اسے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اس لئے دونوں کو بھی اپنی اس برتری کا پورا پورا احساس تھا اس نے اپنے آپ کو انگریز ثابت کرنے اور سامنے والے پر عجب ڈالنے کے لئے انگریزوں کی بہت ساری عادات بھی اپنائی تھیں۔

مثلاً انگریزوں کی طرح سنجیدہ اور سرحراز کی طرح ہنار تھا۔ وہ دانستہ کم ہو گیا تھا جو بے حد ضروری بھی تھا۔ انجینیوں سے بات کرنے میں بھی پہل نہیں کرتا تھا۔ نکلے داروں سے راہ رسم سے بھی دانستہ گریز کرتا تھا اور زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ انگریزوں کی طرح جیل بھی تھا۔ پانی پانی جیسے دانتوں میں پکڑ کر خرچ کرتا تھا۔

انجین سے واپسی میں ایک جمعات کی شام میرے جن نے پہلی دفعہ اس کی موجودگی کو محسوس کیا۔ یوں تو وہ دراز قد بھی تھا اور اس کا بدن قدرے تناسب تھا۔ اسے ایک نظر دیکھتے ہی دونوں اپنے آپ کو انگریز سمجھتا ہے چوں کہ وہ اپنے چہرے ہمرے اور صاف قلع سے انگریز دکھائی دیتا تھا اس لئے اسے انگریز سمجھ کر دی میں اس کا نام انگریز رکھ لیا تھا۔

ایک طرح سے ان دونوں کا آغاز اس پہلی ملاقات سے ہوا تھا۔ اس طرح کی دوسری ملاقات میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اتوار کی شام کو وہ دوسرے جن کو انجین پر نظر آیا تھا وہ داور کے پل کے آس پاس کہیں رہتا تھا۔ شاید ان فلیٹوں میں جو ابھی نئے تعمیر ہوئے تھے۔

پھر کوئی چھ سات دن کے بعد وہ جن کو ہر جگہ نظر آنے لگا۔ اس انجینی نے صبح آٹھ بجے والی لوکل ٹرین میں اس کے ساتھ میری تک سفر کیا تھا۔ ایک دن دوپہر کو جن کی میز سے ذرا فاصلے والی میز پر کھانا کھایا۔ ایک دو اور اس طرح کی اتفاق اور غیر متوقع ملاقاتوں کے بعد جن نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ ممبئی شہر میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ کسی ایسی آدمی سے ایک ہی ہفتے میں متعدد بار آنا سامنا ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ سب اتفاقات ہیں۔ کہہ کر ان لوگوں کو اہمیت دینا محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

لیکن اتوار کو جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھانا منانے ساحل سمندر پر گئی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کا پیچھا کرتا رہا ہے۔ گھر سے چندہ میں میل دوں وہ لہو انجینی ساحل سمندر پر موجود تھا۔ وہ ان دونوں سے کچھ ہی دور تھی کہ کسی رک کر ماحول سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس انگریز کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے تھیں۔

”روپا!“ جن نے اپنی جتنی سے کہا۔ ”جھگوٹا اس کہنے کا ستیا ناس کرے۔ یہ کجنت یہاں بھی موجود ہے۔“ ”یہ کون ہے۔؟“ اس کی جتنی نے اس انگریز کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہمارا پڑوسی انگریز۔“ جن نے جواب دیا۔ ”وہی جس کے متعلق میں تم سے کہا تھا کہ وہ شیطان کی طرح ہر جگہ نظر آتا ہے۔“ ”اچھا تو وہ یہ ہے۔“ اس کی جتنی روپا نے کہا۔

”اسے ماتھے پر شکن ڈال کر اسے گھورا اور بولی۔“ ”مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اسے پہلے دیکھا ہو۔“ جب کہ آپ کہہ رہے ہیں یہ ہمارا پڑوسی ہے۔“ ”وہ شاید۔۔۔۔۔۔“ جن نے کہا۔ ”ہماری بلڈنگ کی عقب والی بلڈنگ میں رہتا ہے۔ ایک دن میں اسے فلیٹ کی جھپٹلی کھڑکی سے سامنے سامنے والے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑا ہوا بھی دیکھا تھا۔ وہ دوسرے دن ہمارے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آخر یہاں کرنے کیا آیا ہے۔ وہ ضرور ہر جگہ میرا پیچھا کرتا ہے۔ اب میرا شک یقین میں بدل گیا ہے۔“

”آپ کیوں بے وقوفی کی طرح باتیں کرتے ہیں۔“ ”روپا! یک دم سے کھٹکلا کر بس پڑی۔“ ”کیسی آدمی آپ کا تعاقب کیوں کرنے لگا۔۔۔۔۔۔“ اور پھر وہ بھی کچھ۔۔۔۔۔۔ ”آپ خواہ مخواہ کسی شک وشبہ میں نہ پڑیں۔“ ”معلوم نہیں کیوں وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر دیکھا ہے۔“ جن نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فکر مند سے بولا۔ ”کیا یہ عجیب بات نہیں کہ جہاں میں جاتا ہوں یہ ذلیل، کمینہ، سوراہاں ٹپک پڑتا ہے۔“

”واقعی یہ عجیب بات ہے۔“ ”روپا نے جتنی کو ہمیدہ اور غصے میں دیکھ کر کہا۔ جیسے جیسے گرمیاں گزریں اور دسمبر کا مہینہ آیا یہ بات عجیب سے عجیب تر اور پریشان کن ہوتی چلی گئی۔ یہ ایک غیر انداز میں ہر اس بات کرنے والی بات تھی۔ ہفتے میں ایک مرتبہ۔۔۔۔۔۔ بھی دو مرتبہ اور بھی تین مرتبہ۔۔۔۔۔۔ وہ ہر اس رات جتنی کو اپنے برابر اپنے پیچھے، اپنے آگے، جبکہ نظر آتا رہا۔ ہر مرتبہ جن کی نگاہیں کم از کم ایک بار اس کی نگاہوں سے ضرور ٹکرائیں، اور ہر مرتبہ جن محسوس کرتا کہ اس کی نگاہوں میں شناسائی کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ اس سے ہر ملاقات میں جن محسوس کرتا کہ وہ اپنی اطراف سے بے نیاز اپنی دھن میں مست ہے۔ اسے اس بات

سے کوئی پرواہ نہیں کہ جن کیسا سوچتا ہوگا۔ لیکن وہ اس کے آس پاس کیوں رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ جن کے ذہن میں بار بار سوال ابھرتا۔ ایک رات جب جن گھر آ رہا تھا اس کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہوئی۔ صبر کا پیمانہ چھلک پڑا تھا۔

جن اس کے پاس گیا اور اس نے قدرے ترش روئی سے پوچھا۔ ”آپ میرا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟“

اس نے اپنی نگاہیں جن کے چہرے پر مرکوز کر کے اور ناک کیخیز کشفاف اردو لہجے میں بولا۔ ”کیا فرمایا آپ نے۔۔۔۔۔۔؟“

”آپ کئی مہینوں سے میرا تعاقب کیوں کر رہے ہیں؟“ جن نے جتنی سے کہا۔ ”آپ مجھے ہر جگہ نظر کیوں آتے ہیں؟“

اس نے انکاری سے کہا ”آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ”نہیں۔“ جن نے ہزنیانہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔ آئندہ سے آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں۔“

اس انجینی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ ”روپا!“ جن کے لہجے میں تشویش سی تھی۔ ”آج میں نے اسے پھر دیکھا۔“

”کس کو۔۔۔۔۔۔؟“ ”روپا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلکیں جھپکائیں۔“ ”اس کہنے اور ذلیل انگریز کے بچے کو۔۔۔۔۔۔ وہ بولا۔ ”وہ حرامی آج میرے ساتھ بلڈنگ کی لفٹ میں تھا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ وہی تھا۔۔۔۔۔۔؟“ ”روپا بولی۔ ”کہیں تمہاری نظروں کو دھوکا تو نہیں ہوا۔“ ”بالکل۔۔۔۔۔۔ یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔ وہ انگریز جیسا جو ہے ایسا آدمی پورے شہر میں کہاں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔“

ہے۔ اب مجھے وہ روز ملتا ہے۔ کبھی سڑک پر کبھی گلی میں، کبھی ہوٹل میں اور اب لفت میں بھی..... اور وہ مجھے پاگل کر دے گا۔ وہ مجھے پاگل کرنے کے نفسیاتی حربے آزماتا رہا ہے۔ اسی لئے وہ میرا پتھا کرتا رہتا ہے لیکن کیوں.....؟ میرے پاس دولت نہیں ہے، میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ میرا سب کچھ تم ہوا یک حسین اور پیاری بیوی۔“

روپا نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ نے اس سے کبھی بات کی؟“

”ہاں“ جن نے سر ہلایا۔ ”اس سے نہ صرف بات کی بلکہ اس حرامی کو گالیاں اور دھکیاں بھی دیں لیکن اس ڈھیٹ پر پیسے کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ اس کے چہرے سے صرف جب کا اظہار ہوتا ہے اور پھر وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے دن پھر کہیں مل جاتا ہے۔“

”اچھا.....“ روپا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تم پولیس کی مدد کیوں نہیں لیتے؟ تمہارے ایک دوست یا ہم جماعت پولیس انسپکٹر ہیں، لیکن اس سے کیا فائدہ، کیوں کہ اس نے آپ کو کبھی کچھ نہیں کہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”بہنی مشکل ہے روپا میری جان!“ جن نے کہا۔ ”اب اس نے کچھ کہا تو نہیں..... وہ زیادہ بات بھی نہیں کرتا لیکن میرے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا ہے۔ میں تو پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ تم دیکھ لینا شاید میں اس دن پاگل ہو جاؤں۔“

روپا بدحواس سی ہو کر سرائیکی میں بولی۔ ”آپ نے کیا اس کا کوئی حل سوچا ہے؟“

”حلی؟“ جن نے کہا۔ ”میں نے اس کا جو حل سوچا ہے وہ تمہیں بتاتا ہوں۔ اب اگر وہ مجھے ملا تو میں اسے پکڑ لوں گا اور مار مار کر اس کا بھر کس نکال دوں گا۔ اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک وہ اس تعاقب کرنے کی جہ نہیں بتا دے گا۔ میں

اس کی ان حرکتوں کی تہہ میں پھنک کر دم لوں گا۔ میں دیکھتا ہوں وہ اب میرے ہاتھوں سے کیسے پختا ہے۔“

”جان!“ روپا نے اس کے گلے میں اپنی مرمی بائیں حائل کر دیں۔ اسے خود سپردگی کی سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ زیادہ جذباتی اور مشتعل نہ ہو جائیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ اسے قتل نہ کر بیٹھیں۔ آپ یہ سوچیں کہ میرا کیا ہوگا؟“

”میں اسے قتل نہیں کروں گا لیکن اسے اسپتال ضرور پہنچاؤں گا۔ اسے دو مہینے سے پہلے چھٹی نہیں ملے گی۔“ جن نے کہا۔

☆☆☆

اگلی رات اسے وہ انگریز پھر مل گیا۔ وہ ایک پلیٹ فارم پر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ جن اس کے پیچھے بھاگا لیکن بجیز میں کدھے کے سینگ کی طرح قایم ہو گیا۔ اس نے اپنے سینے کی بہت تلاش کیا لیکن نظر نہیں آیا۔

اس رات جن کے پاس سگریٹ ختم ہو چکی اور جب وہ اپنے فلیٹ سے نکل کر گلی کے کنارے والی دکان کی طرف چلا تو نہ جانے اسے یقین ہو گیا کہ وہ انجینی

اسے راستے میں ضرور ملے گا۔ اس نے اپنے اس خدشے کا تذکرہ روپا سے کیا تھا۔ سگریٹ ہوتا بھی ایک اتفاق اور حیرت کی بات تھی۔ اس کا خیال تھا اس کے پاس سگریٹ کا پورا پاکٹ موجود ہے لیکن اس میں صرف ایک سگریٹ دیکھ کر وہ پکارا کہ سگریٹ ختم کیسے ہو گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ نیا پاکٹ وہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ روپا نے بھی وہ سینگ تلاش کر کے بتایا کہ وہ پاکٹ نہیں مل رہا ہے۔ شاید وہ گھر سے سگریٹ لینے نہیں نکلا لیکن وہ سگریٹ کے سونپیں

سکا تھا۔ رات بارہ بجے کی وہ ٹی وی دیکھتا اور سگریٹ پیتا رہتا تھا۔ اس کے بغیر اسے پروگرام دیکھنے میں مزہ نہیں آتا تھا۔ جن جب نیوسان کی لال چلی جلتی جھتی جی کے نیچے آتو تو اس کی نگاہ اس

تو وہ ایک لمحے کے لئے رک کر سہٹا۔ آگے وہ انگریز بھی رک گیا۔ جن نے اس کے اٹھتے ہوئے بندھی ہوئی گھڑی کو بلب کی روشنی میں جھپکتے ہوئے دیکھا۔ جن نے دیکھا وہ ہاتھ کا اشارہ کر کے تنخواہ انداز سے اسے اپنا تعاقب جاری رکھنے کی ترغیب دے رہا ہے۔

جن نے سانسوں پر قابو پانے کے بعد اس کی طرف تیزی سے دوڑ لگا دی۔

انگریز نے صرف ایک ہاتھ انتظار کیا اور پھر دوڑنے لگا۔ اب انگریز ریل کی پٹریوں پر بنے ہوئے بل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ بل کی دیوار کے برابر بھاگ رہا تھا دیوار کی چوڑائی کے بعد خلا تھا اور نیچے ریل کی پٹریاں۔

دور سے جن سے سنا رات کا سینہ چیرتی ہوئی آنے والی ٹرین کی چمک چمک کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی۔

جن نے دیکھا کہ انگریز دیوار ختم ہونے کے بعد دیوار کے پیچھے جھپکے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب وہ جن کو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اب جن اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جن نے دیوار کا فاصلہ عبور کیا اور اس کے ختم ہونے کے بعد انگریز کو پکڑنے کے لئے مڑا۔ ایک لمحے کو اس نے دیکھا کہ انگریز دیوار کی چوڑائی سے اپنی پیٹھ چپکائے کھڑا ہے۔ جن نے اسے پکڑنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے لیکن انگریز کے ہاتھ پہلے سے ہی مقابلے کے لئے تیار تھے۔

جن نے محسوس کیا کہ اس کے بدن کو دو ہاتھوں نے چھوا۔ پھر اس کے بدن کو آگے کی طرف ایک جھٹکا لگا اور اگلے لمحے وہ نیچے گر رہا تھا اور اس کے ہاتھ جیسے ہوا کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب جن ریل کی پٹریوں پر گر اتوا تو صرف اتنا ہوش رہا تھا کہ ٹرین کا دیو قامت سایہ اپنی گردن کا اہٹ اور تیز رفتاری کے ساتھ اس کی طرف

بڑھ رہا ہے۔ اس میں اتنی سخت کمی نہیں ہے کہ حرکت کر سکے۔

☆☆☆

جن کی موت کے بعد رات دس بجے کے بعد وہ انگریز جن کے قتل کے دروازے پر پہنچا۔ پہلی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ وہ غراپ سے اندر داخل ہوا۔ پھر اس نے اندر گھستے ہی روپا کو دو بونچ لیا۔ پھر وہ روپا کے حسین چہرے پر جھک گیا۔ وہ دونوں دنیا و فانی سے بے نیاز ہو گئے۔ ان پر شرابی طاری ہوئی۔ روپا بھی بڑا دلہانہ پن اور خود پسندی تھی۔ انہیں دروازہ بند کرنے کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ جب وہ کیف سے نکلے تو روپا بولی۔ ”تم نے بڑا انتظار دکھایا۔“

”اس لئے کہ میں تین چار دن بعد آتا تو بلڈنگ والوں کو شک ہو جاتا۔ اس لئے آج آیا ہوں۔“

”تم نے مجھے جس کمال مہارت اور تدبیر سے یہود بتایا اس کی داد دینا نا انصافی ہوگی۔“

”جان من! جیسا کہ میں نے تم سے اس معاملے کی ابتداء میں ہی کہا تھا کہ ایک بے عیب اور ناقابل گرفت قتل کے لئے بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہنر حاصل کرنے کے لئے انگریز جیسی شکل و صورت میں انگریز جیسا دماغ چاہئے۔ میں نے نہ صرف تمہیں فتح کر لیا بلکہ راستے کا سب سے بڑا پتھر ایک شوکر سے ہٹا دیا۔ اب ہم دونوں آزادی سے چل سکیں گے۔ میں آج رات بارہ بجے آؤں گا۔ تم دروازہ کھلا رکھنا تاکہ دستک دینے کی فوبت نہ آئے۔ میں دلا بٹی شراب لاؤں گا۔ ہم ساری رات جشن منائیں گے۔“

”لیکن آج کی رات حوالات میں جشن مناتے ہوئے گزرے گی۔“ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

میری آواز سنستے ہی روپا اس کے بازوؤں سے تڑپ کر لٹکی۔ ایک طرف کھڑی ہو کر بال اور لباس کی

تفلیس درست کرنے لگی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ انگریز نے میری طرف ناگواری سے دیکھا اور غراپ۔ ”کون ہو تم.....؟ بغیر اجازت اندر کیسے آئے؟“

میں اس وقت سادے لباس میں تھا۔ میں نے کہا۔ ”میرا نام جو گندرسنگھ ہے۔ میں جن کا بچپن کا دوست ہوں اور ہم جماعت ہوں۔ پولیس انسپکٹر ہوں۔“ میں نے جیب سے کارڈ نکال کر اسے اپنی شناخت کرائی۔ ”آپنے دوست کے قتل کے کیس کی تحقیق کر رہا ہوں اور میں تمہیں گرفتار کرنے کے لئے آیا ہوں۔ تم نے میرے دوست کو قتل کیا ہے۔“

روپا کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ انگریز نے جیسے دلدل میں ڈوبتے ہوئے چلنے کا سہارا لیا۔ قتل میں نے نہیں کیا تھا۔ ایک حادثہ تھا۔ اس بات کے گواہ اخبارات ہیں۔ میں اس میں چھپنے والی خبریں پیش کر سکتا ہوں۔“

”حادثہ..... میں نے تو سنا ہے کہ میرے دوست کی زندگی کا حادثہ دونوں کی گتھائی ہے جو اس سے پوشیدہ رہی۔ اس غریب کو تو دونوں کے تعلقات کا ذرا برابر بھی شبہ نہیں ہو سکا۔ جہاں تک میرے دوست جن کی موت کا تعلق ہے اسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو؟“

”آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ قتل میں نے کیا ہے؟“ انگریز نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”اتفاق سے مقتول نے قتل والے دن صبح میرے دفتر آ کر تمہاری حرکتوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ میں اس کی طرح یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کے پس پردہ کون سا جذبہ کار فرما ہے۔ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور تم دونوں کی جواباتیں سن کر میرا شک و شبہ دور ہو گیا۔ اس عورت نے ایک شریف آدمی کو دھوکہ دے کر اپنا تن میلایا۔ بے وفائی اور ہرجائی پن کا مظاہرہ

کیا۔ تم نے اپنی وجاہت اور انگریز پن سے اس کو ورغلا یا۔“

”محبت کرنا کس قانون میں جرم ہے؟“ انگریز نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن کسی شادی شدہ عورت سے تعلقات قائم کرنا جرم ہے۔ تم نے ایک معصوم شخص کی بیوی کو حاصل کرنے کے لئے اس کی بیوی کو نہ صرف داغ دار بلکہ مارے قتل کیا۔ قتل جرم ہے۔“

”آپ میرے خلاف قتل کا جرم ثابت نہیں کر سکتے۔“ وہ مجھ کو برہمی سے بولا۔ ”آپ کے پاس اس کی کوئی بھی شہادت موجود نہیں ہے۔ میں جن کی موت کے وقت اپنی موجودگی نہیں اور ثابت کر سکتا ہوں۔“

”یہ ایک اور جرم ہوگا کیوں کہ ہمارے پاس ایک عینی گواہ موجود ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تمہاری بدھستی ہے کہ آپ کو اقدام قتل کے وقت ایک فرض شہاسا اور قابل اعتماد اور ایک انتہائی معتبر شخصیت نے دیکھ لیا ہے۔ اس نے اپنا بیان بھی دیا ہے۔ یہ ایک ٹھوس ثبوت ہے کہ اسے تم اور تمہارے فرشتے بھی جھٹلا نہیں سکتے۔“

”یہ جھوٹ اور سراسر بہتان ہے۔“ انگریز دھاڑا۔ ”اس وقت وہاں اندر میرا دروازہ تھی۔ وہ مجھے کیسے شناخت کر سکتا ہے۔“

”تم بالکل نا اڑی ہو۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔ ”تمہارا یہ کہنا کہ وہاں اندر میرا تھا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم وہاں موجود تھے۔ ہمارے گواہ نے بتایا کہ دورے آئی انجن کی روشنی میں سے ایک انگریز کو دکھا دیتے ہوئے دیکھا جو ریل کے نیچے آیا تھا اور تم اس پورے علاقے میں بلکہ شہر میں اگھوٹے انگریز ہو۔“

روپا شش کھا کر میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ وہ مجھ کو ہلکا ہو کر میری شکل دیکھنے لگا۔

واہ بھئی واہ

ادائیگی

گرلز ہوسٹل میں نیا چوکیدار رکھا گیا۔ ایک ماہ پورا ہوا تو وہ کھیر کے آفس میں پہنچا اور بولا۔

”جب مجھے ملازم رکھا گیا تو ایک ہزار روپے مہینے کی بات ہوئی تھی تا۔“

”ہاں“ کھیر نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ یہ لو اس مہینے کا ہزار روپیہ۔“

چوکیدار نے اپنی جیب میں سے رقم نکالی اور کھیر کی میز پر رکھ کر خوشی خوشی واپس ڈیوٹی پر چلا گیا۔

☆

ملاقات

ایک امریکی بچے نے سر راہ ایک پادری کو دیکھ کر کہا۔ ”ہیلو مسٹر“

پادری نے ششکانہ انداز میں کہا: ”تم مجھے مسٹر کے بجائے قادر کہہ کر مخاطب کرو تو زیادہ اچھا ہوگا۔“

بچہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

”اچھا، تو آپ یہاں کھوتے پھر رہے ہیں اور میری اتنے سال سے مجھ سے کبھی کے جاری ہیں کہ انہیں

معلوم نہیں، میرا باپ کون ہے۔“

ایک شخص کی داستان جس نے زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونے کے بعد اپنی نئی منزلوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جو رشتوں پر یقین رکھتا تھا۔ اپنوں کی لالچ کاشکار بنا۔ اس کے خلاف بنی سازشوں نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا۔ وہ ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر تھا۔

عمران ڈائجسٹ کا پرتجسس دل ہلا دینے والا سلسلہ



اجانک ہی میری نظر چھت پر پڑی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہوں چھت میں اتنا خوب صورت فانوس لٹکا ہوا تھا کہ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی، لیکن چھت۔۔۔ فانوس۔۔۔ میں نے چونک کر دیواروں کو دیکھا۔ سفید رنگ کے پینٹ سے آراستہ دیواریں بہت صاف و شفاف محسوس ہو رہی تھیں۔ ان سے لگا ہین گزریں تو ایک کھڑکی پر پڑیں جس پر ایک خوب صورت پردہ بڑا ہوا تھا اور اسی پردے کے کچھ رخنوں سے سورج کی روشنی اندر چھا تک رہی تھی۔ میری نگاہیں چاروں طرف گھوم گئیں۔ موقوفی نے شاید ابھی تک اس باجول کا جائزہ نہیں لیا تھا میں میرے منہ سے سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی۔

”موقی۔۔۔“

”ہوں۔“ وہ میرے سینے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

”موقی زرا دیکھو توسی۔“

”کیا۔“ اس نے پوچھ لیں لہجے میں کہا۔

”موقی یہ وہ غار نہیں ہے۔“

”کون سا غار؟“

”جہاں ہم قیام کرتے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا نہ جانے کیوں میرا ذہن پوچھ لیں ہے۔“ موقی نے جواب دیا۔

”موقی ہم اس غار میں نہیں ہیں جہاں ہم سوئے تھے۔“

”کیا۔۔۔۔۔“ موقی چونک پڑی۔

”ہاں چاروں طرف دیکھو، یہ تو کوئی بہت ہی عمدہ کمر محسوس ہوتا ہے۔“

موقی پوچھ لیں انما میں آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ذہن کو بھی شاید کوئی جھٹکائی لگا تھا۔ دوسرے لمحے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بدن پر چادر سنہال لی تھی۔ پھر وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی اور اس کے منہ سے سرسراہٹ آواز نکلی۔

”میرے خدا، یہ کیا ہو گیا ہے۔“

”ہاں نہیں ویسے تمہیں یاد ہے تاکہ ہم غار میں سوئے تھے۔“

”یاد نہ ہونے کا کیا سوال ہے۔“

”تو پھر سوئے تو تھے یہ جگہ۔۔۔؟“

جو کچھ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا وہ خواب نہیں تھا کمرے میں اعلاطم کے ساز و سامان رکھے ہوئے تھے، بجلی ویزن، بیڈروم سائز فریج، فرش پر قالین نہ جانے کیا کیا کچھ اور یہ سب۔۔۔ یہ سب کچھ کم از کم گورنیاں کے اس غار میں نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں پچھلی پچھلی نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھتے رہے۔

موقی کافی دیر تک خاموش رہی پھر بستر سے اتر گئی۔ اس کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کھڑکی تک پہنچی جس پر وہ پردہ بڑا ہوا تھا، اس نے تھوڑا سا پردہ سرکایا اور باہر جھانکے گی۔ پھر اس کے منہ سے ایک آواز نکلی۔

”کل کی بھی۔“ میں خود بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ غالباً ہم کسی عمارت کی بلندی پر تھے۔ اندازے کے مطابق آٹھویں یا نویں منزل ہو گی کیونکہ دوسری طرف کی دنیا بڑی ہنگامہ خیز اور گہرائی میں نظر آ رہی تھی۔ ایک بہت چوڑی سڑک تھی۔ اس کے دونوں طرف شان دار عمارتوں اور دکانوں میں بنی ہوئی تھی۔ ٹریفک چل رہی تھی۔ یہ دنیا کا کوئی جدید ترین شہر تھا۔ پھر دکانوں پر لگے ہوئے سائین اور دوسری چیزوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لندن ہے، ہم لندن کے کسی شان دار علاقے میں موجود ہیں۔ مگر یہ کمر ایسی ہی طور پر کسی ہوٹل کا کمر ہے۔ میں نے جلدی سے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ میں سنسنی خیز نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے موقی سے کہا۔

”موقی پھر ہم لندن میں ہیں۔“

”کیسے اندازہ لگا یا؟“

”یہ سائن تم دیکھ رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”موقی تم کہتے ہو۔“

”گورنیاں نے لندن آخر کیسے؟“

”ایزی ہارڈو کے لیے یہ مشکل نہیں تھا۔“

”اس نے کھڑکی بند کی واپس چلی۔“ ایک عجیب سا احساس ہم پر مسلط ہو گیا تھا۔ جیسے ہم کسی غلطی دینا اس زندگی گزار رہے ہوں۔“ موقی نے کہا۔

”ہمارے کپڑے وغیرہ۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے کہا اور ایک طرف بنی ہوئی الماری کی جانب بڑھ گیا۔ الماری کھول کر دیکھی تو ہمارے پکڑا گیا۔ ہمارے لیے شال لباس بڑی ترتیب سے لٹکائے تھے۔ ایک طرف موقی کے لباس دوسری طرف میری ہر طرح موجود تھی۔ میں نے ان میں سے ایک لباس منتخب کیا اور ہاتھ روم کی جانب بڑھ گیا تھوڑی دیر کے بعد میں لباس وغیرہ تبدیل کر کے وہاں سے نکل آیا موقی کو اشارہ کیا کہ شہر تھا کہ ابھی اتک کوئی یہاں آیا نہیں تھا اس کے بعد میں دوسری طرف کی تلاش لینے لگا۔

ایک طرف دو بڑے سوٹ کپس رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کھول کر دیکھا کوئی چیز لاک نہیں تھی۔ ایک سوٹ کپس میں چند کاغذات وغیرہ مجھے پیکٹ میں رکھے نظر آئے میں نے وہ پیکٹ کھول لیا کاغذات کے ساتھ ٹریڈر پیکٹ تھے جو میرے نام پر بنے ہوئے تھے اور ان پیکٹوں کی مجموعی رقم تقریباً ساٹھ لاکھ پاؤنڈ تھی۔

میرا سر پکڑا گیا۔ ساٹھ لاکھ پاؤنڈ گویا ایزی ہارڈو نے تمام بندوبست کر کے رکھ دیا ہے پھر اور کاغذات تلاش کیے۔ اس دوران موقی بھی میرے پاس پہنچ گئی تھی اور ان کاغذات کا جائزہ لینے لگی تھی۔ ہمارے پاسپورٹ تھے اور یہاں آنے کے تمام کاغذات جو بالکل حقیقی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے سامنے ہی گلابی رنگ کا ایک لفافہ بھی تھا

اور یہ لفافہ میری توجہ کا مرکز بن گیا۔ کیونکہ یہ بند تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکلا اور اس کاغذ پر ایزی ہارڈو کی درج شدہ تحریر تھی۔

”میری زندگی کے بہترین ساتھیو!

موقی اور شہزاد! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم لوگوں نے میری زندگی میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جسے شاید میں آخری سال تک فراموش نہ کر سکوں، ویسے تو لاتعداد افراد سے میرا رابطہ رہا ہے بہت سے افراد نے میرے ساتھ بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن شہزاد تم نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے تمہیں اپنے دل میں ایک خاص مقام دیا تھا میں رشتوں سے ناواقف ہوں اور نہ ہی کسی رشتے کا نام لے کر تم سے اس قربت کا اظہار کروں گی۔ یہ ایک اٹھارہ رشتہ ہے جو میرے اور تمہارے درمیان قائم ہے۔ دیکھو میں نے ماضی کا میڈیکل استعمال کیا، ہر بات میں صاف کمرہ دہری ہوں اس لیے کہ میں بھی ہوں تم بھی موقی بھی ہے، ہم ہیں اور میں جانتی ہوں کہ ہم رہیں۔ مجھے اپنے آپ سے دور کرو گے تو مجھے دکھ ہوگا اور یہ دوری اسی شکل میں ہو سکتی ہے کہ تم میرے فیصلوں کو قبول نہ کرو اگر تم نے میرے فیصلوں کو قبول نہ کیا تو میں تم سے دور ہو جاؤں گی۔ کیونکہ میں نے جو فیصلے کیے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کیے ہیں اور یہ بات آج کی نہیں ہے بلکہ ان برسوں کی ہے جن برسوں میں شہزاد تم مجھ سے اور موقی سے دور رہے ہو۔ میں بڑے چھپچھانوں کا شکار رہی ہوں۔ میں نے لاتعداد بار موقی کو دیکھ کر سوچا کہ میرے کام کی تکمیل تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتی لیکن میں نے وہجبت میرے دلوں کو اپنی غرض کے لیے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے تم یقین کرو شہزاد خدا نا خواستہ اگر تم کسی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چلے جاتے تو اس بات کا یقین ہونے کے بعد میں یہ سب کچھ ختم کر دیتی اور خود بھی گوشہ نشین ہو جاتی، اسی قدر جذباتی ہوئی کی تمہاری لیے، لیکن امید کی کرن بھی جو میرے دل میں روشن تھی اور اس کا حلق کسی سانس دہی سے نہیں تھا بلکہ اس

قدرتی احساس سے تجا جس کا خالق کوئی اور ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ انسان کوئی ہی بلند یوں تک پہنچ جائے ہر جگہ اسے اپنے خالق کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور میں نے بھی ہمیشہ اس احساس کو اپنے دل میں زندہ رکھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم زندہ ہو اور آخر کار ہمارے درمیان پہنچ جاؤ گے۔ میں نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ اگر ایسا ہو گیا تو پھر تمہیں اور موٹی کو اپنی زندگی سے ہٹا دوں گی کیونکہ میرا کام تو بہر حال جاری ہی ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ اس دوران بارسلونا میں ہماری وہ حیثیت ختم ہو گئی۔ لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سب کچھ دینا کے لیے ہی کیا تھا۔ اگر دنیا والوں نے اسے قبول نہیں کیا تو یہ ان کی مرضی ہے اور اب بھی میں یہ سلسلہ جب تک میری زندگی ہے جاری رکھوں گی، کوشش یہ کروں گی کہ میرے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہے اور کچھ شخص ایسے موجود ہیں کہ جب دنیا اپنے پر پا کئے ہوئے طوفان میں مبتلا ہو جائے تو جس حد تک میں یا میرے بعد کے لوگ اس کی مدد کر سکیں ضرور کریں۔ تم سوچ رہے ہوں گے کہ میں جذباتی ہو گئی ہوں اور جذباتی باتیں کر رہی ہوں۔ میں یہ کہتی ہوں کہ جذبات ہی تو زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ جذبات اگر انسان کے وجود سے ختم ہو جائیں تو پھر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ انسان انسانی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے تو تمہارے لیے بھی میرے دل میں کچھ جذبات تھے۔ میں جانتی تھی کہ اگر میں تمہیں باقاعدگی کے ساتھ خود سے جدا کروں گی تو تم آخری وقت تک جدوجہد کرو گے، لیکن میرا یہ فیصلہ بڑا اہل تھا اور میں اس کے لیے کوئی گنجائش اپنے اندر نہیں نکال سکتی تھی۔ شہزاد میرے دوست! میرے بہت اچھے دوست، بہت سے ایسے مرحلے آئے ہوں گے جب تمہیں میرے فیصلوں سے اختلاف رہا ہوگا۔ لیکن تم نے ان کا اظہار نہیں کیا۔ میں جانتی ہوں میرے اس فیصلے سے بھی تمہیں شدید اختلاف ہوگا کیا ایک ایسی شخصیت کا کوئی اختلاف تم قبول کر لو گے جس نے ہمیشہ تمہیں ایک الگ ہی

مقام دیا اگر یہ اختلاف تمہارے دل میں ہے تو پہلی بار تم سے درخواست کروں گی کہ اسے قبول کر لو، میرے لیے تمہاری یہ قبولیت ایک تحفہ ہوگی اور میں اس بات پر خوشی کا اظہار کروں گی کہ میں نے تم سے جو کچھ مانگا تم نے اس سے انکار نہیں کیا۔ شاید یہ باتیں تم جذباتی نوعیت کی محسوس کرو اور یہ سوچ کہ میں نے لغائی کھیل، کھیل کر تمہیں اپنے مقصد سے متفق کرنے کی کوشش کی ہے، نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ میں سچائی ہے اور یہ حقیقتیں تمہیں ہر قیمت پر قبول کرنی ہی پڑیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم انہیں خوش دلی سے قبول کر لو اور میرے اور اپنے درمیان ان راہلوں کی گنجائش رہنے دو جو مستقبل میں بھی رہیں گے۔ ہاں۔۔۔ اگر تم نے ان سے اختلاف کر کے کوئی ایسا قدم اٹھایا جو مجھے یہ احساس دلانے کا تم مجھ سے متفق نہیں تھے تو یقین کرو کہ وہ کوئی بھی تم میری صورت نہیں دیکھ پاؤ گے۔ اب وہ کچھ جو اس کے بعد کی کہانی ہے۔

تم سمجھ لو کہ جس طرح تم نے اب تک میری ہر ہدایت پر عمل کیا ہے اور میرے لیے زندگی کی بازی لگاتے رہے ہو اسی طرح یہ بھی آخری ہدایت ہے، شاید اس کے بعد اگر کہیں ضرورت پڑے اور تم مجھے موقع دو تو میں تمہیں کوئی اور ہدایت دے سکوں، اگر موقع نہیں دو گے تو جس طرح میں نے پہلا قدم دیا تو اب یہ سن لو کہ تمہارا نام شہزاد نہیں ہے اپنے کاغذات اگر تم نے دیکھ لیے ہیں تو یہ سارے کے سارے کاغذات شہزادہ ندیم کے نام پر ہیں۔ شہزادہ ندیم اور مسز موٹی ندیم سمجھ رہے ہونا، شہزادہ ندیم کی حیثیت سے تم یہاں وقت گزار دو گے۔ ایک شخص کو میں نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے اور اس کا نام ہے الیاس بیک الیاس بیک یوں سمجھ لو کہ وہ شخص ہے جسے میں نے اپنے آپ سے تمہارے لیے مخصوص کر کے بھیجا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے کیا کرنا ہے لیکن اسے بھی میں نے سمجھا دیا ہے اور میں جانتی ہوں کہ جو کچھ

میں نے اس سے کہا ہے یہ وہی کرے گا۔ کیوں۔۔۔ اس بارے میں نہ پوچھنا یہ شخص الیاس بیک لندن میں تمہیں ہر طرح کی سہولت فراہم کرے گا۔ میں نے لندن کا انتخاب تمہارے لیے اس لیے کیا ہے کہ تم اپنی دنیا سے بہت دور نہ جاؤ تمہاری دنیا مطلب تمہارا وطن، تمہارا ملک، ممکن ہے حالات اس طرح کا رخ اختیار کر جائیں کہ ایک بار تم پھر اپنے وطن کا رخ کرو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے۔ لیکن تم خود سمجھو دار انسان ہو اس وقت اپنے وطن کی جانب رخ کرنا جب تم دیکھو کہ حالات تمہارے حق میں ہیں۔ کسی جذباتی کیفیت کا شکار نہ ہونا۔ لندن میں تمہیں ایک پرسکون رہائش گاہ ملے گی اور تم یہاں کچھ عرصے میں اپنے لیے جگہ بنانے کی کوشش کرو یہ ایک ٹھوس ہی رہائش گاہ نہیں ہے تمہارے لیے رکھ دی ہے لیکن اصل رقم مکمل الیاس بیک فراہم کرے گا۔ وہ ایک قابل اعتماد شخص ہے۔ اس دوران وہ تمہارے لیے ایک مستقل رہائش گاہ کی کوشش میں مصروف ہے اور اس رہائش گاہ کو حاصل کر کے وہ تم سے ملاقات کرے گا۔ عارضی طور پر میں نے تمہیں اس ہوٹل میں ٹھہرایا ہے۔

تم یقیناً سوچو گے کہ کورنیاں سے لندن تک کا سفر کس طرح ملے ہوا اس کہانی کو میرے لیے چھوڑ دو۔ تم خود جانتے ہو میرے پاس ایسے ذرائع ہیں کہ میں یہ کام کر سکوں۔ یہاں کا مکمل نہیں ایک شہزادے کی حیثیت سے خوش آمدید کہے گا۔ اپنے آپ کو اس حیثیت میں برقرار رکھنا جس اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے، میری تمام باتوں کو تسلیم کر کے خوش ہونے کا موقع دو گے۔

ایزی ہارڈو۔

میں نے یہ خط پڑھا، دوسری بار پڑھا۔ موٹی میرے شانے پر پھوڑی لٹکانے خود بھی میرے ساتھ ساتھ خط پڑھ رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر خط اس کی جانب پڑھایا تو وہ بولی۔

”میں نے پڑھ لیا ہے۔“ ہم دونوں اپنی جگہ

بے اٹھے اور ایک صوفے پر جا بیٹھے۔ دونوں ہی متحیر تھے۔ خط موٹی کے ہاتھ میں دے دیا تھا میں نے اور موٹی اب بھی اس پر نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”موٹی کیا کہتی ہو اس خط کے بارے میں؟“

”میں تمہاری زندگی کی ساعی ہوں نا ندیم۔“

موٹی نے مجھے شہزادے کے بجائے ندیم کہہ کر پکارا تھا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

”ہاں اگر میں تمہیں ندیم کہہ کر مخاطب کر رہی ہوں تو تم اس سے میرے موقف کا اندازہ لگا لو یعنی یہ کہ میں ایزی ہارڈو کی بات ماننے کے لیے غلط دل سے تیار ہوں۔“

میں نے مسکرا کر موٹی کی جانب دیکھا تھا۔ بہر حال اس بات کی خوشی تھی کہ موٹی نے مستقبل کے لیے اس کا منصوبہ قبول کر لیا تھا اور اب مجھے اپنا فیصلہ سننا ہی تھا۔ تقریباً ایک ہفتے تک ہم ان تمام جگہوں سے لطف اندوز ہوتے رہے بالکل نوخیز جوڑوں کی مانند ہر جگہ یہ وسایات کر رہے تھے۔ ہر وقت میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر موٹی کا چہرہ اس طرح ٹھہرا تھا کہ حیرت ہو گئی تھی۔ لیکن میرے لیے ایک فکر پیدا ہو گئی تھی اور فکر مند ہونا شاید میری زندگی کا حصہ تھا۔ غلط رنگ کی وہ کار مسلسل میرا تعاقب کرتی رہتی تھی جسے میں نے غالباً دوسرے ہی دن محسوس کر لیا تھا۔ لیکن صرف اتفاق سمجھا تھا، تیسرے دن اور چوتھے، پانچویں دن بھی وہ کار میرے پیچھے کی رہی تھی تو مجھے ذرا سی تشویش ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ شہزادہ نہ جانے کس کس کے لیے قابل توجہ ہے اور اگر اسے کہیں دیکھا جاتا ہے تو بہت سے دلوں میں اس کے لیے تشویش پیدا ہو جائے گی۔ دل نہیں چاہتا تھا کہ اب اب ہنگاموں میں زندگی بسر کی جائے۔ لیکن ہنگامے خود میرا چپچا نہیں چھوڑتے تھے۔ میں کیا کرتا موٹی کو میں نے اس کار کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس طور پر اب میں محتاط ہو گیا تھا۔ چھ دن بھی جب وہ میرے پیچھے کی رہی

اور میں نے یہ محسوس کیا کہ تمام تقریبات سے منہ منے کے بعد جب میں ہوٹل میں داخل ہوتا ہوں تب وہ کارہوٹل تک پہنچتی ہے غالباً یہاں تک میرا تقاب کر کے گمرانی کی جاتی ہے تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ ساتویں دن مجھے اس کے بارے میں آگاہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ موٹی کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

چنانچہ ساتویں دن ہم نے ایک ایسے علاقے کا رخ کیا جس کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ یہ ایک ڈسٹرکٹ تھی، لندن کا ایک نواحی علاقہ جہاں خوب صورت رہائش گاہیں بنی ہوئی تھیں اور ایک ایسی جگہ بھی تھی جہاں سیر و سیاحت کے لیے جایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ ہوٹل کی کار کے ڈرائیور نے میری ہدایت کے مطابق وہاں تک سڑکیاں، نیلے رنگ کی کار کو میں نے بدستور اپنے ساتھ آتے دیکھا تھا۔

ایک مخصوص علاقے میں جہاں گھنے جنگلات بکھرے ہوئے تھے اور خوب صورت مصنوعی آبشار بنائے گئے تھے۔ لیکن یہاں عام دونوں میں کوئی بھی موجود نہیں ہوتا تھا۔ بس کوئی سرچرانی اس دنوں میں یہاں پہنچ جائے تو الگ بات ہے۔ میں نے اس سلسلے کے ڈراپ سین کا فیصلہ کر لیا۔ میں مسکراتا ہوں کار سے اتر اور موٹی کے ساتھ پہاڑی ٹیلوں، گھاس کے قطعوں کا سفر لے کر تھوڑا دور دراز اور سنان علاقے میں جا نکلا۔ میں نے اس دوران اپنے عقب کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ وہ ایک تندرست و توانا شخص تھا، خوب صورت لباس میں بیٹوں شکل و صورت کا تو مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ نیلی کار سے اتر کر میری جانب چل پڑا ہے پھر ایک انتہائی محفوظ جگہ میں اس سے منٹ سلگتا تھا میں نے موٹی سے کہا۔

”موٹی ایک کھیل دیکھنا پسند کرو گی؟“

”کیا کھیل؟“

”شاید وہ تمہارے لیے پسندیدہ نہ ہو اور تم

اسے دیکھنا مناسب نہ سمجھو۔“
”میں بالکل نہیں سمجھ پائی۔“
”میرا خیال ہے تم مجھے اس کی اجازت دو۔“
”بھئی کیا کہہ رہے ہو بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی۔“
”دیکھو یہ ایک بہتر جگہ ہے تم یہاں اس چٹان کی آڑ میں ہو جاؤ۔“
”تو پھر۔“
”بس ہو جاؤ۔“

”چلی جاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور چٹان کی آڑ میں جا چھپی۔ میں نے بھی اپنے آپ کو پوشیدہ کر لیا تھا۔ میں نے موٹی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ منہ سے کوئی آواز نہ نکالے اور خاموش کھڑی رہی۔ موٹی کے چہرے پر تجسس ابھر آ رہا تھا، میں بھی دم سادھے انتظار کرتا رہا تھا۔ کوئی تین یا چار منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے نیلی کار سے اترنے والے قوی پیکل شخص کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا وہ مجلس انداز میں گردن اٹھا اٹھا کر شاید ہمیں تلاش کر رہا تھا اور قدم قدم آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ میرے نزدیک سے گزرا اور دو تین فٹ آگے پہنچا۔ میں نے عقب سے نکل کر اس کی کمر پر زوردار لات

رہی کہ وہ شخص حالانکہ اچھی غلامی جامت کا مالک تھا لیکن اس بری طرح اچھل کر دوڑنے سے منہ اڑ کر اس کے حلق سے خچ نکل گئی، میں نے فوراً ہی اس پر چلائگ لگائی وہ اوندھے منہ گرنا تھا چٹان کی پشت پر سوار ہو گیا اور میں نے اس کی بٹل میں ہاتھ ڈال کر اس کے دونوں بازو قابو میں کر لیے۔ اس کا چہرہ بری طرح سے زمین پر گر گیا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر کھٹنا بجایا اور اس کی دونوں کلاں اپنی گرفت میں لے لیں۔

”اگر تم نے ذرا بھی جنبش کی تو میں تمہیں یہیں

زمین پر گر کر ہلاک کر دوں گا۔“

”سر، سر پلیز، سر پلیز۔۔۔ وہ خوف

زدہ لہجے میں زور زور سے چنچا تھا۔
میں نے اس کی جیب کی تلاشی لی۔ وہنی جیب میں روپو اور موجود تھا میں نے روپو اور نکال کر اپنے لئے لے لیا۔ پھر اس کے لباس میں یا پٹلی ہولشر میں دوسرا ہتھیار تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس روپو اور کے سوا اس کے پاس اور کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ چنانچہ میں اس کی پشت سے اتر گیا اور میں نے اس کو سیدھا کر دیا۔

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ سیدھا ہونے کے بعد اس نے خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے روپو اور اس کی جانب سیدھا کر رکھا تھا۔ دفعتاً اس کے حلق سے ایک قہقہہ آزاد ہو گیا۔ عجیب خوف زدہ سا قہقہہ تھا اور میں اسے کڑی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

”میرا آپ نے میرے لباس کی تلاشی لے لی کوئی اور ہتھیار نہیں ہے نا میرے پاس۔ اب کم از کم آپ اپنا پستول تو استعمال نہیں کریں گے۔ میں آپ کی اجازت سے اٹھ کر اپنے مکان ہوں۔“ اس نے کہا۔
”بیٹھے جاؤ۔“ میں غرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”سر! ویسے میں اس میں اپنا ہی تصور سمجھتا ہوں، حد سے زیادہ محتاط ہو جانا بھی آپ یوں سمجھ لیجئے کہ عذاب مول لینے کے مترادف ہے۔“
”کون ہو تم؟“

”آپ کا غلام، آپ کا خادم۔“ اس نے جواب دیا۔

”دوبی گڈ! تو میرے غلام، میرے خادم سات دن سے تم میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو۔“
”سر! اجازت دیجئے گا اور کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے بغیر میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں پہلے اسے سن لیجئے اس کے بعد آپ کا جو بھی رد عمل ہوگا مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔“ میں تیز نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

موٹی نے ابھی تک اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور میری ہدایت کے مطابق اس

جگہ خاموش کھڑی ہوئی تھی اس نے کہا۔
”آپ کی اجازت ہو تو میں جیب میں ہاتھ ڈال لوں۔“
”کیا مطلب؟“
”کچھ دکھانا چاہتا ہوں آپ کو۔ آپ یہ دیکھ چکے ہیں کہ میرے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں ہے، وہ میرے خدا مجھے اس بات کی امید نہیں تھی لیکن مجھے امید ہوئی جا ہے تھی مگر میں کیا کروں۔“

”تم فضول باتیں کر رہے ہو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اگر تم اس بات کا انتظار کر رہے ہو کہ کار سے تمہارے اور ساتھی نکل کر تمہاری مدد کو آجائیں تو یہ ابھی کے حق میں برا ہوگا لیکن طور پر تم خالی پستول جیب میں ڈرکتے ہوں گے۔“
”سر بالکل نہیں، بالکل نہیں پلیز ویسے آپ یقین کیجئے کہ کار میں، میں صرف اکیلا تھا۔ میرے ساتھ اور کوئی نہیں ہے۔“

”بہت سی باتوں پر یقین کر لوں گا لیکن اس میں ذرا وقت لگے گا۔“ میں نے موڈ بدل کر کہا۔
”جیب میں ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔“

”دکھاؤ کیا دکھانا چاہتے ہو۔“ میں نے کہا اور یہ اطمینان تو مجھے ہو چکا تھا کہ اب اس کے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ خوشی کرنے کی کوشش کرے لیکن اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جو چیز نکالی وہ ایک سفید کارڈ تھا اور اس کے ساتھ ایک بڑا ہوا کاغذ میں نے بدستور اس پر نگاہیں جمائے رکھی تھیں اس نے کہا۔

”یہ میرا کارڈ ہے پلیز اگر آپ کو اس بارے میں کچھ معلوم ہو تو۔“ میں نے پستول سیدھا کیے ہوئے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور اس سے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کارڈ پر نگاہیں جمادیں ایک لمحے میں میرے ذہن کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔ اس پر الیاس بیک لکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی تھوڑی سی کچھ اور تفصیلات، جس میں اس کی رہائش گاہ کے بارے میں درج تھا۔ الیاس بیک کا نام ایبزی ہارڈ کے خط

میں موجود تھا اور اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ الیاس بیک یہاں میرے معاملات سنبھالے گا میں اسے کھورنے لگا۔

”ہاں میں الیاس بیک ہوں۔ یہ دوسرا کاغذ جو میری تصویر کے ساتھ میرا شناخت نامہ ہے۔“ اس نے دوسرا کاغذ بھی آگے بڑھا دیا تھا اور میں نے اس میں اس کی تصویر کے ساتھ اس کی شناخت دیکھی پھر میں نے کہا۔

”مگر مسٹر الیاس بیک! آپ نے یہ طریقہ کار کیوں اختیار کیا تھا۔“

”سر! یہ بھی ایڑی کی ہی ہدایت تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ابتدائی کچھ دن میں دور رہ کر آپ کی نگرانی کروں اور یہ جائزہ لینے کی کوشش کروں کہ کوئی خاص طور سے آپ پر نظر تو نہیں رکھ رہا ہے۔ سراسر دان سے اسی لیے میں آپ کے گاڑی کی حیثیت سے آپ کے پیچھے کا پھر رہا ہوں۔ ہنسی مجھے اس بات پر آئی کی کہ میری کیا درگت بنی، بس ایک ذرا سی بے احتیاطی، کاش! اس سے پہلے ہی اسے آپ کو متعارف کروا دیتا آپ کو تو میری ریزہ کی بڑی ہی یہ تکلیف نہ ہوتی۔“ میں اسے کھورتا رہا پھر میرے حلق سے بھی تھہرے آزاد ہو گیا تھا۔ میں نے پستول نیچے کر کے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اسے کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

”سوری مسٹر الیاس! لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اب بتائیے میں کیا کروں۔“

”سر آپ! یہ بتائیں آپ کو کچھ پر اعتبار تو آ گیا۔“

”اب اعتبار نہ آنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ اب میری چٹائی کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ اس نے تکلیف کے باوجود ہنستے ہوئے کہا۔

”سوری ڈیز سوری۔“ میں نے کہا اور اس کا

لباس چھاڑنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ پھر میں نے موٹی کوچھی آواز دے لی تھی۔

”اب یہ بتائیے مسٹر الیاس! آپ اپنی کار ڈرائیو کر سکتے ہیں یا میں کچھ اور بندوبست کروں اس کا۔“

”آہ! کیسی عجیب بات ہے حالانکہ مجھے آپ کی خدمت کی ہدایت کی تھی لیکن بہر حال میں کار ڈرائیو کروں گا اور ہمیں کہیں دور نہیں جانا پڑے گا۔“

”آئیے، اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کار ڈرائیو نہیں کر سکتے تو آپ تکلیف نہ سمجھیے گا۔“ وہ ٹھوڑا سا چلا اپنی کمر کو دو چار جھٹکے دیے اور پھر بولا۔

”میں کار ڈرائیو کر سکتا ہوں، آپ براہ کرم میرے پیچھے آ جائیے۔“

”ایسا کریں کار ڈرائیو نہ کریں، ہوٹل کی کار کا ڈرائیو موجود ہے وہ ہمارے پیچھے پیچھے اپنی کار کو لے آئے گا۔ کار میں ڈرائیو کرنا ہوں۔ آپ مجھے راستہ بتاتے جائیے کہ کہاں جانا ہے۔“

”شکریہ“ اس نے کہا۔ ”میں نے بھی یہی گمان کیا تھا کہ اس شخص کو دیکھ کر ہی میں نے کار کے ڈرائیو کو ہدایت دی کہ وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلا آئے اور خود ٹیلی کار کا اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ الیاس بیک میرے پاس ہی بیٹھ کر آتا تھا ہمارا برہنہ رہا تھا۔ پھر اس حسین علاقے کے مختلف حصے طے کرتے ہوئے ہم ایک فارم ہاؤس کے سامنے پہنچے، اسے فارم ہاؤس کہا جا سکتا تھا حالانکہ یہ فارم ہاؤس نہیں تھا بلکہ اسی کی طرز کی بنی ہوئی ایک عمارت تھی، بڑے سے احاطہ کا چوڑا گیت تھا اور اس گیت پر ایک چوکیدار تھیں تھا جو غالباً نیپال سے تعلق رکھتا تھا چوکیدار نے ٹیلی کار دیکھ کر فوراً دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد ایک روش جو اصل عمارت تک چلی جاتی تھی اصل عمارت کے سامنے بڑا سا پور لگیو تھا جس میں شیڈ لگے ہوئے تھے اور پھر آگے جا کر اندر جانے کا راستہ

دیکھ دیتے ہیں۔ گزرتا تھا لیکن حسین عمارت بنائی کی تھی۔ بڑے گیت کے دروازے پر بھی ایک کدو تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ میں نے الیاس بیک کو سہارا دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ اب وہ بہتر حالت میں ہے۔ پھر وہ ہمیں لیے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ لندن کی قدیم روایت کے مطابق یہ عمارت خوب صورت اور پرانے قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھی لیکن ہر چیز دیکھنے سے قتل رشتی تھی۔ پہلی ہی جگہ ایک وسیع دعویش ڈرائنگ ہال تھا جس میں شان دار فرنیچر پڑا ہوا تھا اس نے کہا۔

”اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں؟“

”آپ بیٹھے پلیز۔“ میں نے کہا۔ ”موتی بھی جہاں تھی۔ الیاس بیک مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ اس وقت میں اسے ایک الونکا استخراج اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔“

”سر کیا ایڑی ہارڈو نے میرے بارے میں آپ سے کوئی بات کی تھی؟“

”ہاں یہ بتایا گیا ہے مجھے کہ آپ یہاں میرے مفادات کے نگران ہیں۔“

”بے شک اور دیکھیے کیا دلچپ نگرانی کی میں نے آپ کے مفادات کی جس کے نتیجے میں ریزہ کی بڑی تڑوا بیٹھا۔“

”اگر آپ کو زیادہ تکلیف ہو تو میں ڈاکٹر وغیرہ کو۔۔۔“

”نہیں، سر! ٹھیک ہو جاؤں گا بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ چوٹ زیادہ نہیں محسوس ہوگی اب جب مجھے بہت زیادہ جھٹکا رہنے کا حوالہ دیا گیا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ زیادہ تجسس نہ رکھوں۔ ہو سکتا ہے آپ پچھری غلط فہمی کا شکار ہو کر میری مرمت شروع کر دیں۔ دیکھیں میری بات کا براندہ مایہ میری عادت ہے یہی مذاق کی۔“

”ہاں سنائیے کیا صورت حال ہے۔“

”سر! پروگرام تو یہ تھا کہ مزید دو چار دن آپ کی نگرانی جاری رکھوں ویسے اس دوران ذرا برابر اس

بات کا احساس نہ ہو سکا کہ آپ پر کوئی نظر رکھ رہا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے آپ کے علاوہ اس دوران کسی نے مجھ پر نظر نہیں رکھی۔“

”اب مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کس ٹاپ کے آ دی ہیں۔ آپ تو خود میرے بھی محافظ ہو سکتے ہیں۔“ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا تو وہ بولا۔

”پہلی بات یہ کہ یہ عمارت آپ کی ہے۔“ الیاس بیک نے کہا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”آپ کی بھاری رہائش گاہ یعنی اگر آپ شہر کے ہنگاموں سے تنگ آ کر سکون کی زندگی اپنانا چاہتے ہیں تو اس عمارت میں قیام کر سکتے ہیں۔ عمارت شہزادہ ندیم نے خریدی ہے اور ان کی بھاری رہائش گاہ ہے۔ ایڑی ہارڈو نے یہ آپ کے لیے مخصوص کر دی ہے۔ یہاں اس وقت پانچ ملازم ہیں۔ جس میں دو کا تعلق نیپال سے ہے، دوسری ننگن ہیں اور ایک ہندوستانی باشندہ ہے۔ ان میں سے ہندوستانی باشندہ اور نیپالی آپ کا چکن انچارج ہے، باقی کچھ چوکیداری کرتے ہیں اور دوسرے کام، ان کو آپ کی نگرانی بخوادہی ہے۔“

”میری پہنی۔۔۔؟“

”ہاں میں اس پہنی کے تمام کاغذات آپ کو پیش کروں گا۔ آپ اس کے سب سے بڑے شیئر ہولڈر ہیں۔ وہ تمام چیزیں آپ کو اپنے فلیٹ پر ملیں گی یہاں نہیں۔“

”کیا چیزیں؟“

”میرا مطلب ہے کاغذات وغیرہ کہنی آپ کو باقاعدہ منافع دیتی ہے جو آپ کے بینک میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح مالی تحفظ حاصل ہے آپ کو اور آپ لندن میں کئی شہزادے کی زندگی با آسانی بسر کر سکتے ہیں۔“

”اور فلیٹ کی کیا بات کہی آپ نے مسٹر الیاس!“

تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں میری جانب رخ کرنے ہی والے ہیں اور میں نے اپنی جگہ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ میں آہستہ آہستہ ہلکے ہوا ٹراروں کے پیچھے والے حصوں کی جانب جانے لگا کہ دفعتاً عقب سے کسی نے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ میں نے فوراً جھکائی دے کر اپنے آپ کو اس گرفت میں آنے سے بچایا اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ کسرتی بدن کا خوف ناک صورت انسان تھا۔ اس کا چہرہ رات کی تاریکی کے باوجود عجیب سے انداز میں چمکا ہوا نظر آیا تھا اور بڑی بڑی آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ دفعتاً ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا اور زمین پر لوٹ لگا کر اس طرح پاؤں اور ہاتھ لپکے کہ میری کمر اس کے پیروں کی زد میں آئی۔ پھر کچھ اس انداز سے اس نے یہ دوا لگایا تھا کہ میں سمجھ نہیں پایا۔ لیکن بہر حال اس نے مجھے اس طرح چکر دے کر عقب سے پڑا اور پھر اس طرح اوپر اٹھایا جیسے کوئی معمولی سا کھلونا ہوں۔ بلاشبہ وہ خاصا طاقتور اور جسم آوی تھا۔ مجھے اوپر اٹھا کر اس نے پوری قوت سے زمین پر دے مارا لیکن کم از کم اتنا تو میں بھی کر سکتا تھا کہ کمر کے بل یا سر کے بل زمین پر آنے کے بجائے پیروں کے بل زمین پر آؤں چونکہ زندگی انہی لمحات سے دوچار رہی تھی مجھے کوئی چوٹ نہیں لگی۔ لیکن چند لمحوں کے لیے مجھے سنبھالنا ضرور پڑا تھا۔ اسی وقت دوسرا آوی بھی عقب سے آیا اور اس نے نہ جانے کس طرح سے جھک کر میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں ایک بار پھر بری طرح گر پڑا۔ جبکہ میں پلٹ کر اس قوی پیکل شخص پر حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ٹانگ پکڑ لینے کی وجہ سے میری جدوجہد ناکام ہو گئی اور قوی پیکل شخص نے ایک بار پھر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس بار اس نے میری گردن کی ہڈی میں ہاتھ ڈال دیا تھا اور پھر اس نے مجھے اسی طرح دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھالیا۔ مجھے اپنی گردن کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں لیکن پھر میں نے صورت حال سے نمٹنے کے لیے خود بھی

عمل کیا اور اپنا گھٹنا پوری قوت سے اٹھالیا۔ قوی پیکل شخص کے منہ سے ایک کراہٹ اٹھ اور دوسرے لمحے میں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ نیچے گرتے ہی پہلے آوی نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور ایک طرح سے مجھ پر چھانچا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ایک لمبے پیکل کا چاقو نکال لیا ہے اور اب صورت حال زیادہ ہی خطرناک ہو گئی تھی۔ اس نے پوری قوت سے یہ چاقو میرے پیٹ میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اپنی جگہ خانی چھوڑ دی اور چاقو زمین سے ٹکرایا۔ شاید اسی طرح زمین سے ٹکرانے سے یہ چاقو خود اس کے اپنے ہی ہاتھ میں لگا تھا۔ لیکن اب بالکل ہی موقع نہیں تھا کہ میں ان لوگوں کو مہلت دوں۔ اس شخص نے اپنے ہاتھ سے نچکنے خون کو دیکھا پھر ہاتھ کو اور دوسرے لمحے اس کے چہرے پر انتہائی خون خوار کیفیت پھیل گئی۔ وہ پھر پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اسی دوران دوسرا قوی پیکل آوی بھی میرے عقب میں آ گیا تھا اور میں فوراً نیچے پڑ گیا تھا۔ چاقو والے کا ہاتھ آگے بڑھا لیکن اس کا اپنا سامی اس کی زد میں آ گیا اور اس کے حلق سے ایک سختی کی شکل کی سی جھونک نکل رہی تھی۔ اس نے آوی میں کچھ بولا۔ جس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ سکے تھے اور اس کے بعد اس نے آگے بڑھ کر اس دوسرے شخص کا گلہ پکڑ لیا۔ پھر اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر مجھے موقع مل گیا تھا۔ میں نے وہاں سے اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں میرے پیچھے بھاگے تھے لیکن اب میں ان کے ہاتھ لگانے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں نے ایک چلائی کی قریب ہی ایک ٹرار موجود تھا اس کی پشت سے چڑھ کر میں اس کی چھت پر پہنچ گیا اور اس طرح بے آواز پھنچا کہ ان دونوں کو میری اس حرکت کا علم نہ ہو سکے۔ میں نے ان دونوں کو ایک طرف دوڑ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ میں ان پر لگا ہوں جہاں دیکھتا رہا۔ ٹرار کی چھت کاٹی اوپنی کسی اور اس اوپنی چھت

میں انہیں مختلف ٹراروں کے درمیان گردش کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ دو پاؤں کی طرح مجھے لال کر رہے تھے لیکن شاید ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں کسی ٹرار کی چھت پر بھی ہو سکتا ہوں۔ خاصی دیر تک میں یہاں رک کر ان کی بھاگ دوڑ دیکھتا رہا۔ پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کار اشارت ہونے کی آواز سنی اور دو ترک میری نگاہیں اس کار کو تلاش کرنے لگیں۔ ساحل کے ایک حصے میں کار کی تیزی روشتیاں نظر آئی تھیں اور پھر وہ دور ہوتی چلی گئیں۔ اندازہ یہی لگا یا جا سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ مگر خاصی گزیر ہو گئی تھی۔ یہ قدم میں نے اٹھایا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بے فائدہ ہی رہا ہو اور اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔

پھر خاصا وقت کسی طرح گزر گیا اور اس کے بعد مجھے ایک دم مٹی کا خیال آیا۔ اس کا خیال آتے ہی میرے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اگر یہاں ان دونوں آدمیوں کے اور بھی سامی ہوتے تو کہیں مونی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ دوسرے لمحے میں پھرتی سے اپنی جگہ سے نیچے اتر اور میں نے اپنے ٹرار کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ میں مختلف ٹراروں کے درمیان سے لھکتا ہوا اس طرف جا رہا تھا کہ دفعتاً ہی مجھے ایک کراہٹ سنا دی۔ یہ کراہٹ ایک ٹرار کے نچلے حصے سے ابھری تھی۔ میرے قدم ٹھک گئے۔ میرا ٹرار یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اور اب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ لیکن بہر حال انسان کی فطرت میں جس بہت بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ میں رک گیا اور کوشش کرنے لگا کہ دوبارہ مجھے یہ آواز سنانی دے تو میں کچھ کوشش کروں۔ یہ ایک دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن اب میں دھوکا کھانے کے لیے بھی تیار تھا یعنی اگر کوئی چالاکی سے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرے تو میں اس حملے کو

ناکام بنا سکوں۔ کراہی آواز مجھے دوبارہ سنانی دی اور وہ ٹرار بھی نظر آ گیا جس کے نیچے سے آواز ابھری تھی۔ روشنی کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں تھا۔ لیکن میں اس ٹرار کے نیچے جھک کر جھانکنے لگا۔ مجھے وہاں ایک انسانی جسم نظر آیا جو سیدھا سیدھا ٹرار کے نیچے پڑا ہوا تھا اور کراہی آواز اس کے حلق سے ابھری تھی۔

”تم کو کوئی بھی ہو باہر نکل آؤ۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”میں خود باہر نہیں نکل سکتا میری مدد کرو۔“

مجھے ایک بھاری آواز سنی دی اور میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ انہی دونوں میں سے کوئی ہو یا پھر کوئی تیسری شخصیت جو خود میرے لیے ہی خطرناک نہ ہو جائے۔ لیکن بہر حال بہت عرصے سے ذہن کسی ہنگامے کی تلاش میں تھا اور ہنگامہ قریب آ گیا تھا، تو میں اس سے گریز کر رہا تھا۔ اصولی طور پر اب تو یہی سوچنا چاہیے کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

چنانچہ میں اسے ابھرنے کے لیے تیار ہو گیا اور پھر میں نے ہاتھ برسا کر اس کے دونوں بازو پکڑ لیے اور اسے باہر کھینچا۔ وہ ایک قوی پیکل آوی تھا۔ عمدہ جسم کے سواٹ میں ملبوس لیکن تاریکی کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زخمی ہے۔ میرے ہاتھوں میں خون کی چھچھاہٹ ہو گئی تھی، تاہم ہیشکل تمام میں نے اسے باہر لے لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت دیکھنے لگا پھر دفعتاً ہی میرے ذہن کو ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا تھا۔ یہ چہرہ مقامی نہیں تھا بلکہ یہ کوئی مشرقی آوی ہی تھا۔ انتہائی پر رعب شکل اور اچھی جسامت کا مالک۔ میرے دل میں بھرپور کی لہر اٹھی اور میں جانتا تھا کہ یہ لہر کتنی کہانی کا آغاز ہے۔

اندازہ یہی ہو رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بار بار آنکھیں میچ رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔ لیکن اس میں ناکامی محسوس کر رہا ہو۔ وزنی آدی تھا اور پھر یہ احساس بھی تھا کہ زخمی ہے۔ کندھے پر لادوں گا تو پورا لباس خراب ہو جائے گا لیکن پہلی بات یہ انسان تھا اب مسٹر جو کچھ بھی ہے وہ جانے اور اس کا کام۔ لیکن اس وقت وہ ہمدردی کا مشق تھا، دوسری بات یہ ہے کہ اس کے چہرے نے مجھے متاثر کیا تھا۔ نقوش سو فیصدی مشرقی ہی تھے۔ ہندوستان یا پاکستان کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ اس احساس سے ذمہ داری اور بڑھ گئی تھی۔ میں نے جبکہ کراسے اپنے کاندھے پر اٹھالیا تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”آہ۔۔۔ تمہیں پریشانی ہوگی۔ م۔۔۔ میں، میرا وزن۔“

لیکن میں اسے لیے ہوئے اسے فرار کی جانب چل پڑا۔ بس یہ خوف تھا کہ کہیں وہ لوگ آ نہ جائیں جنہوں نے اسے زخمی کیا ہے۔ اس کے بدن سے اب بھی خون بہہ رہا تھا اور میں اسے محسوس کر رہا تھا لیکن بہر حال میں اسے لیے ہوئے فرار میں داخل ہو گیا۔

موت میرے بہت قریب ہو جائے گی۔“

موتی نے موفی سے کہا۔

”موتی فی الحال ہم خون روکنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں کر سکتے۔ تم یوں کر قوتور اس کا سہارا لے کر مجھے دو تاکہ میں زخم پر رکھ کر خون روکنے کی کوشش کروں۔ اس کے علاوہ میں گاڑی سے بریک آئل نکال کر لاتا ہوں، بریک آئل اس کا خون روک دے گا۔“ پھر میں اپنی کار کی جانب چل پڑا اور قوتور ڈیرے کے بعد دوبارہ وہاں پہنچ گیا۔ اس دوران موتی اس کے زخم کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ اس نے اس کا لباس اس جگہ سے بچاؤ دیا تھا اور کپڑا بچلا کر اس پر برابر رکھے جا رہی تھی۔ پھر میں نے اس پر بریک آئل ڈالا اور اس شخص نے اسے ہونٹ پیچ لے لیا۔ کیونکہ ایسے شدید زخم پر بریک آئل جو کام دکھاتا ہے وہ معمولی کام نہیں ہوتا۔ لیکن بہر حال ہم اس کا خون روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پھر اس کے بعد وہیں سے کپڑے لے کر اس کے زخموں کو باندھ دیا گیا۔ میں نے موتی سے کہا۔

”اب ان حالات میں ظاہر ہے ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہم ایسا کرو گاڑی بالکل قریب لے آؤ۔“

موتی نے اس شخص کو زخمی کیا ہے دوبارہ دیکھا جائے۔“

”جیک ہے۔“

موتی نے کہا اور جانی لے کر باہر نکل گئی۔ ہماری گاڑی فرار کے قریب آ کر رک گئی تو میں نے اس شخص کو گاڑی میں منتقل کیا اور اس کے بعد جس قدر برق رفتاری سے ممکن ہو سکتا تھا۔ ہم اسے لے کر چل پڑے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میرا خیال ہے اب میری صلاحیتیں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میرے دوست ایک آخری احسان اور کرو مجھ پر۔“

”ہاں کہو۔“

”کسی ہسپتال میں نہ لے جانا، اس کے علاوہ تمہارا جودل چاہے کرو۔ کیونکہ کسی بھی ہسپتال میں

موت میرے بہت قریب ہو جائے گی۔“

موتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ ویسے بھی اسے کسی ہسپتال میں لے جانا خود کو مصیبت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا اس شخص کے بارے میں۔ اگر اس کے بارے میں مجھے سے سوالات کیے گئے تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ لندن میں میری کوئی بھی حیثیت سہی لیکن دیار غیر تھا اور سخت قوانین کا شہر، چنانچہ مجبوری تھی۔ ویسے جہاں ہمارا قیام تھا وہاں دونوں جگہوں ہر طرح کے انتظامات تھے۔ اس سلسلے میں نہ میں بے وقوف تھا، نہ موتی، ہم ضرورتوں کو اپنے قریب ہی رکھنے کے عادی تھے۔

بہر حال میں نے ڈرائیو جگ بہت تیز رکھی۔

”وقت کے بعد موتی نے آہستہ سے کہا۔“

”یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔“

”اچھی دیر تک ہوش میں رہا یہ ہی بہت بڑی بات ہے۔“

”مجھ اندازہ ہوا کون ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے جواب دیا اور موتی خاموش ہو گئی۔

بہر حال ہم جس قدر برق رفتاری سے اپنا یہ سفر طے کر سکتے تھے۔ اس طرح اپنے گھر پہنچے۔ پھر رات میں جاگنے والے ملازموں کی مدد سے میں نے اسے اندر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ موتی جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے، چنانچہ وہ فوراً ہی دوسرے کمرے کی جانب دوڑ گئی اور ہم ایسی ادویات لے آئے جس سے فوری طور پر اسے مدد دی جاسکتی تھی۔ زخم صاف کیے گئے وہ گہری بے ہوشی میں چلا تھا۔ لیکن اسے مزید بے ہوش کرنے کے لیے میں نے اسے دو انجکشن دیے، پھر اس کے زخموں کو عارضی طور پر بند باندھ کر دیا گیا ویسے ایک نگاہ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی کے نشانات ہیں، لیکن بہر حال اس سلسلے میں فی الحال کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر اس شخص کو صورت حال معلوم ہوئی اور یہ پتا چل جاتا کہ اصل

کی آنکھ کھلی، اس نے جلدی سے مجھے جگایا اور بچر بولی۔

”میں بچن میں جا رہی ہوں۔ ذرا دیکھوں۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اس کے پاس چلے جاؤ۔“

”ہاں میں جا کر دیکھتا ہوں اسے۔“

اس کے کمرے میں پہنچ کر میں نے حیرت سے دیکھا وہ جاگ رہا تھا اور اُدھے دھڑے سمہری سے لٹکا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

”اوہو۔ میں نے اب تمہارا چہرہ دیکھا ہے۔ ویسے رات کو تمہاری گفتگو سنی تھی گو تم لوگ انگریزی میں بات کر رہے تھے لیکن اندازہ یہ ہوتا تھا کہ تم مشرق کے کسی ملک کے باشندے ہو۔“

”ہاں۔۔۔ ایسا ہی ہے۔۔۔“

”سنو میں تم سے تمہارے بارے میں کوئی تحقیقات نہیں کر رہا اور نہ ہی کسی طرح سے تمہیں مزید پریشان کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں زخم کم بخت ایسی جگہ ہے جس کے مجھے چلنے پھرنے میں بھی دقت ہو گی۔ البتہ اگر کر سکتے ہو تو میرا ایک کام کرو۔“

”بولو۔۔۔“

”تمہارا شکر یہ کہ تم مجھے ہسپتال نہیں لے کر گئے۔ ہسپتال میں میرے لیے خطرہ موجود ہے۔ مجھے دو تیز دھار چھریاں ایک الیکٹریک بیئر درکار ہے اور اس کے علاوہ جو دارائیں تم نے خون روکنے کے لیے میرے بدن پر لگائی ہیں وہ اور کچھ بیئر تین وغیرہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے پاس ان چیزوں کا معقول بندوبست ہے۔“

”تیز دھار چھریوں سے تم اپنے جسم میں گلی گولیاں نکالو گے؟“

”ہاں۔ وہ آہستہ سے بولا۔

”کچھ کھائی ہو، اس کے بعد یہ کام کر لیتا۔“

اس نے احسان مندی کے انداز سے مجھے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ وقت کے بعد موٹی باقاعدہ ناشتا لے کر آئی تھی۔ کافی اور اس کے ساتھ ہی ایک جگ میں

دودھ بھی لائی تھی، ملازموں کو اس نے نہیں آنے دیا تھا۔ حالانکہ گھر میں ہر کام کے لیے ملازم موجود تھے لیکن موٹی جانتی تھی کہ اسے کس وقت کیا کرنا ہے۔

ہم نے اسے سلاخ وغیرہ لگا دینے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی جواں مردی نے ہمیں متاثر کیا تھا۔ بڑے اطمینان سے اس نے سلاخ کھائے اور موٹی کا دیا ہوا دودھ کا گلاس پیا۔ پھر ہنستا ہوا بولا۔

”وہ دو پوائل انڈے جو اس پلیٹ میں رکھے ہوئے ہیں اصولی طور پر مجھے ملنے چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ایک کپ کافی۔ کیونکہ کافی کی یہ خوشبو مجھے دیوانہ کیسے دے رہی ہے۔ میں کافی کا شائق ہوں۔“

”ضرور ضرور۔“ میں نے کہا اور موٹی نے انڈے اس کی جانب بڑھا دیے انا شاید بڑی ہوئے کے باوجود وہ بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ بار بار شکر لانا کہ کسی کو بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن انجان میں حال احسان ہوتا ہے۔ اب میں شکر وغیرہ ادا نہیں کروں گا۔ آپ لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر میری ضرورت کا بندوبست کر دیں۔“

میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں نے موٹی کو اس کی ضرورت بتائیں اور موٹی گردن ہلا کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ الیکٹریک بیئر اور ضرورت کی ساری چیزیں لے آئی تھی۔ میں نے اس کے زخم کھولے اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”لینے رہو۔۔۔ لینے رہو۔ جو کام تم کرنا چاہتے ہو وہ میں کر لوں گا۔“ وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔

”تقدیر کی بات ہے۔۔۔ جی بھی تلاش کرنے سے بھی بہت اچھے لوگ نہیں ملتے اور بھی اتفاقاً مل جاتے ہیں اور وہ بھی ایسے وقت جب انسان کوئی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہو۔ البتہ ایک کام کرو

میرے دوست!“

”متاؤ۔۔۔“

”یا تو کوئی کپڑا یا کاغذ یا ربڑ کا ٹکڑا مجھے دے دو

تاکہ میں دانتوں میں دالوں۔“

میں نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی اور اس کے بعد چھریاں گرم کر کے اس کے زخم پر مصروف ہو گیا۔ شکر تھا کہ کوئی گوست میں تو بے شک رہ گئی تھی لیکن اس نے ہڈیوں کو متاثر نہیں کیا تھا۔ میں نے دونوں ہلٹ نکال دیے اور وہ خاموٹی سے میری یہ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کی ہمت نے ہم دونوں کو بہت متاثر کر دیا تھا۔ پھر میں نے اس کے زخموں پر دوا میں لگائیں مجھے امید تھی کہ یہ دوا میں اس کے زخموں کو درست کرنے میں کارگر ہوں گی۔ ویسے بھی اس دوران اتنے تجربات ہو چکے تھے کہ بہت سی چیزوں سے واقفیت حاصل تھی لیکن بہر حال اس کی شخصیت ہمارے لیے بڑی پر عمر تھی اور ہم نے ابھی اس سے اس کے بارے میں معلوم نہیں کیا تھا۔ ہمیں احساس تھا کہ زخموں کی یہ تکلیف ابھی اسے بہت بے چین رکھتی تھی، چنانچہ ہم نے اسے ضروری اعتدالی تدابیر کے بعد گہری نیند سلا دیا اور پھر وہاں سے ہٹ گئے۔ میں اور موٹی اس کے بارے میں مسلسل گفتگو کرتے رہتے تھے۔ موٹی نے کہا۔

”جب بھی اس پر نگاہ پڑتی ہے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی بہت اچھے خاندان کا فرد ہے اور ایک اچھی شخصیت کا مالک ہے، چنانچہ میں بے چارے کی کیا کہانی ہے۔“

”معلوم ہو جائے گی لیکن اب مجھے تھوڑا سا وقت دو، میں ذرا غرائز کی خبر لے لوں بات کچھ بھی نہیں ہے لیکن ذرا غیر مناسب رہ گا۔“

”اور اگر کوئی خطرناک صورت حال پیش آگئی تو۔“ موٹی نے کہا اور میں مسکرا دیا۔

”اگر ایسی کوئی صورت حال پیش آئی تو میں اس سے نمٹ لوں گا موٹی!“ وہ ہنس پڑی تھی پھر بولی۔

”میں بھی چلوں؟“

اس کے اس انداز پر مجھے ہنسی آگئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”نہیں۔“

اس کے بعد موٹی خاموش ہو گئی تھی۔ تو میں نے اس سے کہا۔

”سب کچھ ٹھیک ہے موٹی! لیکن بہر حال وہ ہماری حفاظت میں ہے اور ہمیں اس پر نگاہ رکھنا ہو گی۔ میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گا۔“

موٹی نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی تھی۔ بہر حال میں چل بڑا۔ میرا اپنا خون آلود لباس بھی میری نشان دہی کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے موٹی سے کہا تھا کہ اسے جلا کر خاکستر کر دے تاکہ کوئی انٹی سیدی بات نہ ہو سکے۔ پھر میں یہ سفر چلے کر کے ٹرائنک پہنچا۔ ٹرائلوں کی دنیا خاموش تھی، عموماً ایک اینڈ پر ہی یہاں رش ہوا کرتا تھا۔ عام دنوں میں یہ ٹرائلوں کا قبرستان معلوم ہوتا تھا۔ بہر حال مجھے احساس ہو گیا کہ وہاں کوئی ایسا عمل نہیں ہوا جس سے یہ اندازہ ہو کہ میرے ٹرائر کی تلاشی وغیرہ کی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ جو چلے گئے تھے پھر واپس نہیں آئے۔ ویسے بھی میں نے ان کی خاصی مرمت کر دی تھی اور یہی طور پر وہ صرف دو ہی افراد تھے جو اس سلسلے میں عمل کر رہے تھے۔

ٹرائر وغیرہ کی اچھی طرح صفائی وغیرہ کرنے کے بعد اور ہر طرح سے نشانات مٹانے کے بعد میں پھر واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ پھر رات کو ہم نے اس سے تفصیلی ملاقات کی تھی۔ اسے بھی ہر طرح کی سہولت دی گئی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ رات تک وہ بالکل درست نظر آنے لگا تھا۔ اس نے محبت بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو لوگ بے لوث اور بے غرض کسی کی مدد کرتے ہیں ان کا شکر یہ ادا کرنا ان کے ساتھ نا انصافی ہوتی ہے آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو احسان کیا ہے میں بالکل نہیں کہتا کہ میں اس کا صلہ دوں گا آپ لوگوں کو لیکن میں بہت اچھے انداز میں آپ کو یاد رکھوں گا بے حد احسان مند ہوں آپ کا۔“

”نہیں کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے آپ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا تعلق ایشیا کے کسی ملک سے ہے۔“

حاضر ہیں۔“

کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ میں بھی تقدیر پر گرفت میں تھا اور وقت کے چلنے کا ہار ہاتھ۔ پھر میں نے ایک بہت ہی گھٹیا راستہ اختیار کیا۔ ضرورت رشتہ کے اشتہارات میں ایک ایسا رشتہ طلب کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ لڑکی کے اہل خاندان لندن میں قیام کر رہے ہیں۔ اچھی صنعتوں کے مالک ہیں۔ لڑکے کو لندن لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے سوچا کوشش کر لی جائے تو لڑکی نہیں لے رہی تو کم از کم تھوڑا سا وقت اسی انداز میں گزار لیا جائے، بس جناب رابطہ قائم کیا کچھ لوگوں سے ملا انہوں نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا اور اس کے بعد بقیہ معاملات طے ہوئے۔ نکاح ہوا اور مجھے یہاں لے آ گیا۔ لیکن کچھ وقت قیام کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ لوگ ابھی یوزین کے مالک نہیں اور غلط کاروبار کرتے ہیں۔ ساری باتیں اپنی جگہ نہ بنا جو وعدے تو میں اپنے وطن میں بھی کر سکتا تھا اگر اپنے عزیز کو فروخت کر دیتا، ایسا کوئی کام میرے لیے ناقابل غور تھا۔ بلکہ مجھ کو عرصے کے بعد انہوں نے مجھے اپنی لائن پر لگانے کی کوشش کی اور میں انہیں ناکارہ اس سلسلے میں سختیاں بڑھتی گئیں مجھے بتایا گیا کہ اس کے بغیر میں ان کا دوست نہیں رہ سکوں گا۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے اور دو ترقی دہشتی میں بدل گئی۔ پھر یہ تشدد کیا جانے لگا۔ ہر طرح سے مجھے اپنی راہ پر لانے کی کوشش کی گئی لیکن میں نے قبول نہیں کیا اور بات حد سے آگے نہ نکل گئی۔ ان لوگوں نے مجھے قید کر دیا۔ بھوکا پیاسا مارنا شروع کر دیا لیکن کچھ بھی تھا میں یہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکا، پھر صبح پا کر ان کی گرفت سے نکل گیا۔ اصل میں وہ دہرے خوف کا شکار تھے۔ انہیں یہ احساس تھا کہ میں ان کی اصل شخصیت سے واقف ہو گیا ہوں اور اب انہیں کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ چنانچہ ان لوگوں نے میرے خلاف بھرپور طریقے سے کام شروع کر دیا اور غالباً یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے ہلاک کر دیا جائے بس یوں مجھے نیچے سے ساری بھاگ دوڑ اور گولیوں کے یہ ختم

اسی حماقت کا نتیجہ ہیں جو میں نے کر ڈالی تھی۔ اب آپ بتائیے کیا تحریر یہ انداز۔۔۔ اپنی اس داستان کو مظلومیت کی داستان بنا کر سنایا جاسکتا ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

موجود ہے آپ مکمل طور سے تندرست ہو جائیں اور بالکل ٹھیک ہو جائیں تو ہم آپ کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کریں گے اور جس طرح بھی بنی پڑا آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں گے۔

”ٹھیک ہے۔ اب کسی قسم کا تکلف کا اظہار کرنا خود اپنے آپ پر ہنسنے کے مترادف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اس سبکی کا صلہ دے جو آپ کر رہے ہیں۔“

بہر حال کہانی ایسی نہ تھی۔ جس پر کوئی شبہ کیا جاسکتا سوائے اس کے ہم لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ان جلسہ سازوں سے باقاعدہ مگر امیں یا پھر ایسا نہ کریں۔ موٹنی سے اس سلسلے میں بات ہوئی تو اس نے کہا۔

”دیکھو ہمیں یہاں رہنا ہے اور کچھ وقت سکون سے گزارنا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فرض بھی کہتا ہے کہ یوں کیا جائے اور ان لوگوں کے خلاف ایک محاذ بنائیں تاکہ دوسرے بھولے بھالے لوگ ان کے جال میں نہ پھنسیں۔ لیکن بات وہی آجانی ہے کہ دریا میں رہ کر مگر کچھ سے بیزاریا ہو جائے تو یہ کوئی بین الاقوامی کردہ لکنا ہے لڑکوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ لڑکیوں کو بھی اسی طرح جال میں پھناتے ہوں گے آج کل یہ دبا تو عام ہو چکی ہے کہ بے روزگار لڑکوں کو اس طرح کے جھانے دیے جاتے ہیں اور سبز باغ دکھائے جاتے ہیں کہ ایک مظلوم لڑکی سے شادی کر لی جائے اور انھوں کو مالے جائیں۔ بے روزگار نوجوان جھانے میں آ جاتے ہیں لیکن نتیجہ جو ہوتا ہے وہ سامنے ہے لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔

”میں سمجھ رہا ہوں تم ٹھیک ہی کہتی ہو لیکن بہر حال ابدال شاہ کی ہمیں مدد کرنا ہوگی۔ ابھی تو بے چارہ زخمی ہے کس قدر نشان و دار توقت ارادی کا مالک ہے۔ اس بات پر تجربت ہوتی ہے لیکن کچھ لوگ تقدیر کے کھوٹے ہوتے ہیں اور تقدیر ان کا ساتھ نہیں دیتی تاہم ہم اپنی اوقات کے مطابق اس شخص کی مدد کریں

گے اور جاتا بھی کیا ہے۔“

موٹنی بھی اس بات پر متفق ہو گئی تھی، ابدال شاہ مجموعی طور پر ایک خوش مزاج شخص تھا اس کی عمر بھی چھتیس سینتیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ شخصیت بھی خاصی دلکش تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑا باہمت آدمی تھا نہ ہی اس نے میرے بارے میں کسی خاص شخص کا اظہار کیا تھا۔ بس اپنی اپنی باتیں ہوا کرتی تھیں اور موٹنی نے ایک دن اس سے اس کی بیوی کے بارے میں پوچھا تو وہ اچھے ہوئے انداز میں بولا۔

”فرخندہ بری عورت معلوم نہیں ہوتی حالانکہ سب کچھ اس کے ذریعہ ہی کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ وہ بھی ان کے ہاتھوں مجبور ہے۔ اس بات کے امکان بھی ہو سکتے ہیں مسٹر ندیم کہ اسے بھی نہیں سمجھ کر گھار کر لایا گیا ہو اور اس کے بعد انہوں نے اسے اپنے راستے پر لگا لیا ہو اس بات کے قوی امکانات ہیں۔“

”آپ کی اس سے باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔“

”ہاں۔“

”آپ کے ذہن میں کبھی اس کے لیے کچھ نہیں جدے نہیں ابھرے۔“ موٹنی نے سوال کیا وہ سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔

”لیکن یہ احساس مجھے ہمیشہ رہتا ہے کہ میں اس کے ذریعے شکار کیا گیا۔“

”اس سوچ کے باوجود جو آپ کے ذہن میں ہے۔ یعنی یہ کہ ہو سکتا ہے وہ بھی مجبور ہو۔“

”یہ تو صرف ایک سوچ ہے اس کی کوئی حقیقت تو سامنے نہیں آئی۔“

”آپ کے دل میں کبھی یہ تصور ابھرتا ہے کہ آپ اپنی بیگم سے دوبارہ ملاقات کریں۔“ وہ ہنس پڑا۔

”میرے سالے صاحبان میرے ذہن میں یہ تصور ابھرنے دیں تب ہی تاہیں سے نکل کر کیا صورت حال پیش آئے میں تو اس بارے میں کچھ بھی

نہیں جانتا۔“

ہم لوگوں نے اس سے مذاق کیا تھا۔ بہر حال اس میں کوئی مشکل نہیں۔ یہ ایک انسانی مسئلہ تھا اور ان حقیقتوں سے گریز نہیں کیا جاسکتا تھا جو اس کی ذات سے وابستہ تھیں۔

کافی دن ہو چکے تھے اسے یہاں اور اب وہ صحت مند ہو گیا تھا۔ پھر ایک رات جب ہم نے اسے ناشتے کے لیے طلب کیا تو وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ البتہ اس کے لیے عینے پر ایک چھوٹا سا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ملازم نے وہ کاغذ لا کر ہمیں دیا اور میں نے حیرت سے اسے کھول کر پڑھا لکھا تھا۔

”میں اب بھی شکر یہ ادا نہیں کروں گا۔ ہاں دعا ہے کہ آپ لوگ ہمیشہ خوش رہیں۔ بس ٹھیک ہو گیا ہوں چار باہوں اور کیا کہوں۔ ابدال شاہ۔“

”میں نے طبی سائنس کے ریسرچ کی طرف دیکھا تو وہ دم مسمیٰ مگر امیت کے ساتھ ہوئی۔“

”ظاہر ہے وہ ہمیشہ تو ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ تاہم اچھا انسان تھا۔“

پھر رفتہ رفتہ ہم اسے بھلانے میں کامیاب ہو گئے۔ ابتدا میں تو کچھ دن اسی کی باتیں کرتے رہے تھے لیکن اسے بہر طور جانا تھا کوئی جواز نہیں تھا اس کا میرے پاس رہنے کا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر رہنا چاہتا تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ بے گھر رہنے کے سہارا تھا اور اسے اپنے گھر میں جگہ دی جاسکتی تھی۔

تقریباً پندرہ سولہ دن گزر گئے۔ اب وہ ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکا تھا۔ ہمارے معمولات وہی تھے اپنے آپ کو حالات میں ضم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت سے خیالات دل میں آتے تھے لیکن مجبوریاں دامن گیر ہو گئی تھیں اور ہم یہ سوچتے تھے کہ بس ٹھیک ہے زندگی کے ہنگاموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اب زندگی کا سکون حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن یہ تجربہ اب میرے لیے نیا نہیں تھا کہ وقت اپنے

فیصلے خود کرتا ہے اور انسان کتابی سوچ لے منصوبہ بنائے سب حماقت ہوتی ہے اسے وقت کے ہاتھوں کھیلنا پڑتا ہے۔

معمول کے مطابق ہم لمبی ڈرائیو پر نکل گئے تھے اور لندن کے ایک نواحی قصبے میں ٹھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد وہاں سے واپس لوٹ رہے تھے۔ واپسی میں شام ہو گئی تھی موسم بھی کافی خراب تھا۔ آسمان سے کھر اترتی چلی آ رہی تھی۔ دن میں بھی سورج نہیں نکلا تھا اور سارا دن بالی چھائے رہے تھے۔ وہ لمبی سڑک جو چوکی اور شفاف تھی سناں پڑی ہوئی تھی اور اس پر کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ پھر ایک موڑ سے گزر رہے تھے۔ قرب و جوار میں پہاڑیاں اور بزرگزار ابھرے ہوئے تھے کہ اچانک ہی ایک درے کے درمیان سے کوئی دوڑتا ہوا سڑک عبور کرنے لگا۔ کیونکہ وہ اچانک ہی دوڑ پڑا تھا یا کہیں سے دوڑتا ہوا آ رہا تھا اور دوڑ کے بالکل قریب تھا اس لیے میں کار کو کنٹرول نہ کر سکا اور وہ شخص ہماری کاری زد میں آ گیا۔

میں نے جلدی سے کار روک دی میں نیچے اتر آیا تھا کہ اس سمت سے جدھر سے وہ بھاگ کر آ رہا تھا تین آدمی دوڑتے ہوئے آگے آ گئے اور انہوں نے اندھا دھند قازبک کر دی۔ مجھے فوراً ہی پیٹھ جانا پڑا۔ ورنہ شاید وہ تو سڑک پر گرے ہونے کی وجہ سے بچ جاتا میں ان گولیوں کا شکار ہو سکتا تھا۔ گولیاں کار کے قریب سے نکل گئی تھیں اس شخص نے زمین پر لوٹ لگائی اور کار کے دوسرے حصے میں آ گیا۔ دوڑنے والے بھی قریب آتے جا رہے تھے۔ اس شخص نے سیدھے کھڑے ہو کر مجھے دیکھا اور پھر موٹنی کو دیکھا۔ ہم نے بھی اسے ایک لمحے میں پہچان لیا تھا یہ ابدال شاہ ہی تھا۔ ظاہر ہے ہم دونوں کی جو کیفیت ہوئی چاہے کئی ہی ہوئی۔ اس نے بھی ہمیں پہچان لیا تھا۔ پھر وہ جلدی سے بولا۔

”مسٹر ندیم۔۔۔ مسٹر ندیم یہ بریف کیس آپ

ستم ظریفی

فرین میں سفر کے دوران ایک بچہ دروازے کے قریب کھل رہا تھا۔ اس دوران لگت چکر بچہ گیا۔ اس نے بچے کے باپ کو ہدایت کی کہ وہ اس کا خیال رکھے ورنہ کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔

”اس سے زیادہ افسوس ناک حادثہ کیا ہوگا۔“ باپ نے جواب دیا: ”اس بچے کے علاوہ یہ تینوں بچے بھی میرے ہیں۔ میری بیوی اسپتال میں داخل ہے۔ میں اپنی پیار ساس کو دیکھنے کے لیے جا رہا ہوں۔ ایک بچے نے کھڑکی میں ہاتھ دبا کر اٹلی ڈھکی کر لی ہے۔ دوسرے نے میرا بٹو باہر پھینک دیا۔ تیسرے نے گت چایا ہے اور اس پر ستم ظریفی ہے کہ ہم افراتفری میں اس وقت غلط فرین میں سفر کر رہے ہیں۔“

☆

دورانِ نشی

”ہیلو آفائرشین۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ فرمائیے۔“

”دیکھیے میں نے حال ہی میں اپنا باغیچہ سنوارا ہے اور اس میں بیش قیمت پودے لگائے ہیں۔“

”آگ کہاں لگی ہے۔؟“

”کچھ پودے تو بالکل ہی تباہ ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں حاصل کیا ہے۔“

”یہ فائر انشین ہے جناب! کسی گل فروش کی دکان نہیں ہے۔“

”معلوم ہے مجھے۔ ذرا غور سے میری بات سنئے۔ میرے پڑوسی کے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ جب آپ لوگ آگ بجھانے کے لیے یہاں آئیں تو میرے باغیچے اور پودوں کو نقصان پہنچائیں۔“

مجھے واپس کیے پھر اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

”چلو۔“

ادھر وہ اسی درے کی جانب مڑ گئے جو سڑک کے دوسری سمت کے نشیب میں تھا جب وہ تینوں لگا ہوں سے اوجھل ہو گئے تو میں نے گہری سانس لے کر موٹی کو دیکھا۔ ڈرائیوگ سیٹ پر آ بیٹھا اور اس کے بعد کار اشرارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم دونوں ساکت تھے۔ حادثہ بڑا عجیب اور حیران کن تھا۔ کافی فاصلے تک ہم اس بات کا جائزہ لیتے رہے کہ ہمارا اتفاق تو نہیں کیا جا رہا۔ لیکن اس کا دور دورہ تک امکان نظر نہیں آیا۔ البتہ اب میرے ذہن میں ایک کریدی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے سرسراہٹ آواز دیا

”وہ رابطہ کیس محفوظ ہے؟“

”ہاں کل نے پیچھے سیٹ کے نیچے ڈال دیا ہے۔“

”بریفنگس میں کیا ہو سکتا ہے؟“

”ہو سکتا ہے ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلوماتی کاغذات ہوں۔“

”کن لوگوں کے بارے میں؟“

”میرا مطلب ہے وہ جو یہ ناجائز کاروبار کرتے ہیں بلکہ یوں کہو کہ ابدل شاہ کے سرسراہٹ والے۔“ موٹی نے کہا اور مسکرا دی۔

”کمال ہے بڑی خطرناک سرسراہٹ ملی اس بے چارے کو۔ لیکن بے خوف آدمی ابھی تک جنجال میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ یہاں سے کہیں بھاگ کیوں نہیں جاتا۔“

”یہ تو دوسری بات ہے۔“ موٹی بولی۔

”نہ جانے کیوں موٹی! امیری چھٹی حس مجھے احساس دلا رہی ہے کہ ابدل شاہ کا کس وہ نہیں ہے جو اس نے ہمیں بتایا۔ یہ ویرانوں میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

سے حشکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ کار کے قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے اور موٹی کو گھورا۔ پھر ان میں حشکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ کار کے قریب پہنچ کر انہوں نے مجھے اور موٹی کو گھورا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

”ہمارا تعلق مقامی انتظامیہ سے ہے۔ تم کون ہو؟“

”برطانوی ہوں۔ سیمیں رہتا ہوں۔ اس سڑک سے گزر رہا تھا کہ وہ شخص بھاگتا ہوا آیا اور میری کار سے ٹکرایا۔ مجھے کار روکنی پڑی اور اس کے بعد میں اس خیال سے نیچے اتر آیا کہ اسے دیکھوں کہ وہ کونسی تو نہیں ہو گیا کہ اچانک ہی گولیاں چلنے لگیں اور مجبوراً مجھے زمین پر بیٹھا پڑا۔ وہ سڑک کے دوسری جانب اتر گیا۔ کون تھا کیا تھا یہ میں بالکل نہیں جانتا اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں چناں اگر وہ کوئی مجرم تھا تو کم از کم مجھ سے اہل کا کوئی تعلق نہیں تھا۔“

”تمہارے کاغذات ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”دکھاؤ۔“

اس نے کہا اور میں نے بڑے اطمینان سے کار کی انشینی سے کاغذات نکال کر اس کے سامنے پیش کر دیے۔ وہ جھک کر ان کاغذات کو دیکھنے لگا۔ باقی دو افراد مجھ پر پرتول تانے لگے۔ وہ بولے تھے اس نے کہا۔

”شہزادہ ندیم۔۔۔“

”جی۔“

”مشرقی ہو۔“

”جی ہاں۔“

”کہاں کے باشندے ہو؟“

”سو فیصد برطانوی۔“

”اس سے پہلے۔“

”اس سے پہلے بھی برطانوی کا باشندہ ہوں۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ کاغذات

رکھ لیجے پلیز اسے جلدی سے سیٹ کے نیچے ڈال دیجیے۔“

اس نے چہرے کا ایک سیاہ رنگ کا پتلا سا بریف کس کار کی کھڑکی سے اندر پھینک دیا اور اس کے بعد سڑک کے دوسری سائیڈ نشیب کی طرف چھلانگ لگا دی تا قیاب کرنے والے دوڑے آ رہے تھے۔ انہوں نے بھی سڑک عبور کی۔ پھر ان میں سے ایک وہاں رک گیا اور دوسرے کے نشیب کی طرف دوڑے چلے گئے۔ رکنے والے نے میری طرف پرتول تان رکھا تھا۔ اور ٹھوڑا سا ہٹ کر مجھے اور موٹی دونوں کو روک رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔ عجیب سی شکل و صورت کا آدمی تھا چھوٹی چھوٹی آنکھیں طوطے کی طرح حشری ہوئی ناک نیلے نیلے پارک ہونٹ آنکھوں میں بے پناہ چمک نظر آ رہی تھی۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ جب کہ اس کے باقی دونوں ساتھی سڑک کے نشیب میں گولیاں برسائے تھے۔ ایک لمحے کے لیے چونکہ حواس معطل ہو گئے تھے اور کوئی فیصلہ فوری طور پر نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے میں ساکت کھڑا اس شخص کو گھورتا رہا۔ تین چار پانچ منٹ گزر گئے۔ تو میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

”بھائی! میں تو ایک راہ گیر ہوں آپ لوگوں کا کوئی مسئلہ ہے تو آپ مجھے کیوں روکے ہوئے ہیں۔“

”خاموش کھڑے رہو۔“ وہ غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں دیر ہو رہی ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ میری مزمر میرے ساتھ ہیں اور ہم جلدی شہر پہنچنا چاہتے ہیں موسم خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا ہے۔“

”اگر بیکواس بند نہ کی تو میں تمہاری کھوپڑی میں گولی اتار دوں گا۔“

وہ شخص خاصا جاہل معلوم ہوتا تھا اور کافی غصے میں نظر آ رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد نشیب کے دونوں آدمی واپس آ گئے۔ ان کے چہروں

ابن غلام

محمد سلیم گرد

ایک ایسے شخص کا قصہ جس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں اس کے ماں باپ بھی پروان چڑھ چکے تھے۔ وہ غلام ابن غلام تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس کی اولاد آزاد ہو اس کے پاؤں میں کسی قسم کی زنجیر نہ ہو

اس شمارے کی ایک غور و فکر کرنے والی تحریر

کہاں۔ باہر کی دنیا کی دنیا میں اس کا کوئی عزیز واقارب نہیں تھا۔ اس کو کسی فضاؤں میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والدین بھی اس کو کسی کے بے دام غلام تھے۔ تیس سالہ محمد بخش کی تابعداری و فرمانبرداری کی تربیت ماں کی گود سے لے کر محمد بخش کی پانچ بیٹنیں ملک عبدالعزیز خان کے خاندان کی خدمت کرتی چلی آ رہی ہیں۔ آٹھ سال قبل ایک سانولی سلونی زاہدہ نام کی ایک نوجوان لڑکی کہیں سے

تو ملک عبدالعزیز خان کی کوئی بیٹی تھی۔ مگر تیس سالہ محمد بخش کی بات الگ تھی اور محمد بخش ملک عبدالعزیز خان کے خاندانی ملازم تھا۔ یوں کہیں لگے جابے جا نہ ہو گا کہ جدی پشتی غلام تھا۔ باقی تمام ملازمین جڑی تھے کوئی دو سال نکالنے کے بعد کہیں اور چلا گیا تو کوئی ایک سال کا کرنے بعد ملازمت چھوڑ گیا۔ آنے جانے کا عمل جاری تھا لیکن محمد بخش کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ جائے بھی تو جائے

کی کوشش سے میں نے یہ تالا کھول لیا۔ بریف کیس میں ایک فائل رکھا ہوا تھا اور اس فائل میں کچھ کاغذات تھے لیکن فائل کھولنے میں میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ فائل کے اندرونی حصے میں خاص قسم کا احتیاطی کر اس بنا ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ فائل انتہائی اہمیت کی حامل تھی اور پھر اٹاک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ویسے بھی ایک بڑا محفوظ ادارہ تھا اور اس کے کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی باہر نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے کاغذ کھولا اس پر ایک بہت ہی انوکھی تحریر لکھی ہوئی تھی جبکہ جگہ نشانات لگے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ فارمولے جو ایک مخصوص انداز میں صرف نشانات کے ذریعے واضح کیے گئے تھے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے خاص قسم کے ایسی فارمولے اسی انداز میں تحریر کیے جاتے ہیں اور سائنس دانوں کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے جو اس سلسلے میں صرف چند لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔ لیکن حیران کن بات یہ بھی کہ ان کا تعلق میرے وطن سے تھا۔ اور وطن عزیز کا پتھر کا ایک ٹکڑا بھی مجھے اپنی زندگی کی ہی امتداد عزیز تھا۔ یہ احساس ان حالات میں اور وطن سے دور غیر ملک میں رہ کر بھی میں اپنے دل سے نکال نہیں سکتا تھا۔ بلکہ وطن کی یاد وطن کا احساس میرا جہاز حیات تھا۔ میں جلدی جلدی کاغذات پلٹتا رہا کچھ الفاظ انگریزی زبان میں لکھے گئے تھے وہ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ یہ صرف اشاریاتی الفاظ تھے لیکن ان کی ترتیب بنی تھی اور اس ترتیب سے یہ احساس ہوتا تھا کہ یہ میرے ملک کے ایسی راز ہیں۔ ایسی راز کی یہ فائل ابدل شاہ کے پاس اور کچھ لوگ اسے حاصل کرنے میں سرگرداں تھے۔ مؤقی بھی میرے ساتھ ساتھ یہ کاغذات دیکھ رہی تھی اور مجھے اس بات پر خوشی ہوئی کہ وہ بھی اس قدر ذہین تھی کہ صورت حال کو سمجھ سکی تھی۔

(جاری ہے)

”مطلب یہ کہ اس نے ہمیں کوئی بہت ہی خوب صورت کہانی سنا دی ہوگی اور ہم اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔“

”ہاں کہہ تو سکتے ہیں لیکن اگر اس نے کوئی جھوٹی کہانی ہمیں سنا دی تو اس کا مقصد ہے کہ بڑا فن کار آدمی تھا۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔ ویسے وہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔“

”بریف کیس میں نہ جانے کیا ہے۔“

”وہ شخص جس طرح ہمیں بتائے بغیر ہمارے گھر سے چلا آیا۔ اس کے بعد ہم تو یہ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارے اور اس کے درمیان اخلاقی قدریں برقرار رہ گئی ہیں۔“

”مطلب۔۔۔۔۔“

”مطلب یہ کہ ہم بریف کیس کھول کر دیکھیں گے۔“

مؤقی نے میری بات سے اتفاق کیا تھا۔ پھر وہ بولی۔

”لیکن وہ آئے گا ضرور۔۔۔۔۔“

”ظاہر ہے پتا نہیں اس نے ان کے خلاف کیا کیا شواہد جمع کیے ہیں۔“

پھر ہم خاموش ہو گئے اور آخر کار اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ ذہن پر ایک عجیب سا تاثر تھا۔ کافی وقت گزر گیا۔ گھر پہنچنے کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کیا اور پھر اندرونی گھر سے آ بیٹھے۔ بریف کیس کے کاغذات دیکھنا ضروری تھے۔ چڑے کا بہت ہی پتلا سا بریف کیس بے حد خوب صورت تھا اور اس میں خاص قسم کا تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ پہلے بھی میرا واسطہ ایک ایسے ہی بریف کیس سے پڑ چکا تھا۔ میں اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا اور میں کامیاب ہو گیا۔ اس تالے کے لیے جانی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی نہ ہی اس پر نبر تھے بلکہ کچھ کرٹل اس پر لگے ہوئے تھے اور انہی کی ترتیب سے تالا لگ جاتا تھا۔ تھوڑی



آ کر کوشی میں ملازمت کرنے لگی۔ اس کا بھی دنیا میں کوئی نہ تھا۔ والد کے مرنے کے بعد رشتے کے ایک چچا کے گھر میں رہنے لگی۔ چند مہینے رشتے کے چچا کے گھر میں رہی پھر رشتے کی چچی کے آئے روز کے طعنوں اور جھڑکیوں سے تنگ آ کر ملک عبدالعزیز خان کے بنگلے میں ملازمت کرنے لگی۔ زاہدہ پر انہری پاس لگی اور بے حد پین لڑی تھی۔ محمد بخش اسارت اور غور و فکر کا اس کا دل میں کوئی نہیں تھا۔ والدہ تو اس کے بچپن میں فوت ہوئی تھی۔ جب کہ والد کا سایہ دو سال قبل اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ جب زاہدہ نے اسارت خور و مجرّم محمد بخش کو دیکھا تو پہلی نظر میں فریقت ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ پسند پھری لگا ہوں نے محمد بخش کو بھی اپنے دام کا اسیر بنالیا۔ نئی سوچ، نئی اسکول نے محمد بخش کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا تھا۔ جس سے وہ زاہدہ کی آمد سے قبل بے خبر تھا۔ ایک دن زاہدہ نے محمد بخش سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”یوں کب تک ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر دل بہلاتے رہیں گے، آپ مرد ذات ہیں ملک صاحب سے بات کریں۔“

”دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ ابھی ملک صاحب سے اس ضمن میں بات کروں لیکن خدشہ ہے کہ ڈانٹ سنتا نہ پڑے۔“ محمد بخش نے اداس لہجے میں کہا۔

”اپنے اندر جرأت پیدا کرو محمد بخش! ورنہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ میں ملک کی ملازمت ہوں اور آپ بھی اس گھر کے ایک خاندانی ملازم ہیں۔ میرا ہاتھ مانگنا گستاخی یا بدتمیزی نہیں ہے۔ بلکہ تیرا حق ہے۔“ زاہدہ نے حوصلہ افزا انداز میں کہا۔

”تم نہیں جانتی زاہدہ تیری بات اور ہے میری اور۔ میں تباہ کاری و فساد کاری کی گود میں پل کر جوان ہوا ہوں۔ ملک صاحب اور اس کے اہل و عیال کو دیکھ کر میری بوٹی بند ہو جاتی ہے۔ صرف حکم سننے اور حکم بجالانے کی قوت بیدار ہو جاتی ہے۔“ محمد بخش نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

”تم میں ہمت نہیں، تو پھر میں بات کروں؟“ زاہدہ نے طنز پر مگر شوش بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں نہیں، میں خود بات کروں گا۔“ محمد بخش نے فوراً کہا۔

زاہدہ کے آئے دن کے طعنوں نے آخر ایک دن محمد بخش کو جرأت عطا کی۔

☆☆☆

ملک عبدالعزیز خان کی پہلی بڑی تھی۔ چار بچے اور ان کے بچے جو اس وسیع و عریض کوشی میں رہائش پذیر تھے اور ان کی خدمت کے لئے ملازموں کی ایک فوج ہر وقت لعل و حرکت میں رہتی تھی۔ جب کہ ملک عبدالعزیز کی دو بیٹیاں بھی تھیں۔ جو بیاہ کرنے کے بعد سراسر سدھار گئی تھیں۔ بیٹنہ سالہ ملک عبدالعزیز خان کی کئی زمین و جائیداد کا مالک تھا۔ خود بڑھاپے کی وجہ سے بنگلے میں گوشہ نشین تھا مگر اس کے چاروں فرزندوں نے ذمہ داری اٹھائی ہوئی تھی۔ جوانی کے دنوں میں ملک عبدالعزیز نے اپنی اپنی سخت کیر واکر مزاج ہوا کرتا تھا۔ مگر وطن کی محبت کے ساتھ ساتھ یہ سخت گیری و اکڑ مزاجی ماند پڑ چکی تھی۔ تاہم لوگ اس سے بات کرتے ہوئے اب بھی گھبراتے تھے۔ ملک عبدالعزیز کا فیصلہ اٹاؤ آخری فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت شام کا وقت تھا ملک عبدالعزیز خان کی کوئی سہ ماہیہ زار پر بھیجی ہوئی ایک کبری پر دروازہ شام کے ایک تازہ ادا کا مطالعہ کرنے میں مگن تھے۔ اس پاس کوئی نہیں تھا۔ چند جھانپنے پر ملک عبدالعزیز کو چاہئے کی طلب محسوس ہوئی تھی اور محمد بخش کو آواز دے کر ایک کپ تازہ چائے کا حکم دیا تھا۔ موقع مناسب تھا دل کی بات کہنے کا۔ اس لئے محمد بخش نے آٹا کاٹا چائے تیار کی اور ملک عبدالعزیز خان کے سامنے میز پر رکھ دی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ یہ جملہ بھنک ادا کیا۔

”سرکار! میں آپ سے کچھ۔۔۔۔۔ کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔“

یہ سنتے ہی ملک عبدالعزیز خان نے نظریں اخبار پر جمائیں۔

”میرے ہاتھ میں ضرور کروں گا۔ مگر مجھے ایک فی صد بھی امید نہیں ہے۔“ آخر میں محمد بخش نے اداس لہجے

”ہاں! کچھ نہیں کیا مانگنا ہے۔“

”میرے ہاتھ میں زاہدہ کا ہاتھ دے دیجئے۔“

”میں نے تیرے والد کا بیاہ کر لیا تھا لیکن اس نے یہ زبان خود بھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ تم خود اپنی شادی اور وہ بھی لڑکی کا نام لے کر اظہار کر رہے ہو، میں ضرور تیری شادی کروں گا۔ تم دونوں اس کوشی میں رہتے ہو۔ مزید قریب ہو جاؤ گے۔ ایسی بات ہے، عشق کے منہ زور کھوٹے کو شادی کا کام ڈالنا میرا فرض بن گیا ہے۔ اچھا ہوا تم نے ہمت سے کام لے کر زاہدہ کا ہاتھ مجھ سے مانگا معلوم نہیں میری بھرتی میں یہ عشق کیا رنگ دکھاتا۔“

آخر میں ملک عبدالعزیز خان نے مسکراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ”سب کچھ ملک عبدالعزیز خان کی زبان سے سننے کے بعد محمد بخش سر تا پا خوشی سے جھوم اٹھا۔“

☆☆☆

چند دنوں بعد دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ روٹی، کپڑا امکان کا مسئلہ نہ تھا۔ اچھا کھانا کھانے کو مل جاتا۔ مناسب کپڑا پہننے کو ملتا۔ سر چھپانے کے لئے ایک کمرہ ملا تھا۔ شادی کے دو سال بعد زاہدہ کی گود ہری ہوئی۔ قدرت نے ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ جس کا نام آزاد رکھا گیا۔ وقت گزرتا رہا اب آزاد پانچ سال کا تھا ہر والدین کی طرح ان کی یہ خواہش تھی کہ ان کی اولاد زور و تعلیم سے آراستہ ہو کر معاشرے میں ایک اچھا مقام و رتبہ حاصل کر سکے۔ مگر انہیں یہاں اپنی یہ جائز خواہش پوری ہونے کی توقع نہ تھی۔ یہاں ایک ابن غلام کا تعلیم حاصل کرنا ناممکن تھا۔

”آپ ملک صاحب سے بات کریں۔“ ایک زاہدہ نے کہا۔

”بات تو میں ضرور کروں گا۔ مگر مجھے ایک فی صد بھی امید نہیں ہے۔“ آخر میں محمد بخش نے اداس لہجے

میں کہا۔ ”میرا ایک دن محمد بخش نے ملک عبدالعزیز خان سے عاجزانہ لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”مالک!۔۔۔!“ مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔ امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔

”ہاں! کچھ! ملک عبدالعزیز خان نے کہا۔

”میرے بیٹے کو اسکول میں داخل کر دیجئے۔“ محمد بخش نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

یہ سنتے ہی ملک عبدالعزیز خان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات چھانے لگے۔ جیسے اس نے محمد بخش کے لیوں سے درخواست و فریاد میں ڈوبے الفاظ نہیں بلکہ کوئی گستاخ آمیز بات سنی ہو۔

”جب تو نے زاہدہ کا ہاتھ مجھ سے مانگا میں نے زاہدہ کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیا۔ تیرے والد کی شادی بھی میں نے کرائی تھی۔ شادی کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے لیکن تعلیم حاصل کرنا ہر انسان کے لئے ضروری نہیں ہے۔ آج تم یہ درخواست مجھ سے کر رہے ہو کہ میں تیرے بیٹے کو تعلیم دلاؤں، یہ نہیں ہو سکتا اور ایک خاندانی ملازم کے فرزند کے لئے تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور نہ ہی تیرے والد نے بھی تیری تعلیم کی درخواست کے لئے میرے سامنے پیش ہوا۔ یہ جرأت آج تو نے کی ہے۔ آئندہ مت کرنا۔“ ملک عبدالعزیز خان نے غور و فکر لہجے میں کہا اور محمد جواب میں صرف ”جی مالک۔“ کہہ کر رہ گیا۔

مالک، مالک کے بیٹے اور ان بیٹیوں کی ہمہ وقت ملازموں پر حکم چلانے والی بیویاں یہ بات کیسے ہضم کرتے کہ ان کے ایک خاندانی ملازم کا بیٹا بجائے ان کے اولاد کی خدمت کرنے کے لئے تعلیم حاصل کر کے بڑا آدمی بنے۔ یہ تو آزاد کو اپنی اولادوں کا غلام دیکھنا چاہتے تھے۔

”کیسی زندگی ہے کھانے کو کومہ کھانا مل جاتا ہے۔“ بیٹے کو اچھا لباس مل جاتا ہے، رہنے کے لئے دیدہ زیب کمرہ مل جاتا ہے۔ مگر یہیں اپنی اولاد کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس کے روشن مستقبل کے بارے سوچنے کا حق ہمیں نہیں

99

ایک شخص کا احوال، اسے حرام کی کمائی
راس نہ آتی تھی۔ اس نے بارہا ایسی کوششیں
کیں، جن سے وہ حرام کی رقم کما سکتا تھا
مگر اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا
پیش آجاتا کہ وہ اس رقم سے محروم
ہو جاتا۔۔۔ اور آخر کار ایک دن!۔۔۔

اس شمارے کی ایک ہنستی مسکراتی، خوبصورت کہانی!۔۔۔



تبدیل ہو گئیں۔ بس گزارے کی جگہ تھی۔ ویسے
خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں قدرتی طور پر ہی
امداد ہو گئی تھی، یعنی دو بیٹے سب سے اچھے لیکن ان
کے ساتھ ایک بیوی کو بھی بھگتنا پڑتا ہے جو بات بات
پر طعنے دیتی ہے۔ اپنی تقدیر کو کوئی ہے اور کہتی ہے کہ
اس کی قسمت میں ایک کلرک ہی لکھا تھا ظاہر ہے اس
کلرک کی قسمت میں بھی وہی لکھی تھی، دونوں ہی مجبور
اور بے بس تھے۔

والد صاحب قبلے نے ایک بار کہا تھا کہ ہمارا
شجرہ نسب کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے ملتا ہے اور
ہمارے سروں پر آج تک ان بزرگ کا سایہ ہے۔
ہمیں بھی حرام کی روزی راس نہیں آ سکتی۔ والد
صاحب نے ساری زندگی حلال کمایا اور حلال کی کمائی
سے جو بچہ بن سکتا ہے وہی آج ان کا ترک تھا۔ چھوٹا
سامان جس کی چھت پر پہلے ٹین کی شیشیں پڑی
ہوئی تھیں اور اب یہ شیشیں سینٹ کی شیشوں میں

”قابل احترام ملک عبدالعزیز خان صاحب
سدا خوش رہو۔“

ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہے ہیں۔
کیوں کہ آپ اور آپ کے فرزندوں کے زیر سایہ رہتے
ہوئے ہمیں بھی اپنی اولاد کے بہتر زندگی اور روشن
مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ملے
گا۔ جس کے تحت ہم یہ قدم اٹھا رہے ہیں۔ جس کا ہمیں
مال نہیں بلکہ بے انتہا خوشی ہے۔ آپ اور آپ کے عزیز
جاے ہمیں برے نظروں میں یاد کریں لیکن ہمارا تمیز
مطلب دوسرا ہے۔ یہاں کی غلامانہ زندگی جس میں
ہمیں ہر سہولت پہنچا لی مگر ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی۔
ہماری رو میں اس ملک آئینہ فضاؤں میں قید تھیں۔
ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی پوری زندگی آپ خاندان کی
خدمت گزاری کرنے میں گزاری۔ ہم نے بھی اپنی
زندگی آپ کی خدمت کے لئے وقف کر دی مگر آپ نے
ہمارے بیٹے کو تعلیم دلوانے سے انکار کر دیا۔ جس کی
ہمیں پہلے ہی توقع تھی۔ آپ ایک غلام کا صرف ایک
”غلام“ دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ مگر ہمیں بھی آپ کی
کردہ ہماری اولاد ہے اور اولاد کے بہتر مستقبل کے
بارے میں صرف والدین ہی بہتر طور پر سوچ سکتے ہیں۔
ہم نے بہتر سوچ لیا اور جس کے تحت اس چار دیواری کو
بلا اجازت رات کی تاریکی میں پار کر گئے۔ ہمیں شک
ام بھی نہ بھٹا۔ تنگ کا جو بڑا قرض ہے ہم پر وہ قرض
ہمیں معاف کرنا۔
خیر اندیش..... محمد بخش آزاد

رقہ پڑھنے کے بعد ملک عبدالعزیز خان چند
لے تو سوچوں کے بحر میں غوطہ زن ہو گیا۔ پھر
بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوا۔ ”اچھا کچھ بخش
تو نے، جو کام تیرے آباؤ اجداد نے اپنی آئندہ آنے
والی نسلوں کے لئے نہیں کیا“ آج تو نے کر کے
دکھا دیا۔ ویلڈن، ویلڈن۔ میری طرف سے تمہیں
آزادی مبارک ہو، نئی زندگی مبارک ہو، تنگ بھی
معاف ہے تمہیں۔“

”مکن ہے فضاؤں میں، گھٹ گھٹ ہم جی رہے
ہیں۔ ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ غلامی ملی
ہے۔ اسے آباؤ اجداد کی طرف سے وراثت میں۔
اب لو یہ کوئی بیٹھا زندان محسوس ہو رہا ہے۔“ محمد بخش
نے اداس بھرے لہجے میں زائدہ سے کہا۔

”میں آزاد کو آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایک
غلام نہیں۔“ زائدہ نے اپنے قریب بستر پر جو خواب
نئے آزاد کے سر پر شفقت و مٹا بھرے انداز میں
ہاتھ پھیرے ہوئے پر غمزہ لہجے میں کہا۔
”لیکن یہاں رہتے ہوئے“ آزاد کو آزاد
دیکھنا محض ایک خواب کے سوا کچھ نہیں۔“ محمد بخش
نے پائیت بھرے انداز میں کہا۔
”نکل جائیں گے یہاں سے۔“ زائدہ غصوں
لہجے میں بولی۔

”نکل کے جائیں گے کہاں۔ پوری دنیا میں
اس ٹھٹھے قید خانے کے سوا اور کوئی ہمارا ٹھٹھا دہنا گاہ
نہیں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد بے روزگاری کا
سامنا کرنا پڑے گا۔ بے سائبانی کا سامنا کرنا پڑے
گا۔ اتنی رقم ہمارے پاس نہیں ہے کہ باہر کی دنیا کے
مسکوں کا سامنا معنوں میں کر سکیں۔“ محمد بخش
نے ایک دفعہ پھر اداس لہجے میں کہا۔
”اس کا مطلب کہ آپ یہ نہ لیں کہ ہم کل ہی
یہاں سے چلے جائیں گے۔ چند مہینے یا آدھا سال صبر
کر لیں گے۔ اس عرصہ میں باہر کی دنیا کو اسے لئے
ہموار بنالیں گے۔“ زائدہ نے حوصلہ انداز میں کہا۔

☆☆☆

تقریباً سات مہینے بعد ایک صبح ملک عبدالعزیز
کی بنگلے کے گوشے گوشے میں محمد بخش اور اس کے اہل
خاندان کی پراسرار غیر موجودگی کی خبر پھیل گئی۔ ضروری
ساز و سامان وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ تاہم بیڈ پر
ایک لفافہ ملا۔ جو ملک عبدالعزیز خان کے نام
تھا۔ ملازموں نے لفافہ ملک عبدالعزیز خان تک
پہنچا دیا۔ ملک عبدالعزیز خان نے لفافہ چاق کیا۔
اندرو موجود تھہرندہ رقعہ نکول کر پڑھنے لگا۔

ابتداء میں تو یہ خیال ہی نہیں پر سوار ہوا کہ رزق حلال ہی اس آسکتا ہے لیکن حالات نے بتایا کہ اس کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ اس دور میں ضروری ہے لوگوں کے شغل شامل حال تھے جیکبھی ایسی جہاں اگر تھوڑی سی کوشش جاتی تو کچھ رقم رشوت کے طور پر حاصل ہو سکتی تھی لیکن صاحب رشوت لینا بھی بڑا ہنر ہے اور تجربہ کار لوگ ہی اس سے فیض یاب ہو سکتے ہیں یہ سب کچھ ہم جیسوں کی تقدیر میں کہا۔ پہلی بار زندگی میں صرف پہلی بار ایک صاحب نے نظر عنایت کی ایک چھوٹا سا کام تھا ان کا انہوں نے اس کے عوض دوسروں سے رشوت پیش کی اور ہم نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ منصوبے تھے کہ ذہن میں اٹھے چلے آ رہے تھے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو بیگم صاحبہ کا بگڑا ہوا موڈ یقیناً درست ہو جائے۔ بچوں کی فرمائش آہستہ آہستہ پوری ہو جائیں رشوت کے یہ دوسروں نے گھر میں لے کر اس طرح داخل ہوئے جیسے قارون کا خزانہ حاصل ہو گیا ہو۔ اس دن گھر میں بدایوں کے بیڑوں کا ڈبہ بھی ہمارے ساتھ گیا تھا اور بیگم صاحبہ حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگی تھیں ہم نے ان سے وعدہ کیا کہ اب ان کی تمام شکایتیں دور ہو جائیں گی وہ رات خوشیوں کی رات تھی لیکن اس کا دوسرا ان مصیبتوں کا دن تھا۔ بڑے صاحب نے طلب کیا دیکھا تو وہی صاحب بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے ہمیں دوسروں پر پیش کیے تھے۔ پتہ چلا کہ جس کام کے لیے انہوں نے ہمیں دوسروں پر دیے تھے۔ وہ نہیں ہو سکا اور ان صاحب کا مزید نقصان ہو گیا۔ ہم نے تو اپنی دانست میں ان دوسروں کو بل حلال کر دیا تھا۔ لیکن ہم کیا کرتے ان کا وہ کام ہماری کوششوں کے باوجود پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ بڑے صاحب نے ہم سے صرف اتنا پوچھا کیا ہم نے ان سے دوسروں پر قبول کیے ہیں انکار کا کیا سوال تھا۔ ہم نے بے بسی سے گردن ہلا دی۔ بہر طور ان صاحب کے ذریعے ہو گیا اور انہوں نے دوسروں کے واپسی کا تقاضا بھی

نہیں کیا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد ہمیں جو پھکارنا پڑی وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ بڑے صاحب اتفاق سے ہمارے شہ اساتذہ اور انہیں یہ بات معلوم تھی کہ ہم رشوت نہیں لینے۔ ڈانٹ پھکار کے بعد انہوں نے نرمی سے کہا۔ ”دیکھو میں اپنے محلے میں یہ بدعنوانیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ آج تک تمہارے بارے میں ایسی کوئی رپورٹ نہیں ملی ضرورت کے نہیں ہوئی لیکن اس کے لیے یہ سب کچھ جائز نہیں ہے دوسری حرکت پر میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“ ہمارے تو دل کی حرکت ہی بند ہو گئی تھی۔ بھلا دوسری حرکت کیا کرتے چنانچہ توبہ کر لی۔ اس کے بعد رشوت قبول نہیں کریں گے ظاہر ہے ہمارے سر پر ایک بچے ہوئے بزرگ کا سایہ تھا اور رزق حرام ہماری تقدیر ہی میں نہیں تھا۔ بدایوں کے بیڑے غالباً پرانے تھے۔ کیونکہ دوسرے دن سے بچوں کو دست شروع ہو گئے اور ڈاکٹروں پر ایجنٹ بننے پر خیر کرنے پڑے یعنی وہ دوسروں پر ہاتھ پھیلنے لگے داخل ہو کر مجدد کو خراب کرتے ہوئے ضلح ہو گئے تھے۔ کافی دن تک توبہ کرتے رہے کہ آئندہ رشوت قبول نہیں کریں گے لیکن حالات تھے کہ تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ بمشکل تمام بیگم نے اپنی ایک انگوٹھی اور چند ایسی چیزیں جو تھوڑی بڑی ہوتی تھیں فروخت کر لیں اور ان کے پرائز بونڈ خرید لیے گئے دن دن روپے والے پرائز بونڈ گویا ہمارے تقدیر پر لٹنے کے خاص تھے لیکن اخبارات میں جب بھی ایسی انعام لکھنے والوں کی فہرست شامل ہوتی ہم دو دوں میاں بیوی کے چہرے پر ہاپوسٹیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ کیونکہ جو پرائز بونڈ ہمارے پاس تھے ان کے نمبر قریب انداز میں شامل ہی نہیں کیے جاتے تھے۔ بالآخر ایک ضرورت پر یہ پرائز بونڈ بھی فروخت ہو گئے اور ان کے پیسے ٹھکانے لگ گئے۔ ہماری تقدیر میں تو رزق حلال ہی تھا لیکن بیگم صاحبہ کو ہماری تقدیر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ یہی کہیں کہ ہم ناکارہ اور غلے

ابا بار ہا نہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن صاحب اگر کوئی بات کم از کم بیوی کی سمجھ میں آجائے تو وہ بیوی لاش میں رکھنے کے قائل ہوتی ہے۔ درانی سے ہماری بڑی گہری دوستی تھی وہ بھی کلرک تھا لیکن ہماری نسبت بہت زیادہ خوش و خرم۔ یہ نہیں اس کے ذرائع کیا تھے۔ ایک شام دفتر سے اٹھے تو درانی نے کہا۔ ”یار دیو ہو گئی ریس کورس جانا ہے آج بڑی عمدہ ریس ہے۔ کئی ایک گھوڑے فیورٹ ہیں ضرور جیتیں گے۔ آؤ چلیں۔“ ہم نے ہم نہ حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہاں ہاں آؤ ابھی بھی کیا بیوی کی غلامی کہ دفتر سے نکلے تو سیدھے گھر اور گھر سے نکلے تو دفتر۔“ ”جی نہیں درانی۔ غلامی کی بات نہیں ہے مگر ہم یہاں لوگوں کا ریس میں کیا گزر۔“ ”آؤ تو کہی۔ کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس۔۔۔۔۔؟“ ”ہاں میں نے کراہی ہے جو ہم بسوں پر خرچ کیا کرتے ہیں۔“ ”آؤ آؤ آؤ۔“ درانی کے بے حد اصرار پر ہم اس کے ساتھ ریس کورس پہنچ گئے۔ درانی ریس کا کھلاڑی تھا۔ اس نے تین گھوڑوں پر ریس لگائیں اور ہر گھوڑا جیت کر دیا۔ درانی کی جیب میں کم از کم ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے ہو گئے ہمارے منہ میں پانی بھر آیا تھا ایک دن میں یہ سب کچھ۔ ہم نے درانی سے کہا کہ اس کی اس طرح توبہ تو آمدنی ہوگی تو اس نے بتایا کہ کبھی بارہمی جیت۔۔۔۔۔ بہر طور بیگم نے بھر دو چار ہزار روپے ہاتھ لگ ہی جاتے ہیں۔ ہمارے اوسان خطا ہوئے جارہے تھے بیگم بھر کا بس کا کراہی ہم نے جب سے نکالا اور درانی کے کہنے پر ایک گھوڑے پر لگایا۔ گھوڑے کا نام جہاں پناہ تھا اور اس کا بھادو بہت کم تھا لیکن بہر طور درانی کو یہ امید تھی کہ گھوڑا ضرور جیت جائے گا وہ گھوڑے کا چہرہ نسب ہمیں بتا رہا تھا اور ہم اپنا تجربہ نسب یاد کر رہے تھے لیکن نتیجہ وہی ہوا جو ہماری تقدیر میں تھا۔ خود درانی

نے اس گھوڑے پر ایک ہزار روپے لگا دیے تھے۔ گھوڑا لنگڑا ہو گیا۔ درانی نے ریس کے اختتام پر افسردہ لہجے میں کہا۔ ”آہ جہاں پناہ سے برا میری تھی۔۔۔۔۔“ لیکن ہم جہاں پناہ کے ساتھ درانی کو بھی گالیاں بک رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اب میں دن تک بس کا کراہی کہاں سے آئے گا۔ پیدل اتنا لمبا سفر نہیں سکتے تھے حالت خراب ہو رہی تھی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اپنی جیب کا پچھلا حصہ ادھیڑ لیا اور آنسو بھری آواز کے ساتھ بیگم کے سامنے پہنچ کر بتایا کہ ادھیڑی ہوئی جیب سے ہماری ساری رقم نکل گئی۔ ہماری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بیگم کی محبت پھٹ پڑی۔ انہوں نے انتہائی افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ان کی غلطی ہے انہیں جیب دیکھ لینی چاہیے تھی۔ ہم نے بھی ان کی دیکھنی کے لیے کہا کہ کبھی بھی انسان سے ایسا قصور ہو سکتا ہے۔ کوئی بات نہیں ہم بس میں سفر نہیں کریں گے۔ بس ڈرا ایک کھٹے پیکر گھر سے نکل جایا کریں گے۔ پیدل مارچ ہو جائے گا لیکن دوسری صبح یہ اندازہ ہوا کہ بیگم صرف زبان کی تڑوی ہیں دل کی بری نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم پیدل اتنی دور جا سیں اور واپس آئیں۔ بیگم نے بھر تک کابس کا کراہی بیگم سے حاصل ہوتا رہا۔ اس کے بعد درانی سے کئی بار ملاقات ہوئی لیکن ہم اس کی شکل دیکھ کر ہی بالاحول پڑھ لیا کرتے تھے بھلا رہیں تو بیگم بس کا کراہی نہیں دیں گی اور ہر مہینے تو ہم جیب ادھیڑ کر ان کے سامنے نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن لاچ بری بلائے درانی کے اور بھی بہت سے کام تھے ایک دن اس نے بتایا کہ وہ گرین کلب میں جواب بھی کھیلتا ہے۔ فلیش کے بارے میں اس نے تفصیلات بتائیں۔ تھوڑی بہت واقفیت ہم بھی رکھتے تھے۔ ایک دن درانی کے ساتھ ہم گرین کلب پہنچ گئے۔ کلب کیا تھا خوش فاق لوگوں کا ایک مجمع تھا۔ جو بیڑوں کے گرد بیٹھا ہوا شوہر عیار ہا تھا۔ توئوں کی یہ بے قدری

اس سے پہلے ہم نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ نجانے یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے اتنے سارے نوٹ لے آئے تھے۔ درانی ایک میز پر بیٹھ کر کھیلنے لگا اور بڑے اطمینان سے آٹھ سو روپے ہار کر وہاں سے اٹھ گیا۔ ہم ان آٹھ سو روپے کی ہار پر افسوس کرتے رہے تھے لیکن درانی نے کہتے ہوئے کہا کہ جو جہاں سے آیا تھا وہیں چلا گیا۔ بہر طور یہ سب ہمارے درانی کا تھا۔ ہمارا اس میں ہاتھ نہیں تھا۔ ہمارے اوپر تو ایک پینچے ہوئے بزرگ کا سایہ تھا اور یہ سارے پینچے ہمیں سے رزق حرام نہیں لینے دیا کرتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ مسائل بڑھنے لگے اور یہ آرزو ہمارے دل میں ایک حسرت بن کر رہ گئی کہ کاش اس خزانہ کے علاوہ ہمیں کہیں سے بھی کچھ اور حاصل ہو سکتا۔ ایک بار صرف اتفاقاً جانے کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔

سینٹ کی شیفٹیں ترخ تھیں اور ان پر کئی بار ہم نے سینٹ لگا یا تھا تاکہ بارش کا پانی اندر نہ آ سکے۔ کاش ایک بار ان سارے مسائل کا حل ہمیں مل جائے اتنی رقم صرف اتنی رقم کہ جو چیزیں ہمارے پاس نہیں ہیں وہ حاصل کر لیں۔ لیکن کہاں سے آخر کہاں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ پارٹ ٹائم کام کرنے کے لیے بے شمار لوگوں سے درخواستیں کی تھیں لیکن بھلا ان بے شمار لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک ملر کی حسرت پوری کرنے کے لیے جدوجہد کرتے دیے بھی ہمارے تعلقات بڑے لوگوں سے نہیں تھے اور چھوٹے لوگ بے چارے خود ہی اپنے مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ مہینے کی تنخواہ ملی تھی جو معمول کے مطابق بیٹیم کو لا کر دے دی۔ سو سو روپے کے نوٹوں پر مشتمل تھی چنانچہ دوسرے دن کے اخراجات کے لیے ہمیں ایک سو کا نوٹ مل گیا۔ ذہن میں بغاوت ابھر رہی تھی نجانے کیا کیا خیالات دل میں آرہے تھے۔ اس شام جب ہم دفتر سے نکلے تو نجانے کیوں ذہن پر ایک غبار بھر گیا۔ درانی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کہنے لگا کیو سوچ رہے ہو۔

”کچھ نہیں درانی مسائل ہیں کہ منہ بھاڑے

کھڑے ہیں اور حالات جوں کے توں ہیں۔ ایک بار صرف ایک بار اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو جائے تو یوں سمجھو کہ سارے دلدر دور ہو جائیں۔“ درانی ہنسنے لگا پھر بولا۔

”پیارے زندگی میں اگر کبھی خطرہ مول نہیں لو گے تو کچھ نہیں ملے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے یہاں سب کے سب تمہاری طرح پارسا ہیں۔ نہیں..... جس کو جہاں موقع ملتا ہے اپنی جیب بھر لیتا ہے اور اتنی خاموشی سے کام کر جاتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔“

بند کر لیا تھا۔ بہر طور کسی کو ہمارے تھوڑے سے لمحوں پر اعتراض نہیں ہوا۔ کارڈ تقسیم ہو گئے۔ ہم نے دل میں سوچا تھا کہ آج آریا پار سو روپے ہارنے کے بعد یہاں سے اٹھ جائیں گے۔ ہماری تقدیر میں اگر یہی ہے تو اس ماہ بیٹیم کو بھی پریشان نہیں کریں گے اور خاموشی سے پیدل سفر کرتے رہیں گے پہلا کارڈ شو ہوا اور یہ دیکھ کر ہماری حسرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے کارڈ سب سے بڑے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو روپے کے ٹھپے ہمارے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ ہمارے اپنے ٹھپے الگ تھے دل ایک دم بڑھ گیا۔ سامنے بیٹھا ہوا آدمی کینٹوننگ ہاؤس سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے خاص طور سے ہمارے ہاتھوں پر نگاہ رکھی تھی کیونکہ ہمیں ہمیں شاپرنگ نہ کر ڈالیں لیکن ہم تو فلیش کے انٹری کھلاڑی تھے اور ایک انٹری کھلاڑی اگر کھیل ہی لے تو بڑی بات ہے۔ شاپرنگ تو دوسری چیز بہر طور اس بار بازی ذرا ٹھیک تھا کہ ہی لگ تھی وہ سامنے والا شخص ہمیں بڑی گہری نگاہوں سے گھور رہا تھا اور اتفاق کی بات یہ کہ ہمارا مد مقابل وہی رہ گیا تھا۔ ہمارے پاس کلر اور بیٹیم اور اس کے پاس فرسٹ کلر اور شو ہوئے تو اس شخص کا چہرہ بری طرح بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے سامنے لہرانے لگے۔ ہمارے سامنے تقریباً سات سو روپے کے ٹھپے جمع ہو گئے تھے اور وہ شخص ہمیں اس طرح گھور رہا تھا جیسے اگر ہم نے ہارنے کی کوشش کی تو وہ ہمیں قتل کر دے گا۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ گرین کلب میں اگر ہم جیت بھی گئے تو اپنی یہ رقم یہاں سے لے کر کیسے جائیں گے۔ بہر طور اس وقت فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا ہمیں کھیلنا ہی تھا۔ کارڈ تقسیم ہوئے اور ہم بے وقوفوں کے بے انداز میں کھیلنے رہے۔ کبھی بازی چلی اور جاتی کبھی جیت جاتے لیکن ہمیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہمارے سامنے کتنے ٹھپے جمع ہو چکے ہیں۔ وقت تو ذہن

سے نکل ہی گیا تھا۔ غالباً رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور ہمارے سامنے ٹھپوں کے اتنے انبار تھے کہ ہم انہیں گن بھی نہیں سکتے تھے اور ہمارے سامنے باطل ہو گئے تھے اور بہت سے لوگ ہمارے گرد جمع ہمارا کھیل دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ ماہرین بھی تھے جو شاپرنگ پکڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غالباً انہیں خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے ہاتھوں پر پوری طرح نگاہ رکھ رہے تھے کارڈ کی گڈی تین بار تبدیل ہو چکی تھی اور جس وقت بارہ بج کر تیس منٹ ہوئے تو ہمارے سامنے تقریباً سی ہزار روپے موجود تھے۔ یہ رقم ٹھپوں کی شکل میں تو تصوی نہیں کی جاسکتی تھی لیکن ہمیں یہ اندازہ تھا کہ ہمارے سو روپے کے ٹھپے اس میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ساڑھے بارہ بجے گرین کلب کی طرف سے اعلان ہوا کہ وقت ختم ہو چکا ہے کھلاڑی اپنا کھیل بند کر دیں۔ وہ تینوں خوفناک لوگ تو شاید ہمیں ساری رات نہ اٹھنے دیتے یا اگر اٹھنے دیتے تو ای شرط پر کہ ان کے ٹھپے انہیں واپس کر دیے جائیں۔ لیکن کلب کی طرف سے یہ اعلان ہمارے لیے مژدہ جانفزا ثابت ہوا۔ ہم نے اپنے ٹھپے سینٹ لیے اور اس کے بعد انہیں کاؤنٹر پر جا کر پیش کرالیا۔ آہ تب ہمیں معلوم ہوا کہ ایک لاکھ میں صرف تیس ہزار کم ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں فرط مسرت سے وہیں گرین بیٹوش ہو جائیں یا ان نوٹوں کو سنہال کر اپنے گھر لے جائیں۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ ابھی تک مختلف قسم کے مشروہ بات سے مشغول کر رہے تھے۔ خوش گپیاں کر رہے تھے۔ غالباً کلب سے اٹھنے کا وقت ایک بجے تک کا تھا۔ یہ صرف دارنگ تھی جو کھیلنے والوں کو دی گئی تھی۔ تاکہ وہ اپنے اپنے کھیل ختم کر لیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا تو وہ تینوں افراد کینٹوننگ ہاؤس سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

- ☆ اپنے اخلاق کو اس قدر خوبصورت اور لہجہ کو اس قدر دھیرا رکھو کہ کسی کو تم سے کوئی شکایت نہ ہو۔
- ☆ غصے پر قابو پانا یا دامن نہ دینا۔
- ☆ اپنا حقیقی راز بھی کسی کو نہ بتاؤ خواہ وہ تمہارا دوست ہی کیوں نہ ہو۔
- ☆ آزادی کا ہر لمحہ غلامی کے ہزار سال سے بہتر ہے۔
- ☆ نماز خوف کی دلیل ہے یہ دل سے غیر اللہ کا خوف دور کرتی ہے نماز اور دوسرے انسان کو آہستہ آہستہ پورا کر دینے کی ضمانت ہے یہ اندر سے خالی انسانوں کو بھرنا شروع کر دیتی ہے۔
- ☆ نماز اللہ کی قربت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔
- ☆ نماز دنیا اور آخرت کے درمیان راہِ لیل کا پل ہے۔
- ☆ نماز دین کا ستون ہے۔
- ☆ عبادت جو مخلوق کے لیے کی جاتی ہے زمین میں وحشا دیتی ہے اور عبادت جو خالق کے لیے کی جاتی آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔
- ☆ جس کا ظاہر باطن ایک ہے وہ عالم ہے جس کا باطن ظاہر سے افضل ہے وہ ولی اللہ ہے اور جس کا ظاہر باطن سے افضل ہے وہ جاہل و مکار ہے۔
- ☆ خوش مزاج شخص وہ ہے جو دوسروں کو خوش مزاجی دے۔
- ☆ درویشی بادشاہت سے بہتر ہے بشرطیکہ دنیا کا قلعہ شامل نہ ہو۔
- ☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو کچھ ہے کہ جو کچھ نہیں ہے بیان کر دے۔
- ☆ جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے اسے اکثر عمر وہی کاٹ کر رہتا ہے۔
- ☆ بدترین جھوٹ وہ ہے جس میں کچھ سچ بھی شامل ہو۔

تک کا یہ نہیں چلے گا۔“ عقب سے ایک کالے رنگ کی کار آئی اور وہ تینوں اس میں بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔ ہم اپنی پانچوں سے پہلے والا خون پونچھ رہے تھے۔ ہماری تدبیر کی قدر کارگر رہی تھی۔ ہم نے کسی بہترین انداز میں سوچا تھا۔ وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور اب اس کے بعد موقع تھا کہ ہم اپنا سرسبز حاصل کر کے نو دو کیارہ ہو جائیں اور اس کے بعد بھی گرین کلب کی جانب سے رخ بھی نہ کریں بلکہ اپنے چہرے پر داڑھی بھی رکھ لیں۔ لوگوں سے یہی ہیں گئے کہ خدا نے توفیق دے دی ہے اور اب نماز شروع کر دی ہے لیکن داڑھی کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ اب وہ بخت جرمود اور اس کے گھر میں بیچنا نہ سکیں۔ اب آہستہ آہستہ ہمارے پس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ ہم دوڑتے ہوئے کلب کی سمت چل پڑے۔ کلب بالکل خالی ہو چکا تھا۔ وہاں اب الو بول رہے تھے۔ لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم پاگوں کی طرح اندر داخل ہو گئے۔ کاؤنٹر خالی بڑا ہوا تھا۔ میز پر ایک دوسرے پرالت دی گئی تھیں کرسیاں انبار کر دی گئی تھیں ہم نے اس بوڑھے شخص کو دیکھا جو بدن پر اپرن باندھے پوچھا لگا تھا۔ اس نے انجی ٹکا ہوں سے ہمیں دیکھا اور غالباً ہمارے اس طرح شخص آنے پر کسی قدر ناگواری کا اظہار بھی کیا لیکن ہم اسے نظر انداز کر کے کلب کے اندرونی حصے میں گھس گئے اتنا بھی خیال نہ کیا کہ ہمارے اس طرح گھس آنے کو جرم بھی تصور کیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ ہم اس ڈسٹ بن کے پاس پہنچ گئے جس میں ہم نے اپنا سرسبز مایہ حیات چھپایا ہوا تھا۔ لیکن لیکن آہ یہ کیا آہ یہ کیا۔ ڈسٹ بن تو بالکل خالی بڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں بو آ رہی تھیں۔ بالکل کوئی بھی چیز نہیں تھی اس میں ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ہم پٹی پٹی نگاہوں سے اس ڈسٹ بن کو دیکھتے رہے۔ آخر وہ لافظ کہاں گیا۔ ڈسٹ بن کا کوڑا کرکٹ کہاں گیا۔ ابھی ہم پاس نہیں تھی چنانچہ پیدل ہی چلنا پڑا کافی آگے جا کر ایک سینما ہاؤس تھا جس کے پاس جا کر سواری مل جانے کی توقع تھی لیکن سینما ہاؤس تک کا راستہ کافی دور تھا اور ہمیں ایک سمنان راستہ طے کرنا ہی تھا۔ ہماری نگاہیں ادھر ادھر بھٹک کر ان تینوں کو تلاش کر رہی تھیں اور اس وقت ہماری روح قبض ہونے کے قریب ہو گئی جب ہم نے ان تینوں افراد کو تیزی سے اپنی جانب جھپٹتے ہوئے دیکھا وہی ہوا جس کا خطرہ تھا وہ تینوں آن کی آن میں ہمارے قریب پہنچ گئے تھے ایک کے ہاتھ میں لپٹا سا پوٹو تھا دوسرے کے ہاتھ میں خورد تیسرا البتہ خالی ہاتھ تھا۔ اگر خالی ہاتھ نہ ہوتا تو ہمارا کریمان پوری فوٹ سے کیسے پکڑ لیتا۔

”ہوں جرمود کو جانتے ہو۔ جرمود کی رقم لے کر نکل جانا کسی مانی کے لال کے لیے آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔ نکالو وہ رقم کہاں ہے۔“

گر بیان پکڑنے والے شخص نے غصے سے غوغا مچا ہوں سے ہمیں مگھرتے ہوئے کہا۔ یہ وہ تھا جس کے گال پر زخم کا گہرا نشان تھا۔ ہم نے کانپتے ہوئے کہا۔

”لیکن لیکن بھائی ہم نے تو وہ رقم جوئے میں جیتی ہے۔“

”جیتی ہے۔“ اس کا لہجہ ہمارے منہ پر بڑا اور ہمارے داہنے ہونٹوں کے گوشے سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔

”سنو تو سبھی بات تو سنو۔“ ہم نے گرجا جت سے کہا تھا لیکن اس شخص نے ہمارے پیٹھ کے گر بیان میں اس طرح ہاتھ ڈالا کہ تینوں بن ٹوٹ گئے اور پھر لافظ بھلا اس کے ہاتھ تک کیوں نہ پہنچتا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”بھائی گرین کلب سے جیت کر جا رہے تھے اور وہ بھی جرمود سے چلو دھج ہو جاؤ اور سنو اگر کسی کے سامنے ہمارا نام لیا تو اس کے بعد ہڈیوں

نہ جانے کیوں چھٹی جس نے یہ اعلان کیا کہ آج کی رات ہمارے لیے بڑے خطرناک ہے اور یہاں سے گھر جانا موت کے مترادف ہے۔ لیکن یہ رقم ہم کسی بھی صورت نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ آج تو قسمت ہم پر مہربان ہوئی تھی۔ آج ہی تو ہمیں ہماری تمام آرزوؤں کا شرف ملے والا تھا۔ ایک بار پھر ذہن پر منصوبوں کی یلغار ہوئی۔ لیکن ہم نے اسے ذہن کو جھٹک دیا پہلے زندگی تو بچا لیں۔ پہلے یہ رقم خیریت سے اپنے گھر تک تو پہنچائیں اس کے بعد ہی کچھ سوچ سکتے ہیں۔ ہم اپنے ذہن میں منصوبے ترتیب دینے لگے۔ پھر دفعتاً ہمارے ذہن میں ایک خیال آ ہی گیا۔ نوٹوں کی رقم کاغذ کے ایک بڈل میں باندھ کر ہم لے کر چل پڑے اور گرین کلب کے مختلف گوشوں میں چکر لگائے۔ ایک جگہ ہمیں لوہے کا ایک ڈسٹ بن نظر آیا جو ایک دیوار میں نصب تھا۔ نہ جانے ہمارے ذہن میں کیا خیال آیا ہم نے جلدی سے اس میں سے سو کا نوٹ نکالا اور اپنی جیب میں رکھ لیا اس کے بعد وہ لافظ ہم نے ڈسٹ بن کی بالکل آخری تہہ میں رکھ دیا۔ کل صبح امارت کے کسی پہر ہم ایک بار پھر اس کلب میں داخل ہوں گے اور درخواست کریں گے کہ ہمیں اندر جانے دیا جائے صورت حال بھی بتا دیں گے اور اس کے بعد یہ رقم ہم اپنے گھر لے جائیں گے۔ منصوبہ بہت شاندار تھا اور ہم مطمئن تھے کہ اب ہم اسی ہزار روپے کی رقم کے مالک بنے ہی بنے ویسا ہی ایک دوسرا لافظ حاصل کر کے ہم نے روٹی اخبار کے بہت سے کلوے پھاڑے اور پھر انہیں لافظ میں ڈال کر کاؤنٹر پر جا کر اسٹیل کر لیا۔ پھر یہ لافظ ہم نے انتہائی احتیاط سے اپنے لباس کے اندرونی حصے میں رکھا اور کلب سے باہر نکل آئے ہماری نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ دل خوف سے لرز رہا تھا قدم تھے کہ ادھر کے ادھر پڑ رہے تھے اور ہم چوروں کی طرح اپنے گھر کے جانب بڑھ رہے تھے۔ بخت کوئی سواری آس

دائیں

ایس قریشی

جو حال ہمارے مشرقی معاشرے میں گھریلو معاملات کا ہے، کچھ ایسا ہی حال مغرب کا بھی ہے۔ وہاں بھی گھر کا ماحول اور حالات ایسے ہی پائے جاتے ہیں۔ ایک گھر کا حال، جہاں میاں بیوی کے درمیان ایک 'عورت' آگنی تھی!

اس شمارے کی ایک معاشرتی کہانی، مغرب سے درآمد

چاہتا تھا۔ یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ "کیا بات ہے ایلیں تم دینی طور پر کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔" اس نے میری جانب پریشانی نظروں سے دیکھا اور میں نے اسے من و عن سب کچھ بتا دیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ خاموش رہی۔ "پھر تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔" اس نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے سوال کیا۔

پیشی کرینن نہ صرف میری بڑی سہیلی تھی بلکہ ایک اچھی دوست بھی تھی۔ میں اس کے بچپن میں ہی کرسمس کے لیے پی ری سی اور سوچ رہی تھی کہ اپنا اہم مسئلہ اسے بتاؤں یا نہ بتاؤں میں سوچ رہی تھی شاید وہ اس معاملے میں مجھے کوئی اچھا مشورہ دے سکتی ہو۔ دراصل میرے شوہر جیک کو ایک عورت سے محبت ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے بھی بے انتہا محبت کرتا تھا۔ مجھے چھوٹے بھیر وہ اس عورت کو بھی پاس رکھنا

دیکھے اور ہمارا جی چاہا کہ ہم بھی اس کوڑے دان میں منہ دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جہان فانی سے رخصت ہو جائیں۔ کیا فائدہ ایسے جینے کا کیا ہو گیا آہ کیا ہو گیا۔ اسی ہزار روپے کے نوٹ پورے اسی ہزار روپے کے نوٹ جو ہماری ملکیت تھے جنہیں ہم نے جڑوں پر گھونٹے کھانے کے بعد بھی بچا لیا تھا۔ اب ہمارے نہیں تھے۔ وہ جل جلتے تھے اور یہ چند گلوں سے چند گلوں کے آوارہ ہوا کے چند جھوٹے، جلے ہوئے نوٹوں کو بھی ہم سے دور لے گئے کہ یہ بھی ہمارے مقدر میں نہ تھے۔ ہم وہیں کھڑے کف اٹھوس ملتے رہے۔ ڈسٹ بن کے تمام کچرے کو ہم نے آخری تہہ تک کھال ڈالا یہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے گلوں سے ہمیں ملے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن انہی میں ہماری تمام آوازیں بس جل کر رہ گئیں۔ آہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ہم فلیش میں بیٹھی ہوئی رقم سے اپنے دلہ دور کر سکیں۔ ہم پاپس اور بائس اور بائس اپنے گھر کی جانب چل پڑے۔ ہمیں کسی آستین شائوں تک سیاہ ہوئی تھیں۔ بلکہ ہمیں جیسے جیسے کی آستین شائوں تک سیاہ ہوئی تھیں۔ بلکہ ہمیں جیسے جیسے جل بھی گئی تھی۔ یہ سارا نقصان قابل برداشت ہوتا اگر نوٹوں کا لقا ہمارے لباس میں موجود ہوتا۔ آہ یہ تقدیر ہم پر بھی ہوئی تو کس انداز میں جڑے کا گھونٹ کٹنا ہوا جو نہ جلے ہوئی آستین اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ راستے بھر ہم نوٹوں کے بارے میں سوچتے آئے۔ جھانکی کے بھی نہیں تھے اور پھر اپنے گھر کے دروازے سے کچھ دور رہ گئے تو جیکم کے بارے میں سوچنے لگے جو ہمارے گھر نہ پہنچتے رخت بے چین ہوں گی۔ ہماری جلی ہوئی آستینیں دیکھیں گی۔ پونا ہوا ہونٹ دیکھیں گی۔ کیا سوچیں گی ہمارے بارے میں۔ آہ یہ تو لینے کے دینے پر گئے تھے۔ کاش کاش ہمارے سر پر ہی بزرگ کا سایہ نہ ہوتا۔ کاش ہمارا بھرہ نسب کسی چنچے ہوئے بزرگ سے نہ چامکتا۔

یہ سوچ رہے تھے کہ عقب میں ہمیں اس بوڑھے خرابی ہوئی آواز سنائی دی۔
"کیا بات ہے۔ تم کلب میں اس طرح کیوں گھس آئے۔" اس کی آواز میں ناخوشگوار کا احساس تھا۔ ہم نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں اس سے بولے۔
"اس ڈسٹ بن میں اس میں اس میں جو کچھ تھا وہ کہاں گیا؟"
"اس میں صرف کچرا تھا۔" اس نے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا۔
"پان پان وہی کچرا کہاں گیا وہ؟"
"پچھلی گلی میں کوڑے دان میں جل رہا ہے۔" روزانہ رات کو میں جی کرتا ہوں سارا کچرا ڈسٹ ہوں سے خالی کر کے کوڑے کے ڈبے میں ڈال کر اس میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں میونسپل والے آتے ہی نہیں ہیں۔ پھر اگل کر رکھ ہوا جاتا ہے۔
"ہہ نہیں آہ نہیں۔" ہمارے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور ہم پچھلی گلی میں جانے کا دروازہ تلاش کرنے لگے لیکن دروازہ ہمیں نہ مل سکا۔ بوڑھا ہمیں اس طرح دیکھنے لگا۔ جیسے ہمارا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ ہم نے اس سے بھی نہیں پوچھا کہ پچھلی گلی میں جانے کا راستہ کدھر ہے سناٹے ہی کے دروازے سے جس طرح اندر داخل ہوئے تھے دوڑتے ہوئے اسی طرح باہر نکل گئے اور پھر پچھلی گلی تک پہنچنے کے لیے ہمیں یہ پوری لائن عبور کرنی پڑی تھی۔ دور ہی سے ہم نے کوڑے دان سے دھواں دیکھا۔ یہ دھواں ہمارے سینے سے نکل رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے ہم ڈسٹ بن کے قریب پہنچ گئے اور اس کے بعد آؤ دیکھا ناؤ جھٹ کوڑا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکے گئے لیکن ڈسٹ بن کی گلی تہہ تک راہ ہو چکی تھی اور کوڑا ہوا سے ادھر ادھر اڑ رہا تھا۔ ہم نے ادھ جلتے نوٹوں کے چند گلوں سے زمین پر گردش کرتے



”میں اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیونکہ میں اب بھی اس سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اگر وہ کسی طرح نہ سمجھا اور اسے اپنانے پر پلندہ رہا تو میں اس کے راستے میں قطعاً نہیں آؤں گی۔“

”تو کیا تم اسے طلاق دے دو گی۔“ میں خاموش رہی کیونکہ ابھی میں نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ”کیا تمہیں ان بچوں کا انجام معلوم ہے جن کے والدین میں طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ کہیں کے نہیں رہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے وہ کس طرح بھٹکتے رہتے ہیں تمام زندگی مشکلات میں گھرے رہتے ہیں۔ نہیں تم ایسا قطعاً نہیں کرو گی۔ تمہیں ان بچوں کی خاطر اپنے شوہر کو برداشت کرنا ہے۔“

”مگر وہ آئرن سے محبت کرتا ہے۔“ میں چلائی۔ ”ہوسکتا ہے اتنی زیادہ نہ کرتا ہو جی طلاق ملنے کے بعد کرنے لگے گا۔“

ہم دو دنوں کافی دیر تک اس پر بحث کرتی رہیں۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔ چنانچہ اپنے بال سیٹ کروانے بھولی پارلر جانا تھا اور میں چونکہ ایک کفایت شعار بیوی تھی اس لیے ان آفتشات کی محفل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے خدا حافظ کہہ کر میں اپنے گھر چلی آئی تاکہ بچوں کے لیے کھانا تیار کر سکوں جو اسکول سے آنے والے تھے۔

میں کو زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ میں نے اپنے شوہر کو اپنے ہاتھوں سے یوں نکلے دیا۔ اس میں تھوڑا بہت قصور میرا بھی تھا۔ پچھلے چند سالوں سے میں اپنے بچوں میں اس قدر معروف رہی کہ مجھے جیک پر فخر دینے کا وقت ہی نہیں ملا۔ نہ ہی میں اس کے آنے پر بیوزگ لگاتی۔ نہ اس کے یوتھ اور موزے اتارنے میں اس کی مدد کرتی اور نہ ہی میں نے بھی اس کی پسندیدہ ڈش بنائی تھی۔

مجھے وہ دن یاد آنے لگا۔ جب میں نے خود آئرن کو اپنے گھر میں بلایا تھا۔ اس دن جیک کے شینگ ڈائریکٹر نے اپنی فرم کی جانب سے ایک ڈنر پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ جہاں تمام کارکنوں اور ان کی

ہنگامات کو مدعو کیا گیا تھا۔ میں اس پارٹی میں جانے پر اس لیے تیار ہوئی تھی کہ گھر میں کام کرتے کرتے اس کی چکی بھی ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر پور ہو چکی تھی۔ لہذا میں نے سوچا کہ کچھ تبدیلی آجائے گی۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن کو فون کیا کہ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ہمارے ہاں آجائے مگر اس نے طبیعت کی بنا سازی کا بہانہ کیا۔ بچوں کو تنہا چھوڑ کر میں نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے وہ حل تھے۔ یا تو میں گھر رہ جاتی یا پھر کسی اور کو تلاش کرتی۔

میں نے ڈائریکٹر میں سے ایک پرائیویٹ آیا کا نمبر تلاش کیا۔ یہ آئرن تھی۔ اس رات اس نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ مگر میرا فون ملنے ہی وہ اس شرط پر آنے کو تیار ہو گئی کہ واپسی پر ہم اسے گھر چھوڑنے جائیں گے کیونکہ اس کے پاس کار نہیں تھی اور ہمیں رات بارہ بجے بند ہوجانی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ آجیجی اس کے آنے سے پہلے میں بچوں کو کھانا کھلائی تھی۔ اس کے ذمے صرف اتنا کام تھا کہ وہ انہیں ملا دے۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ تینوں بچے اب سمجھا رہے تھے۔

آئرن ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس کی لباس اور بالوں کی تراش و تراش اس کے اعلیٰ حسن و ذوق کا نمونہ تھی اور وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہم عمر کو متناسب رکھنے کے لیے بھاری پارلر جا کر روزانہ ورزش کرتی ہے۔ پہلی نظر میں وہ مجھے پچیس سال کی معلوم ہوئی جبکہ اس نے بڑے فراخ دلانہ انداز سے بتایا کہ وہ پینتیس سال کی ہے۔ چونکہ جیک ابھی شیوہ بنا رہا تھا۔ اس لیے مجھے اس سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ انتہائی معصوم اور سب سے لمبے میں بات کرتی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے ڈانٹ دے گا۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر ٹرک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اب وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔

شوہر کی ہلاکت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ

عورت کے لیے سب سے محفوظ سہارا یہی ہوتا ہے۔ اگر شوہر مر جائے یا بیوی کو چھوڑ جائے تو بیوی بغیر لڑکیوں والی چھت کی مانند ہوتی ہے جو کسی لمحے بھی گر سکتی ہے۔

”اگر میرا شوہر مجھ سے چھن جائے تو میں کیا کروں گی۔“ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں کانپ گئی اور میں نے کبھی بھی نظروں سے جیک کو دیکھا جو اپنے چہرے پر آفریشیو لوشن لگا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی اس سے پہلے کہ جیک پر کوئی برا وقت آئے خدا کرے مجھے موت آجائے۔ میں نے والہانہ نظروں سے جیک کو دیکھا تو آئرن مجھے نہایت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اس کا بہت خیال رکھتا تھا اور سچے دل سے اسے چاہتا تھا۔ مجھے اس معصوم اور نازک سی عورت پر بہت ترس آیا۔ مجھے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ ہم خود کو کھونٹے جا رہے تھے اور اس بچاری کو کام سونپ کر گھر چھوڑ دیا تھا۔

پارٹی نہایت دلچسپ رہی ہم نے وہاں طرح طرح کے کھانے کھائے۔ دلچسپ تقریریں سننے کے بعد ہم نے رقص کیا۔ مجھے بہت اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ کیونکہ ایک عرصے بعد جیک کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ اس دوران ڈاننگ پارٹنر بدلے لگے مگر میں جیک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رقص نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لہذا میں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور مضبوطی سے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد محائل رکھا۔ جیک کے انداز سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ رقص کرتے ہوئے بہت خوش تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے جب ہم گھر پہنچے۔ آئرن ایک کمرے میں کتنی مختلف کتابیں پڑھ رہی تھی۔ تمام بچے حڑے سے سو رہے تھے۔ ”جاؤ جیک آئرن کو گھر چھوڑ آؤ۔“ میں نے جیک کو یاد دلایا کہ ہم نے اسے گھر چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا۔ جیک بہت تنکا ہوا تھا پھر بھی وہ آئرن کو گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ واپس آتے ہی جیک خواب خرگوش کے حڑے

لینے لگا۔ دوسرے دن میں نے جیک سے کہا کہ کیوں نہ ہم آئرن کو پیشے کے لیے اپنے پاس ملازم رکھ لیں۔ جیک پہلے تو نہیں مانا مگر جب میں نے اسے آئرن کے حالات کی ابتری کے متعلق بتایا تو وہ مان گیا اور اسی دن میں نے آئرن کو فون کر کے اپنے پاس بلا لیا۔ اب بھی اس کی شرط یہی تھی کہ چونکہ وہ پندرہ کلو میٹر دور رہتی ہے۔ اس لیے واپسی پر جیک اسے گھر چھوڑ آیا کرے۔ میرے کہنے پر جی اس بات پر آمادہ ہو گیا۔ وہ آئرن کو چھوڑنے جاتا تو میں اس کے آنے سے پہلے سوچ گئی۔ وہ جیک سے آ کر میرے پہلو میں لیٹ جاتا تا کہ میری نیند خراب نہ ہو۔

ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ جیک بستر پر موجود نہیں ہے۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی تو دو بج رہے تھے۔ وہ آئرن کو دس بجے چھوڑنے گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میرا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ میرا گلہ خشک ہو گیا اور مجھے آئرن کا شوہر یاد آ گیا۔ جو کسی ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گیا تھا۔ آئرن نے بتایا تھا کہ وہ رات گئے ٹرک چلا رہا تھا کہ نیند نے اس پر غلبہ پالیا اور وہ حادثے کا شکار ہو گیا۔ میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلنے لگتی رہ گئی۔ میری نظروں کے سامنے جیک کی خون آلود لاش گھومتی گئی۔ مجھے آئرن پر بے انتہا غصہ آیا کہ اس کی اپنی کار کیوں نہیں ہے۔ اگر اس کی اپنی کار ہوتی تو اس وقت جیک میرے ساتھ گرم کمر بستر میں سو رہا ہوتا۔

مجھے کچھ مجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میری نظر ٹیلی فون پر پڑی اور میں نے قریبی تھانے فون کر دیا۔

”ہیلو پولیس اسٹیشن“ دوسری طرف سے سکپاتی ہوئی آواز آئی۔ اتنے میں مجھے جیک کی گاڑی رکنے کی آواز آئی اور میں نے ریپورر کر ڈیل پر منت دیا اور نکلے پاؤں بھاگے ہوئے باہر نکلی گئی۔ ”اوه جیک۔“ میں نے اپنا سر اس کے کندھے

پر رکھ دیا وہ گیارہ کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ ”کیا ہو ایلن۔ تم اتنی گھبراہٹی ہوئی کیوں ہو۔“
 ”میں جتنی بھی خدا خواستہ تمہارا ایک سیٹ ہو گیا ہے۔ کہاں رہے ہو اتنی دیر۔۔۔؟“ اس نے ہنستے ہوئے مجھے سہارا دیا اور اندر لے آیا۔
 ”کیا تم نے رات کے گیارہ بجے پٹرول پمپ تلاش کیا ہے۔“ اس نے میرے بالوں کی لٹ سنوارتے ہوئے کچھ پوچھا۔
 ”کیا مطلب۔“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”میں آئرن کو چھوڑ کر سیدھا گھر آ رہا تھا کہ راستے میں پٹرول ختم ہو گیا۔ میں کان دیروہاں سڑک پر کھڑا رہا کہ کوئی گاڑی آئے تو میں اس سے لٹ لوں پھر پیدل ہی پٹرول پمپ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس طرح مجھے پانچ میل آنے میں اور پانچ میل واپس جانے میں صرف ہو گئے۔ اف میرے خدا! وہ بستر پر گر گیا۔ میں اس کے تھے کھولنے لگی۔ وہ واقعی بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔
 ”مجھے ٹیلی فون کر دیا ہوتا۔“

”میں نے سوچا تم سو رہی ہو اوری تم جانتی ہو کہ میں نے ابھی تمہاری نیند خراب نہیں کی۔ بہر حال آئندہ میں محتاط رہوں گا۔“

میرے دل کی دھڑکنیں اعتبار پر آ گئی تھیں۔ میں نے مکمل سیدھا کیا اور بستر میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ بچوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد جب ہم دونوں واپس آ رہے تھے تو بیک نے گاڑی میں دس مین پٹرول ڈلوایا تھا۔ اتنی جلدی پٹرول کیسے ختم ہو گیا۔ میرے دل میں اچانک دوسو گھر کرنے لگے مگر میں نے انہیں جھٹک دیا۔ اس واقعہ کو ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک رات فون کی تیر گھنٹی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ جبکہ اس وقت بھی بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں نے رسیدو رٹھا یا۔ یہ جبکہ کافون تھا۔
 ”جان! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں جگا

دیا۔ مگر میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر مجھے دیر ہوگئی تو میں فون کر دیا کروں گا۔ یاد ہے۔“
 ”ہاں اچھی طرح یاد ہے۔“
 ”میں آئرن کو چھوڑ کر آ رہا تھا تو اچانک آگے کا دائیں طرف والا پہرہ بچکر ہو گیا۔ میں نے ابھی ایک ورکشاپ فون کیا ہے وہ اپنا ماسٹر کی بھیج رہے ہیں۔ تم مگر مندمت ہوتا۔“ اس نے فون بند کر دیا اور میں بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن جبکہ جبکہ سویا ہوا تھا۔ میں بچوں کو چھوڑنے سکول گئی تو واپسی پر وہی پہرہ بچکر ہو گیا جس کے متعلق جبکہ نے مجھے بتایا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سامنے ہی ورکشاپ نظر آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اب بچکر لگا ہی لیتی ہوں۔ پھر جبکہ کو کہوں گی کہ تاثر ٹیوب تبدیل کرے۔ مگر جبکہ ملکیت نہ تاثر کھولا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرانگی ہوئی کہ وہ بالکل نئی ٹیوب بھی اور اس کا واضح پچر وہی تھا جو لگنے والا تھا۔

ایک بار پھر خوفناک دوسو گھر کرنے والی میں گھر کرنے لگے۔ اب میں وہ تاثر کھولنے کی جو وہ آئرن کو گھر چھوڑنے کے لیے صرف بتا رہا تھا۔ وہ پہلے اس کے گھر سے واپسی پر ایک گھنٹہ صرف لگتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تاثر بڑھ گیا۔ میرے استغفار پر کوئی نہ کوئی معقول بہانہ دیتا۔ آخر ایک دن میرے صبر کا پیمانہ بڑھ گیا جب اس نے گاڑی کے کار بورڈ پر خرابی کا بہانہ کیا۔ میں نے بڑھ دوڑی۔ ”دو گھنٹے پہلے انجن خراب ہو گیا تھا۔ پھر میری جواب دے گئی اور اب کار بورڈ پر نقص پیدا ہو گیا ہے۔ کیا تم گاڑی کو ماڈل تو بدلتا نہیں چاہتے۔“

میرے درشت رویے سے جبکہ کو صرف اتنا فرق پڑا کہ اگلے آٹھ دن میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور جبکہ وقت پر گھر پہنچا رہا۔ ایک رات جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹا تو آئرن اپنے گھر جانے کے لیے تیار تھی۔

”تم تھکے ہوئے ہو جبکہ کیوں نہ میں آئرن کو

گھر چھوڑ آؤں۔“
 ”یہ کیا بچوں والی بات کر رہی ہو۔“ وہ چلانے کے سے انداز میں بولا۔
 ”تم تھکے ہوئے ہو۔“ میں نے دہرایا مگر اس نے میری ایک نہی اور آئرن کو گاڑی میں بٹھا کر لے گیا۔ آپ میری حالت کا تصور کریں۔ ایک بیوی کے سامنے ایک عورت اس کے شوہر کو اس سے چھین رہی ہے اور وہ اسے اپنے گھر آنے سے بھی نہیں روک سکتی کیونکہ پھر خاوند کے ناراض ہونے کا ڈر ہے اور عورت کی تو کل کا کائنات ہی اس کا شوہر ہوتا ہے۔

اولاد سے بھی پیار ناں باپ سے بھی عزیز۔
 جبکہ تقریباً تین گھنٹے بعد واپس آیا۔ میں نے رات آنکھوں میں کافی نمی اور ابھی تک اس کے ہاتھوں میں چاک رہی تھی۔ اس کے آتے ہی میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں نے رندمی ہوئی آواز میں اس سے التجائی کہا کہ اس کا آئرن کے ساتھ کوئی چکر پل رہا ہے تو مجھے آگاہ کر دے۔ اس نے مجھے تانے کی بہت کوشش کی مگر آج میں تہیہ کئے ہوئے تھی کہ اس سے پوچھ کر ہی رہوں گی۔ آخر اس نے اس چیز کا اعتراف کر لیا کہ وہ آئرن کے پاس رات گئے تک بیٹھا رہا تھا۔ پھر اس نے دھیسے لہجے میں کہا۔ ”مجھے شادی کے لیے ایسی ہی عورت کی ضرورت تھی۔ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ اچھا ہوا کہ تم نے خودی مجھ سے پوچھا اور نہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرنا ہوتا۔“
 ”آئرن مجنی تم سے محبت کرتی ہے۔؟“ میں نے پرسکون لہجے میں سوال کیا۔ میں اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو لپٹوں تک نہیں لانا چاہتی تھی۔
 ”ہاں وہ تمہی اچھی ہے۔“

میں نے جبکہ کو بتایا کہ وہ اس سے کئی سال بڑی تھی۔ ”ایک عمر رسیدہ عورت نے تم پر چند ڈال دیا ہے تم اس کے جال میں پھنس گئے ہو۔“
 ”اس میں کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ عمروں کا تضاد یا کوئی اور عنصر اسے نہیں

بدل سکتا۔“ چند لمبے خاموش رہنے کے پھر بولا۔
 ”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس کے ساتھ رہ سکتی ہو تو ٹھیک درجہ مجھے طلاق دے دو۔“
 مجھ پر گویا بجلی گر پڑی۔ مجھے خود سے زیادہ بچوں کی فکر تھی۔ کیا وہ سوئٹھی ماں کے ساتھ رہ سکیں گے۔ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ میں انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ کیونکہ جبکہ کے بعد اس دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ جس کے پاس جا کر میں نہا۔ تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آئرن کی موجودگی میں جبکہ سے بات کروں گی۔ شاید عورت ہونے کے ناطے آئرن کا دل بھیج جائے۔ دوسرے دن آئرن آئی تو میں نے اسے بالوں کو اچھی طرح سیٹ کیا ہوا تھا اور لباس بھی چن کر پہنا تھا کہ آئرن سے اچھی نظر آ سکوں مگر آئرن کو دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ حسن کے معاملے میں مجھ سے برتر ہے برتر ہے۔ یہ ایک سخت مقابلہ تھا۔ جبکہ غسل کر کے ہاتھ دھو رہی تھی۔ لکڑا اور جلدی جلدی ناشیدہ کر کے بچوں کو اسکول چھوڑنے چلا گیا میں نے اسے جلدی واپس آنے کے لیے کہا کیونکہ آج ہمیں ایک فیصلہ کرنا تھا۔ آئرن خاموش خاموش نظر میں جھکائے بیٹھی تھی۔ جی کے آنے پر جب میں نے یہ مسئلہ اٹھایا تو آئرن نے کاب پٹھ کر کہا۔ ”ایلن یقین کرؤ میں یہ سب نہیں چاہتی تھی مگر جبکہ نے خودی پیش قدمی کی تھی۔ اس نے بہت سی تباہی دہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے تمام ضروریات زندگی مہیا کرے گا۔ ان میں بچے بھی شامل ہوں گے۔ کچھ دیر بچے ایلن کے پاس رہا کریں گے اور زیادہ دیر تمہارے پاس۔ ہمارے درمیان یہ سب بٹے ہو گیا تھا۔“

میں پریشان نظروں سے آئرن کو دیکھ رہی تھی۔ اس حسین ساتھ نے میرے شریک حیات کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ میرے سر کا سایہ سر کا لیا تھا۔ گو وہ مجھ سے دس سال بڑی تھی۔ پھر بھی اسے ہر مرد اپنا سکتا تھا۔
 جبکہ کچھ کہہ رہا تھا مگر میں آئرن کے حسن میں

اس طرح توختی کہ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔
جیک مجھے احمقانہ انداز میں تسلی دے رہا تھا۔
”ایٹن میں اب بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔“
مجھے اس شخص پر بہت آیا کیونکہ وہ غلام تھا۔ وہ
آئرن کے لیے پاگل ہو رہا تھا اور مجھے پیار کا یقین دلا
رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ آئرن بھی میرے ساتھ
رہے۔ مگر میں نے ایک عورت کو اپنے شوہر کی باتوں
میں دیکھنے کی بجائے طلاق کو ترجیح دی۔
آج اپنی کوٹھی میں نے اپنے ارادے سے
باخبر کر دیا تھا۔ اس ہفتے کے آخر میں جیک کو اس گھر
سے چلے جانا تھا مجھے چھوڑ کر۔ مجھے طلاق دے کر.....
میں کھانا پکاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ میں
دوبارہ جیک کا دل جیت لوں۔ اگر میں روزانہ بیوی
پارلر سے بال سیٹ کراؤں بہترین لباس پہنوں اور
اس کا پہلے سے زیادہ خیال کروں تو کیا جیک اپنا ارادہ
تبدیل کر سکتا ہے! پھر میں نے اپنے خیالات کو
دماغ سے جھٹک دیا۔ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ
نہیں تھا۔ اتنے میں جیک بچوں کو اسکول سے لے کر آ
گیا۔

وہ سب کھانے کے ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں
نے کھانا لگایا۔ وہ سب بڑی خوشی سے کھانا کھا رہے
تھے مگر میرا تخی نہیں جانتا تھا کہ میں ایک لمحہ بھی لوں۔
میرے شوہر کو چند دنوں تک مجھ سے چھن جانا تھا پھر
مجھے بھوک لگتی۔ میں کھانے کی میز سے اٹھ گئی۔
اس موقع پر جیک نے مجھے عجیب قابلِ رحم نظروں سے
دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کمرے تک آیا اور اس نے
ایک بار پھر مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی
کہ میں آئرن کے ساتھ ہی رہوں۔ مگر میں یہ ہرگز
برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔
ہر وقت سوچنے سے میرے سر میں مشکل درد
رہنے لگا۔ آخر ایک رات یہ درد ناقابلِ برداشت ہو
گیا۔ میں کسی ذہنی پرندے کی طرح تڑپنے لگی۔
میرے حلق سے چیخیں بلند ہوئیں جیک مجھے گاڑی
میں ڈال کر ہسپتال لے گیا۔ جی معانے کے بعد

ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ ذہنی صدمے کی وجہ سے
برین ہیرتج ہونے کا خطرہ ہے۔ مجھے ہسپتال داخل ہونا
پڑا۔ کل جی کو آئرن سے شادی کرنا بھی مگر اس نے
مجھ سے وعدہ کیا کہ جب تک میں ٹھیک نہ ہو جاؤں۔
وہ آئرن سے شادی نہیں کرے گا۔ میں نے سچے دل
سے دعا مانگی کہ خدا کرے میری صحت بھی ٹھیک نہ
ہو۔ مگر فرائی مجھے اپنے بچوں کا خیال آ گیا۔
”جیک مجھے ہسپتال میں ایک ہفتہ لگ جائے
گا۔ بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔“
کچھ دیر سوچنے کے بعد جیک نے کہا کہ وہ
فل ٹائم کے لیے ایک ہاؤس کیکر کا بندوبست کرے گا
جو گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ بچوں کی دیکھ بھال
بھی کرے۔

اس لمحے مجھے خیال آیا کہ اب بھی موقع ہے کہ
میں جیک کو اپنی وقت کا احساس دلا سکوں۔ میں نے
ازدواجی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے ایک بہت بڑا
جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔
”مگر جیک فل ٹائم ہاؤس کیکر کے آگے
ہمارے بجٹ کا ستیاناس ہو جائے گا۔ ہر اس کے
اخراجات ادا نہیں کر سکتے اور پھر خدا جانے ہسپتال کا
بل کتنا زیادہ ہو۔“
”تو پھر؟“ وہ پریشان ہو گیا۔
”سنوتم چند دنوں کے بعد آئرن سے شادی تو
کر ہی رہے ہو۔ اسے گھر لے آؤ۔ وہ یہ سب
فرائض انجام دے جو میں دیتی ہوں۔“
”مگر.....“
”مگر وہ کچھ نہیں۔ وہ جان کے کمرے میں سو
جایا کرے گی اور گھر کو اچھی طرح چلا سکے گی جیسا
تمہارا خیال ہے؟“

”خیال کیا“ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ نہ صرف
پورے گھر کو سنبھال سکتی ہے بلکہ بچوں کی تربیت بھی
ٹھیک طرح کر سکتی ہے۔ کیونکہ بچے اس سے بہت
پاؤں ہیں۔ بہر حال سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ
آئرن کے آنے سے ہماری کافی فم فم جانی گئی۔“

آخر میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔
میں ایک بھوکلی بیٹی کی مانند لپٹائی ہوئی نظروں سے
دودھ کے اس پیالے کو دیکھ رہی تھی جو میرے شوہر
کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔
دوسرے دن بہت سے عزیز میری عیادت کے لیے
ہسپتال میں آئے۔ بچے بھی خوب صورت پھولوں کا گلہ ستر
لیے مسکرائی ہوئی آئی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آئرن
میری جگہ لینے کے لیے گھر آگئی ہے تو اس نے غصے سے
میری طرف دیکھا اور مجھے برا بھلا کہنے لگی۔
”جینی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ دونوں ہاتھ
ایک دوسرے کے لیے پہلے سے زیادہ پاگل ہو جائیں گے یا
پھر ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے۔“

”تم جو چاہو سو جو میرے خیال میں تم جیک کو
واپس لینے کا موقع تم کر دو گی۔ وہ اور آئرن اتنے
مطمئن ہو جائیں گے کہ تمہیں بالکل بھلا دیں گے۔“
جینی مجھ سے نا اطمینان ہو کر واپس چلی گئی۔ شام کو
جیک تمام بچوں کو لے کر ہسپتال آیا تو مجھے سچے سچے دل کر
بہت خوش ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ میں گھر کب تک
آؤں گی۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے کچھ دن لگ جائیں
گے مگر اس دوران آئرن تمہارا خوب خیال رکھے گی۔
”ٹھیک ہے۔“ جان نے غصہ نہ کرنا سانس بھری۔
”مگر وہ ماں نہیں۔ وہ تمہارا قسم البدل نہیں ہو سکتی۔ تم
جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔“

اگلے دن بچے مجھے سارا دن فون کرتے رہے
اور یہی کہتے رہے کہ جی جلدی گھر آ جاؤ۔ اسی طرح
پانچ روز گزر گئے۔ بچے میری خبریت دریافت
کرتے رہے اور جینی میرے لیے پھول لاتی رہی۔
برسوں مجھے ہسپتال سے فارغ ہو جانا تھا مگر ابھی تک
مجھے اپنی لگائی ہوئی بازی کا نتیجہ نظر نہیں آیا تھا کہ
اجانک فون کی کھٹی بجی۔ یہ جیک تھا۔ اس نے گھبراہٹ
ہوئی آواز میں بتایا کہ میری کوسرہ نکل آئی ہے۔
میں نے اسے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں آئرن کو
کہو کہ وہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے۔
”گھر کی حالت بھی بہت اترے۔ آئرن زیادہ

کام نہیں کر سکتی۔“ وہ گھبرا کر کہتا رہا۔ ”وہ اچھی طرح گھر
بھی نہیں چلا سکتی۔ شروع میں تو اسے روکی پائی بھی نہیں
آئی تھی۔ وہ بچوں کی زیادہ مدد بھی نہیں کر سکتی۔ بچے اس
سے تنگ آ گئے ہیں۔ آئرن ان کی آیا تو تین سکتی ہے۔
مگر ہر روز ان کے کھانے پکڑے اور ان کی دیکھ بھال
اس کے بس کا روگ نہیں۔ وہ تو ابھی سے بدتر حالت
میں نظر آنے لگی ہے۔ چالیس سال کی پوروسی.....“
میں نے خاموشی سے فون بند کر دیا۔ شام کو جینی
آئی تو خوشی سے اس کا چہرہ گھٹا رہا تھا۔ وہ بولی ”تم
جیت گئی ہو ایٹن۔ تمہاری بہترین سوچ نے جیک کے
دل میں دوبارہ تمہارے لیے گھر بتا دیا ہے۔“ اس نے
پھر بتایا۔ ”جیک اور آئرن کی آپس میں خوب تو تھیں
میں ہوئی ہے انہوں نے ایک دوسرے کو گالیاں بھی دی
ہیں۔ وہ جیک کو چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“

دوسرے دن شام کو جیک اکیلا ہی ہسپتال آیا۔ وہ
شرمندہ ہاتھ اور بچھ سے آنکھ ٹکراتا نہیں کر رہا تھا۔
”تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ بہت اچھی ماں ہو اور
محبت کرنے والی بیوی ہو۔“ وہ ممکن نظروں سے مجھے
دیکھنے لگا۔ ”کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟“
”جیک کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“
”دنیا کی ہر چیز سے زیادہ۔“ وہ میری جانب
جھک گیا اور میرے سہری بالوں کو ہاتھوں کی انگلیوں
سے سہلانے لگا۔

ہسپتال سے چھٹی ملے پر جب میں گھر پہنچی تو
یہ بیٹے جان اور نام دروازے پر میرا انتظار کر رہے
تھے میں نے انہیں گلے لگایا اور اپنے آنسو پینے کی
کوشش کرنے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے جو میری
آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔
آخری بات یہ کہ میں اب خود پر بھی خوب توجہ
دیتی ہوں میک اپ کی پہلی ایلمر سے میرا چہرہ ہمیشہ
پرکشش رہتا ہے ہفتے میں ایک بار بیوی پارلر سے بال
چھٹی سیٹ کروائی ہوں کیونکہ اب میں نہیں چاہتی کہ
کوئی اور آئرن جیک کو مجھ سے چھین لے۔

.....



چودھویں قسط

لاوارث

غزالہ جلیل راؤ

انسان کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتا ہو، کسی بھی ملک میں رہتا ہو، جہاں اس سے پیار کرنے والے ہوتے ہیں، وہیں اس سے نفرت کرنے والوں کا وجود بھی اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اس کو زمانے کے گرم و سرد سے بچانے والے، اس کو سایہ فراہم کرنے والے اس کے لیے جان نہجھاور کرنے والے ہر جگہ، ہر علاقے میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہیں اس کے خلاف سازشیں کرنے والے، اس کی راہوں میں کانٹے بچھانے والے، اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے دوستوں کے روپ میں اس کے وجود کا حصہ بن کر رہتے ہیں۔

ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ، اس کے باپ کا پتا نہیں تھا۔ لیکن اس کو ایک نیک فطرت شخص کا سایہ میسر آگیا تھا۔ اس نے اسے ایک نئی زندگی دی تھی۔ لیکن اس کی زندگی کے دشمن بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی موجود تھے۔

قارئین عمران ڈائجسٹ کے لیے ایک سلسلہ وار انوکھی داستان



”کروڑوں کا سمجھو“

”اور آپ ان کی اکلوٹی بیٹی ہیں؟“

”نہیں، ہم دو بہنیں، تین بھائی ہیں۔“

”اوہ! یہ گڑبڑ ہوگئی۔“

”کیوں؟“

”محبت کی فتح میں ہیر و کن اپنے ماں، باپ کی اکلوٹی بیٹی تھی۔ اس لیے اس کے باپ کو اس کے سامنے جھکا پڑا۔ تمہارے والد بزرگوار بہت سخت آدمی ہیں کیا؟“

”ہیں تو سخت۔“

”بار پینٹ بھی کرتے ہوں گے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”میرے لیے کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا۔“

”نہیں! شیری بھائی ہمارے پشت پناہ ہوں گے۔“

”تم بہتر جانو، اب چلیں یہاں سے۔“

”چلو۔۔۔“ ایسے اٹھ گئی۔ محمد عرفان ایک ڈکار لے کر بولا۔

”بڑی مشکلات ہیں اس دنیا میں انسان کے لیے۔ مجھے دیکھو اب، پیٹ بھر گیا ہے لیکن عزت کا خطرہ ابھی باقی ہے۔“

”کیوں؟“

”اس دوران قرض لے کر کام چلاتا رہا ہوں۔“

قرض خواہ شکل دیکھتے ہی تقاضے شروع کر دیتے ہیں۔ کب تک جموٹے وعدے کروں اس سے۔“

”اوہ۔۔۔ واقعی! مگر سنو، ایک منٹ ٹھہرو،“

ایسے نے اپنا پرس کھول کر دیکھا۔ ہزار ہزار کے پانچ

نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ اس نے سارے نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

”نی الحال یہ رکھو، کل آؤ گے ہمارے ہاں تو میں تمہارے قرض کی ایک ایک پائی ادا کروں گی۔“

”میں کس طرح تمہارا یہ احسان اتاروں گا۔“

وہ گھوٹ کر لہجے میں بولا۔

”اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم

محسوس ہی نہ کرو۔ کل میں تمہیں سب سے ملواؤں گی، بتاؤ کس وقت آؤ گے؟“

”جس وقت آپ کہیں۔“

”کل گیارہ بجے آ جاؤ، میں انتظار کروں گی۔“

”اپنا پتا دے دو۔“ اس نے کہا اور ایسے نے

اپنی گٹھی کا پتہ دہرایا۔

”اچھا اللہ حافظ۔۔۔ آج ساری رات تمہیں

یاد کرتا رہوں گا ایسے اتم میری زندگی میں صبح بہار بن

کر آئی ہو۔ آہ! میں تمہارے لیے آسمان سے

ستارے تو ڈلاؤں گا۔“

”اللہ حافظ!“ ایسے اپنی کار میں جا بیٹھی اور پھر

کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ محمد عرفان آنکھیں

پھاڑے اس وقت تک اس کا روک دیکھا کہ جب تک وہ

نظر آئی۔ پھر اس نے جیب میں رکھے ہوئے نوٹ

تھپتھپائے۔

”واہ مالک سن لی تم نے۔“ وہ بولا یا اور آگے

بڑھ گیا۔

دوسری طرف ایسے سر دھکی۔ یہ غریب اسے

پسند تو نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کا دل جذبوں سے سرشار

تھا۔ مگر پہنچتے ہی اس نے شیری کی تلاش شروع کر دی۔

شیری اس وقت تو نہیں مل سکا تھا، لیکن رات

کو وہ ہاتھ لگ گیا۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ شیری بھائی! کتنی

دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”آئیے آئیے، ضرور کوئی خاص بات ہے۔“

”جی ہاں! بہت خاص بات، میں نے آپ کی

ہدایت پر بالآخر عمل کر لی ڈالا۔“

”بہت خوب، کون سی ہدایت بھئی۔“

”ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا، میں نے

ایک غریب آدمی کی نہ صرف مدد کی بلکہ اس سے محبت

بھی کر ڈالی۔“

”ارے، ارے، اتنی پھرتی سے۔“

”جی ہاں! آج کا کام کل پر کیوں اٹھا رکھا

جائے۔“

”ہائے، ہائے کون ہے وہ غریب جس سے آپ نے محبت کر ڈالی کس ایسہ اور وہ بھی اتنے دھڑلے سے۔“

”پوری کہانی سنانی ہے آپ کو۔“

”ارشاد۔۔۔ ارشاد۔“

”بس میں صائمہ کے گھر سے آ رہی تھی، ایک

نگنل پر گاڑی رکی تو وہ میرے پاس آ گیا اور بڑے

درد بھرے لہجے میں بولا کہ وہ غریب ہے، میرا دل

بھر آیا، میں نے ایک ریسٹوران میں اسے کھلایا

پایا۔ اس پر بہت قرض ہے۔ میرے پاس اس وقت

جو کچھ تھا اسے دے دیا۔ کل گیارہ بجے اسے آپ

سے ملانے کے لیے بلایا ہے۔“

”ملانے کے لیے۔“

”جی ہاں، آپ اسے دیکھ لیں تو پھر میں اس سے

محبت کروں۔“ ایسے نے اس سے پوچھا تھا کیا وہ

محبت کرے گا، وہ تیار ہے۔“

”کیا۔۔۔ شیری نے آنکھیں پھاڑ

دیں۔“

”ہاں، وہ بالکل تیار ہے۔“

”ارے باپ رے، وہ فقیر تھا نا؟“

”نہیں غریب تھا۔“ ایسے معصومیت سے

بولی۔

”اللہ تجھے سمجھے ایسے! کتنے روپے دیے

اسے؟“

”پانچ ہزار تھے، بس یہی تھے اس وقت۔“

”کل پھر سے کچھ دینا ہے؟“

”ہاں ضرور ہے بے پناہ۔“

”اور اس کے بعد آپ اس سے محبت کریں

گی؟“

”نہ کروں؟“

”شکل و صورت کا کیا ہے؟“

”اس پر تو میں تو غور نہیں کیا۔“

”باللہ! کس کس سے تذکرہ کر چکی ہو؟“

”ابھی تو کسی سے نہیں کیا۔“

”احسان ہے تمہارا بی بی۔ خدا کے لیے ابھی کسی سے اس کا تذکرہ بھی نہ کرنا، خدا کی بندی میرا یہ مقصد تو نہیں تھا کہ تم سڑکوں سے فقیر پکڑی پھرو۔“

”تو پھر کہاں تلاش کروں غریبوں کو، کیا وہ

کوٹیوں میں ملیں گے۔“ ایسے آنکھیں نکال کر

بولی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، کیا نام ہے اس کا؟“

”نام۔۔۔ نام۔۔۔“ ایسے یاد کرتے ہوئے

بولی۔

”ہاں محمد عرفان۔“

”اللہ واکبر! کل گیارہ بجے آئیں گے

موصوف۔“

”جی ہاں۔“

ٹھیک ہے ایسے! کسی اور سے نہ ملانا اسے خدا

کے لیے اور نہ ہی کسی سے تذکرہ کرنا۔ پہلے میں اس کا

جائزہ دوں، پھر تمہیں اس بارے میں بتاؤں گا۔“

”اوکے!“ ایسے نے بڑے اطمینان سے کہا

اور پھر تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد وہ چلی

گئی۔ لیکن شیری کے دیوتا کوچ کر گئے تھے۔ اتنا

معصوم بھی نہیں جھٹکتا تھا ایسے کو اسے گمان بھی نہیں تھا

کہ ایسی حماقت کا ثبوت دے گی۔ بڑی مضحکہ خیز

بات بھی۔ سوچو تو کتنی آئے، لیکن۔۔۔

دوسری صبح اس نے اپنے سارے پروگرام

ترک کر دیے اور دادا تو عاقل کے ساتھ ”اپنا گھر“

چلے گئے تھے۔ دس بجے باپری صاحب بھی مل گئے۔

ذرا اطمینان ہوا تھا۔

گیارہ بجے ایسے گٹھی کے گیٹ کے پاس پہنچ

گئی اور پھر شیری نے اسے ایک نوجوان کے ساتھ

آتے دیکھا۔ یہ ہی حضرت محمد عرفان تھے، کل کے

پیپروں نے کام دکھایا تھا۔ نئی چٹون پہنی تھی، سرخ

رنگ کی دھاری اور جرسی تھی۔ چٹون کے پائینے نیچے

سے مڑے ہوئے تھے۔ گلے میں گہرے نیلے رنگ کا

اسکارف بندھا ہوا تھا۔ بالوں میں تیل چڑھا ہوا تھا۔

اس تیل سے چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ پان کی دھاری

ہونٹوں پر ہاتھ میں پھڑی بھی تھی۔ شیری کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔
”مجھے عرفان ہیں۔“ البیہ نے تعارف کرایا۔
”تم اندر جاؤ۔“ شیری سخت لہجے میں بولا اور البیہ اسے چونک کر دیکھنے لگی۔ شیری نے عرفان کا بازو پکڑا اور اسے لیے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

البیہ ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی تھی۔ بہر حال اس نے شیری کی کوئی مصلحت بھی اور اندر چلی گئی۔ عرفان کے بازو پر شیری کی گرفت بہت سخت تھی۔
”تو تم وہ عرفان۔“ شیری فرمایا۔

”جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ انہوں نے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا۔“
”ہاں بتایا تھا، بے فکر ہو، پولیس آنے ہی والی ہے۔“

”ہیپ۔۔۔ پولیس۔“
”کتنے روپے دیے تھے اس نے۔“
”پانچ ہزار روپے۔“
”اور آج تم اس سے مزید روپے لینے آئے تھے؟“

”انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا۔“
”یہ تو پولیس تم سے پوچھنے کی کہنے، جان بچ گئی تیری اس کے ہاتھوں، اس پر خدا کا شکر ادا کرو۔“
”خدا کے واسطے، آپ ان سے پوچھ لیں۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی کہنے لگیں کہ مجھ سے محبت کرو گے۔“

”اور تو نے محبت شروع کر دی۔ پولیس تم جیسے لفتکوں سے خوب پھٹنا جاتی ہے۔ اگر وہ لڑکی تجھ سے محبت شروع کر دیتی تو اس وقت تو اسپتال میں ہوتا۔“
”اسپتال میں۔۔۔ کیوں؟“

”وہ پاگل ہے۔۔۔ دماغی توازن خراب ہے اس کا۔ ایک نوجوان نے اسے دھوکا دے دیا تھا۔ اب جب بھی اس پر درود پڑتا ہے وہ کسی کو پکڑ لاتی ہے۔“ اخبار دیکھتے ہوئے۔

”نہیں۔“

تین نوجوانوں کو شدید زخمی کر چکی ہے۔ اب وہ اسی طرح دھوکا دے کر کسی کو لکھی میں پلائی ہے۔ اسے اپنے کمرے میں لے جاتی ہے اور پھر اس پر جنون سوار ہو جاتا ہے۔ وہ چھرے سے حملہ کر دیتی ہے۔ پچھلی بار تین چھرے مارے تھے ایک نوجوان کو۔“

”ارے مر گیا حافظی! بیب بیا لیا تم نے مجھے استاد۔ نکل جانے دو ایک بار نکل جانے دو میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا قسم آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ پولیس سے بھاؤ مجھے۔“

”نہیں، نہیں محبت کرو، کرو محبت۔“
”جانے دو بھائی صاحب! اب بھی ادھر کارخ بھی نہیں کروں گا۔ جانے دو مجھے۔“ وہ دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔

”اے جانا کدھر ہے۔“
”برائی آتے ہی ہوں گے بس۔“
”بھائی! اسے پکڑنے دو، آئین محمد عرفان نے دروازہ کھول کر باہر نکلا ہے۔ لگا دی تھی۔ شیری اس کے پیچھے لپکا، لیکن اس نے اسے پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

البیہ دور سے شاید بے مظر دیکھ رہی تھی۔ حیران پریشان شیری کے پاس پہنچی۔

”وہ۔۔۔ وہ بھاگنے لگوں گیا، کیا ہوا تھا اسے۔“
”یار البیہ! اتنی احمق نکلوی اس کی امید نہیں تھی۔“

”کیوں کیا ہوا؟“
”مشکل دیکھی تھی اس کی، آدمی لگ رہا تھا؟“
”لگ تو نہیں رہا تھا لیکن غریب تھا۔“

”خدا کی بناء، اگر تم سے کہیں زیادہ چالاک ہے تم اتنی معصوم نکلوی، مجھے شبہ بھی نہیں تھا۔ کہاں تو وہیم کی یہ حالت بنا دی اور کہاں ایک فقیر کو پیچھے لگا لائیں۔“
”فقیر۔۔۔؟“

”تو اور کیا۔۔۔ غریب اس طرح مردکوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ میں نے ایسے غریبوں کے بارے میں تو نہیں کہا تھا۔ وہ تو تنگ گیا تھا البیہ۔۔۔! یہاں سے کوئی ممتی چیز اٹھا بھاگتا اور بس ایسے غریبوں پر تو خود بخود دینی چاہیے۔ لوگ کیا کہتے تمہارے بارے میں۔“
”تو مجھے کیا معلوم تھا۔“

”خیر یہ ہی شکر ہے دوسرے لوگوں کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ لوگ مذاق اڑاتے تمہارا۔ البیہ! اب تم کسی غریب کے بارے میں کچھ نہ سوچنا۔ میں تمہارے لیے انتخاب کروں گا۔ تم سے مشورہ کروں گا اور پھر ہم کام کریں گے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“
”وفاقی بڑا عجیب تھا وہ۔ اس نے تجلی کشادہ دل لیا تھا بالوں میں۔ میں نے تو بس غریب ہونے کی حیثیت سے برداشت کر لیا تھا۔“
”خدا کے واسطے آئندہ کسی غریب کو اس طرح منہ نہ لگانا۔“

”کیوں میں پاگل ہوں۔ بس ایک بار غلطی ہوئی۔“ البیہ شرمندہ سے لہجے میں بولی۔

البیہ کو سمجھا بھا کر وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ درحقیقت یہ البیہ کی معصومیت کی انتہا تھی۔ حالانکہ انہیں خاصی لڑکی کی لیکن باہر علی صاحب کا کوئی بھی بچہ شاطر نہیں تھا۔ البیہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی اور غریبوں سے محبت کرنے کا یہ طریقہ نکال ڈالا تھا۔ اس لیے بہر طور شیری نے فیصلہ کیا کہ ان معاملوں میں بھی اسے محتاط رہنا پڑے گا۔

دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اگر باہر علی صاحب کو یہ بات معلوم ہو جاتی اور پتا چلا کہ یہ سب شیری کے اشارے پر ہو رہا ہے تو بات یقیناً بگڑ جاتی اور اس طرح بگڑتی کہ شیری کے لیے سنیانا مشکل ہو جاتا۔

شکر تھا کہ حضرت محمد عرفان اس طرح اس کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ان کی امیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔

بڑی دیر تک وہ پریشان سا بیٹھا رہا۔ پھر تیار

ہو کر باہر نکل آیا۔ ”اپنا گھر“ جانے کا ارادہ تھا۔ برآمدے میں پہنچا تو اس نے ایک خوب صورت سی چھپائی کار پور کیوں رکھتے دیکھی۔ پتہ نہیں کون آیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رک کر کار سے اترنے والے کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک خوب صورت سے خدو خال کی نوجوان لڑکی آنکھوں پر سنہرے فریم کے گلاسز لگا کر لڑکی تھی جو خاصی عمدہ لگ رہی تھی۔

شیری کو دیکھ کر اس نے انگلی سے اشارہ کیا کہا۔ ”ہیلو مجھے پہچانا۔“ شیری آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”بد قسمتی سے میری کہ نہیں پہچان سکا فرمائیے کس سے ملاقات کرنی ہے آپ کو۔“

”وہ عاقل صاحب نہیں رہتے ہیں نا۔ ویسے میں نے انہیں نمائش گاہ میں دیکھا تھا۔ تصاویر کو نیلام تم ہی کر رہے تھے نا۔“

”اوہ! جی ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ اب میں پہچان گیا آپ کو شاید آپ نے ایک تصویر بھی خریدی تھی۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں وہی وہی۔“ آبرو“ میں نے خرید لی تھی۔“

”سبحان اللہ بڑا اچھا کیا تھا آپ نے۔ کسی گلی کی تو تصویر آپ کو۔“

”بہت خوب صورت، بہت پیاری، میں نے اسے اپنے بیڈ روم میں فریم میں کر کے آویزاں کیا ہے۔ عاقل صاحب کہاں ہیں؟“

”معاف کیجئے گا، آپ عاقل صاحب کو کیسے جانتی ہیں؟“

”کمال ہے اس وقت ملک میں کون نہیں جانتا۔ وہ تو پھر رسم نکلے۔ خود اپنی تصویروں کی نمائش بھی نہ کی۔ پتا ہی نہ چل سکا لوگوں کو کہ فن مصوری کے آسان پر ایک ایسا ستارہ بجھا رہا ہے۔ خود کمائی میں زندگی بسر کی اور اس لڑکی کو۔“ کیا نام ہے اس کا وہ جس کی تصویروں کی نمائش ہوئی تھی۔“

”نفسیہ باہر علی۔“ شیری نے جواب دیا۔

”جی ہاں۔۔۔ جی ہاں، اسی کے بارے میں
ہی بات کر رہی ہوں اور اس لڑکی کو انہوں نے زمین
سے آسمان پر پہنچا دیا۔“

”آپ نفسہ سے واقف ہیں؟“

”نہیں، مجھے نہیں، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا
اسے، حالانکہ باہر علی صاحب مشہور آدمی ہیں۔“

”جی ہاں۔۔۔ جی ہاں! عاقل صاحب کو آپ
اس سے پہلے سے جانتی ہیں یا بس نمائش ہی میں
دیکھا تھا۔ ویسے میں نے ان کو آپ کے قریب کی بار
دیکھا ہے۔“

”ہاں، یعنی، ہم دونوں میں گہری اثر
اسٹینڈنگ ہوئی ہے۔ عاقل صاحب مجھے پسند کرتے
ہیں اور میں انہیں، اس وقت میں ان ہی سے ملنے آتی
تھی۔“

”پپ۔۔۔ پسند کرتے ہیں آپ کو۔“ شیری
ہکلا کر بولا۔

”ہاں۔۔۔ کیوں آپ کو حیرت کیوں ہوئی؟“

”آئیے نا اندر۔“

”کیا عاقل صاحب موجود نہیں ہیں؟“

”جی نہیں، وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“

”اور ان کے اہل خاندان؟“

”ان کے اہل خاندان میں کوئی نہیں ہے
محترمہ، بس وہ تنہا ہی ہیں۔“

”بہیں رہتے ہیں نا وہ۔“

”کیا آپ کو انہوں نے یہاں کا بتایا تھا۔“

”نہیں، میں خود ہی پتا لگاتی ہوئی پہنچی ہوں۔
مجھے ہی میں کچھ نہیں آیا کہ ان سے کہاں رابطہ
کروں۔ کئی بار یہاں ملٹی فون بھی کیا لیکن اتفاق
سے وہ ٹیبلن فون پر بھی نہیں مل سکے۔“

”جی ہاں۔۔۔ جی ہاں، وہ یہاں نہیں
رہتے۔“

”پھر کہاں رہتے ہیں؟“

”آئیے۔۔۔ میں آپ کو ان سے ملا دوں۔“

شیری نے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔ اچھا، یو تھنک یو جیلے۔“ لڑکی
تیار ہو گئی اور شیری جلدی سے اس کے ساتھ کار میں آ
بیٹھا۔ عاقل کی یہ شناسا بہت سے محل کھلا سکتی تھی۔
شیری نے اس سے پہلے اس بات پر غور نہیں کیا تھا
لیکن اب اسے یہ لڑکی اچھی طرح یاد آ گئی تھی کئی بار
اس نے اسے عاقل کے ہمراہ دیکھا تھا لیکن وہ خود اتنا
معروف تھا کہ یہ اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ وہ عاقل
کے اتنا قریب کیوں ہے۔ بس وہ یہ ہی سمجھا تھا کہ
نمائش میں آنے والی کوئی لڑکی ہے جو تصاویر میں
دیکھی لے رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی
عاقل میں دیکھی رکھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کار
اشارت ہو کر گلی سے باہر نکل آئی۔ پپ تنہا کسی نے
ان دونوں کو کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا یا نہیں،
ویسے کوئی بھی دیکھ لیتا تو شیری کا کوئی ایسا معاملہ نہیں
تھا کہ کسی اور کو اس سلسلے میں کوئی تشویش ہوتی۔
بہر حال گلی سے باہر آ کر اس نے سکون کی سانس لی
تھی۔

ایک محترم غریب آئے تھے اور اب یہ دولت
مند خاتون ایک عرب کی تلاش میں شریف لے آئی
تھیں۔ ان کے انداز سے تو یہ ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ
شاید مجھ پر نظر ثانیات کچھ خاص ہی قسم کی ہے۔ بہر گز
شیری کے لیے اسے کھول لینا کچھ مشکل کام نہیں تھا۔
”میں آپ کے نام سے واقف نہیں ہو سکا۔“

اس نے کہا۔

”حالانکہ آپ نے میرے نام پر تصویر کی رسید
بتائی تھی۔ مجھے آمنہ جاوید کہتے ہیں۔“

”خوب۔۔۔ بہت خوب۔“ ادا جی آپ بادلوں
بھری جگ ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ! آپ نے عجیب انداز میں
میری پذیرائی کی ہے۔“

”عاقل سے آپ کا کیا ناتہ ہے۔“ اس نے
بے تکلفی سے پوچھا اور آمنہ جاوید کے چہرے پر
شرم کے آثار چھیل گئے۔

”وہ میرے سب سے کچھ ہیں۔“ اس نے شرماتے

ہوئے لہجے میں کہا اور شیری کے حلق میں پھندہ سا
لگ گیا۔ یہ نیا شوشا تھا۔ ایک ناقابل یقین بات تھی
لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔

اب مسئلہ ان آمنہ صاحبہ کو سنبھالنے کا تھا۔ ان
کے لیے کہا، کیا جائے۔ شیری نے تھوڑی دیر تک
عاقل کی تلاش کے بہانے انہیں سیر کرائی، اس
دوران اس نے آمنہ جاوید کے بارے میں کافی
معلومات حاصل کر لی تھی۔ وہی تھی جو ہونا چاہیے
تھی۔ یعنی ایک بگڑی ہوئی رئیس زادی۔ جاوید ہاشمی
دولت مند انسان تھے اور بیٹی کو ناز و نعم سے پال رہے
تھے۔ کچھ دیر سیر کرانے کے بعد اس نے ان سے
معذرت کر لی اور بہت جلد عاقل سے ملانے کا وعدہ
کر لیا۔ آمنہ جاوید اس وقت تو رخصت ہو گئی لیکن وہ
آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی مخلوق نہیں معلوم ہوئی
تھی۔

اس لڑکی بھی وہ اچانک کوشی پر پہنچ گئی۔ شیری
ہی سے سامنا ہوا تھا۔

”تم۔۔۔“

”خادم۔“

”عاقل ہیں؟“

”قسمتی سے نہیں ہیں۔“

”جی ہوتے بھی ہیں؟“

”بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ انتخاب
ہی ایسے وقت کا کرتی ہیں جب وہ نہیں ہوتے۔ لیکن
اگر آپ چاہیں تو ان کی والدہ سے مل سکتی ہیں۔“

”والدہ۔۔۔“ آمنہ چونک پڑی۔

”ہاں۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیا والدہ کوئی حیران
کن چیز ہوتی ہے۔“

”مگر تم نے تو اس دن کہا تھا کہ اس کے اہل
خاندان میں کوئی نہیں ہے۔“

”اہل خاندان آپ کے کتنے ہیں؟“

”افو! تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”ماں خاندان گر ہوئی ہے۔ وہ اہل خاندان
نہیں ہوئی۔“

”تم سے جیتنا مشکل لگتا ہے۔ چلو مجھے ان سے
ملاؤ۔“

حمیدہ بیگم نے اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا
تھا۔

آمنہ نے کہا۔

”اب تمہاری موجودگی ضروری نہیں ہے۔“

”اوکے۔۔۔“ شیری وہاں سے ہٹ گیا۔

”بیٹو بیٹی، کون ہو تم؟“

”عظیم ماں کے عظیم بیٹے عاقل کی پرستار۔“

آپ کو ایسے نئے کار کو جنم دینے کی مبارکباد پیش کرنا
چاہتی ہوں۔“

”شکریہ! تم کیا کرتی ہو۔“

”عیش۔۔۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہوں،
یوں مجھے قسمت کی دیوی ہوں اور آپ پر مہربان ہونا
چاہتی ہوں۔“

”مجھ پر۔۔۔؟“

”ہاں! میں عاقل کو ان کا اصل مقام دینا چاہتی
ہوں۔ میری دولت ان کا فن۔ اوہ مائی گاڈ۔۔۔ آپ
نہیں جانتیں کیا ہو جائے گا اور پھر میں عاقل کو چاہتی
بھی ہوں۔“

حمیدہ بیگم نے اسے تعجب سے دیکھا۔ یہ بے باکی
انہیں عجب لگی تھی۔ لیکن بہت بڑے باپ کی بہت
بڑی بیٹی سے کچھ عید نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے نچھل
کر کہا۔

”کیا کرتے ہیں تمہارے ڈیڈی؟“

”کوئی ایک کاروبار کرتے ہوں تو بتاؤں۔“

آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا۔“

”کیا نام ہے ان کا؟“

”جاوید ہاشمی۔“ آمنہ نے کہا اور حمیدہ بیگم کے
بدن کو ایک جھٹکا لگا۔ ان کا چہرہ پتلا پڑ گیا۔ پھر
اجانک ان کے بدن میں تھر تھری سی پیدا ہوئی۔ پھر
حلق سے کچھ پچھ پچھ آواز سن گئیں اور پورے
بدن سے پسینہ اگل آیا۔ آمنہ ان کی یہ حالت دیکھ کر
متوش ہو گئی۔

میزم۔۔۔ اودہ مانی گاڑ، ہنسونم کھاں گئے۔۔۔ شیری
دور نہ تھا دوزخا ہوا اندر گیا
”دیکھو، انہیں کیا ہو گیا۔“
شیری نے حمیدہ بیگم کو دیکھا اور بری طرح گھبرا
گیا۔

”ارے کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا انہیں۔“
”ہاں نہیں، اچھی خاصی باتیں کر رہی تھیں۔ تم
انہیں دیکھو میں چلتی ہوں۔“ آمنہ چوری ہو کر باہر
نکل گئی۔ شیری، حمیدہ بیگم کو سنبھالنے لگا، لیکن زیادہ
مشکل نہ پیش آئی۔ رفتہ رفتہ وہ اعتدال پر آ گئی
تھیں۔

”کیا ہو گیا تھا آپ کو ای؟“
”اہ۔۔۔ کچھ نہیں، ایسے ہی طبیعت مجھ گئی
تھی۔ اب ٹھیک ہوں، وہ بے چاری چلی گئی۔“
”ہاں۔۔۔ لیکن کچھ تو۔“

”یقین کرو۔۔۔ کوئی بات نہیں تھی، کیا سوچتی
ہو گی بے چاری دل میں۔“
”یقین کرو۔۔۔ لیکن نہ جانے کیوں
شیری کے دل میں ایک پھانسی کی چھب گئی تھی۔ کچھ
ہے۔۔۔ کچھ ضرور ہے۔“

حسب پروگرام حیدر علی صاحب نے اعلا حکام
کو ”اپنا گھر“ کے معائنے کی دعوت دی اور تاریخوں
کے تھوڑے سے رد و بدل کے بعد یہ دعوت منظور کر لی
گئی۔ حکومت خود اس عظیم الشان منصوبے سے متاثر
تھی۔ چنانچہ یہ بینک کا میاب بری اور حکام نے خود
ان لوگوں کو ان کی ضروریات کے حصول کے لیے
مختلف راستے بتائے اور خود بھی ہر طرح کے تعاون کا
یقین دلایا۔ بہت سے منصوبوں پر بات چیت ہوئی
جن کی تکمیل کے لیے حکومت کی طرف سے بھی امداد
کی پیش کش کی گئی۔ چنانچہ کئی دن اسی طرح
مصروفیات میں گزرے، دوسرے تمام پروگرام ملتوی
کر دیے گئے تھے اور تمام لوگ ”اپنا گھر“ کی تزئین
کے لیے کوشاں ہو گئے تھے۔

اور اب صرف آخری مراحل رہ گئے تھے اس
کے بعد ”اپنا گھر“ کا افتتاح ہونا تھا۔ اطلاع ملی تھی
کہ باہر علی صاحب بھی غیر ملکی دورے سے واپس
آ رہے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بھلا یہ عظیم کام
کسے ہو سکتا تھا۔ تقریباً بیس دن شدید مصروفیت کے
گزرے۔ عاقل اور بدر بھی شانہ بٹانہ رہے تھے۔
صغورہ وغیرہ اس معاملے میں کسی کام کے نہ تھے۔ اس
لیے ان لوگوں کو کسی کام میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔
ایک دوپہر کو شیری وغیرہ ”اپنا گھر“ کے شان دار
دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ملازم نے ایک کارڈ لا کر
دیا سرخ رنگ کا بے حد خوب صورت کارڈ تھا جس پر
”آمنہ جاوید“ لکھا ہوا تھا۔ کارڈ دادا ابو نے دیکھا اور
پھر شیری کی طرف بڑھا دیا۔

”اوہ! کہاں ہیں یہ۔“ شیری نے کارڈ دیکھ کر
ملازم سے پوچھا۔
”بینک ہال میں کھڑی ہیں صاحب۔ مجھ پر
ناراض ہو رہی ہیں کہ میں نے انہیں دیکھنے کی کوشش
کیوں کی۔“

”کسے پوچھ رہی تھیں؟“
”عاقل صاحب کو۔“
”بلاؤ۔“ شیری نے کہا۔ عاقل اس وقت کسی
کام سے گیا ہوا تھا۔ چند سیاحت کے بعد آمنہ صاحبہ
اندر داخل ہو گئیں۔ چہرہ ابدل ہوا تھا۔ شدید
غمے میں تھیں۔

”ایک بار میں اپنی ایک عزیزہ کے کئی کام سے
سوئیڈن کے سفارت خانے گئی تھی۔ وہاں میں نے
سوئیڈن کے سفیر کے ملازم کے پھر بار دیا تھا۔ اس
نے اندر داخل ہوتے ہوئے بغیر کسی حمیدہ کے کہا۔ دادا
ابو چونک کر عینک صاف کرنے لگے۔

”جواب میں ملازم نے کہا، کیا بی بی۔“ انہوں
نے عینک ناک پر جا کر آمنہ کو بخور دیکھتے ہوئے
پوچھا۔

”فورا دروازہ کھول دیا تھا۔“ آمنہ نے دادا ابو
کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔

”باہر جانے کا۔“ دادا ابو برجستہ بولے اور
آمنہ چونک کر نہیں دیکھنے لگی۔
”جی نہیں، اندر آنے کا۔ آپ کون ہیں؟“
”حیدر علی صاحب، یہ آمنہ جاوید ہیں۔“
شیری جلدی سے بولا۔

”بڑی خوشی ہوئی ان سے مل کر۔ ویسے مجھے
یقین ہے کہ سوئیڈن کے سفیر نے محلے کے بیشتر افراد
کو برطرف کر دیا ہوگا اور ان کی اس عزیزہ کا کام آج
نک نہیں ہوا ہوگا۔“ دادا ابو بولے۔
”جی نہیں، وہ کام کر آئی تھی۔“

”جب وہ سفیر واپس بلا لیا گیا ہوگا۔“ دادا ابو
نے کہا اور شیری بے اختیار ہنس پڑا۔

”چند سیاحت کے لیے اجازت چاہتا ہوں دادا
ابو۔“ ایک شرط۔۔۔“ دادا ابو بولے۔
”جی۔۔۔ شیری نے تعجب سے انہیں دیکھا۔
”انہیں لے جاؤ۔“ دادا ابو، آمنہ جاوید کی

طرف اشارہ کر کے بولے اور آدھ تھلا کر رہ گئی۔
”میں آپ کے پاس نہیں آئی تھی۔“ اس نے
دانت چیں کر کہا۔
”خوش بخت ہو، جاؤ میرے پاس آئیں تو
تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“ دادا ابو نے کہا۔
شیری جلدی سے آمنہ کو کمرے سے باہر نکال لایا تھا۔
”آپ کمال کرتی ہیں آمنہ جاوید! دادا ابو سے
گستاخی کر رہی تھیں۔“ اس نے باہر نکل کر کہا۔

”یہ تمہارے دادا ابو ہیں، میرے کہیں۔ ویسے تم
نے اپنے پورے خاندان کو یہاں لا چھڑایا ہے۔ کافی
چالاک آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یہ یہاں کیا کرتے
ہیں اس عمر میں۔“ آمنہ نے کہا اور شیری گہری سانس
لے کر خاموش ہو گیا۔

”عاقل صاحب کہاں ہیں۔“ پہلے سوال کا
جواب نہ پا کر آمنہ نے پھر کہا۔
”کئی کام سے گئے ہوئے ہیں اور یہ بھی نہیں
معلوم کہ کس وقت آئیں گے۔“

”عجب انسان ہے، ہاتھ ہی نہیں لگ رہا۔ کوشی
پر معلوم کرنی ہوں تو وہاں پتا نہیں چلتا اور یہاں بھی۔
ویسے یہ عمارت بے حد شان دار ہے۔ تم اپنے بارے
میں نہیں بتاؤ گے کہ آخر تم کون ہو؟“

شیری ایک دلچسپ صورت حال سے دوچار
تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ ابھرا، لیکن دھڑکا اس کے
ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ آمنہ سے دوستی ہوئی تو کی
جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ معلوم کیا جائے کہ اس دن
عاقل کی امی سے اس نے کیا کہا تھا جس کی وجہ سے
ان کی حالت بگڑ گئی تھی۔ بس یہ خیال ذہن میں آنا تھا
کہ اس کے خدو خال بدل گئے۔ اس نے منکراتے
ہوئے کہا۔

”آپ نے اتنے سارے سوالات کر ڈالے
ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔“
”کیسا فیصلہ۔“

”یہ ہی کہ آپ کے کون سے سوال کا جواب
پہلے دیا جائے۔“
”تم یہ بتاؤ کہ بڑے بڑے میاں یہاں کیا کرتے
ہیں۔ انہوں نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے۔“

”حیدر علی صاحب، باہر علی صاحب کے والد
ہیں۔ کوشی میں سب انہیں دادا ابو کہتے ہیں اور ان کا
بے حد احترام کرتے ہیں۔ میں بھی اسی مناسبت سے
انہیں دادا ابو کہتا ہوں ورنہ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں
ہے۔“ شیری نے جواب دیا۔

”اوہ! میرے خدا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ باہر علی کے
والد ہیں۔“ آمنہ موڈ بدل کر بولی۔
”جی۔۔۔“

”جب تو گزربو ہو گئی مجھے ان سے معافی مانگنی
ہوگی۔ آؤ ذرا ایک منٹ کے لیے ان کے پاس چلو۔“
”اس وقت نہیں، پھر کسی وقت یہ کام کر لیں۔
ویسے اس دن کے بعد سے آپ اس کوشی میں نظر نہیں
آئیں۔“

”بڑی عزت افزائی کی گئی تھی میری وہاں۔ تم
بھی تو ان لوگوں میں شامل تھے۔ نہایت بد تہذیب

اور ناشائستہ لوگ تھے۔ سب ہی جھوٹے اور فریبی، کسی نے بھی توجہ نہیں بولا تھا اور تم۔۔۔ تم۔۔۔ تو سب سے زیادہ غلط انسان ہو۔“
”اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“

”میں بہت نرم دل ہوں، کیونکہ نہیں رکھتی دل میں، چلو ٹھیک ہے۔ مجھے کسی سے غرض کیا ہے۔ میں تو بس عاقل کے لیے وہاں گئی تھی۔ سنو ایہ عاقل کس قسم کا آدمی ہے؟“
”آدمی تو ٹھیک ہے۔“

”آخرا سے وہاں کیل رہا ہے، نقد پر کل رہی ہے اس کی، لیکن اس نے ابھی تک توجہ نہیں دی۔ کم از کم رابطہ تو قائم کرنا چاہیے تھا اسے مجھ سے۔ تم خود سوچو کہ کوئی خوشی کو اس طرح ٹھکراتا ہے۔“
”ہرگز نہیں، یہ سراسر حماقت ہے اس کی۔“
شیری نے کہا۔

”تم اس سے بات کرو شیری! دیکھو نا شیری! میں اسے دنیا کی ہر خوشی دینا چاہتی ہوں۔ میرا خیال تھا ہم ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی ٹھوکیں۔ اسے اپنا فن دکھانے کا موقع ملے اور پھر بے پناہ آمدنی، اعلا معیار، کیا نہیں ہوگا اس بے خوف کے پاس۔“
”آپ نے بس ایک غلطی کی! آمنہ صاحبہ!“
”کیا۔۔۔؟“

”اس کی ماں سے اس دن آپ کی باتیں ہوئی تھیں۔ اگر آپ ان سے یہ تذکرہ کریں تو سب سے مناسب ہوتا۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے اور پھر وہ ماں سے زیادہ کسی بات مان سکتا ہے۔“ شیری کے ان الفاظ پر آمنہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر کچھ دیر کے بعد سر ہلا کر بولی۔

”بات تو پتے کی ہے۔ یہ ہی درست ہے، میں کوشش کروں گی، پتا نہیں اس دن انہیں کیا ہو گیا تھا۔“

”آپ نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہوگی ان سے جس کا انہیں شدید صدمہ ہو۔ آپ بتا سکتی ہیں

کہ اس دن آپ کے اور ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے؟“

شیری کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

”میں نے صرف اپنے والد کا نام بتایا تھا۔“
”جاوید ہاجی، یہی نام ہے آپ کے والد کا۔“
”یقیناً۔۔۔ یقیناً۔۔۔ بڑی مصروف شخصیت کے مالک ہیں۔“

”اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی یاد کریں جو آپ نے عاقل کی والدہ سے کی ہو۔“

”اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں پورے دو ٹوک سے کہہ رہی ہوں۔“ شیری ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ کیا جاوید ہاجی کا نام ان کے لیے کوئی خاص حیثیت رکھتا ہے۔

”کیا سوچنے لگے تم؟“
”آپ کے بارے میں، کبھی نیک اور خدا ترس انسان ہیں آپ، ایک جیسے ہی تصویر باقی قیبت خریدی اور پھر عاقل جیسے انسان کی نظر بنانا چاہتی ہیں۔ یہ سانسے کیٹین ہے، آئیے میں آپ کو چاہئے پلاتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ مجھے جیسی چلی سگے انسان کے ساتھ بیٹھنا پسند کریں۔“

”کوئی حرج نہیں ہے کبھی کبھی ایسے بھی سہی۔“ آمنہ نے کہا اور شیری خاموشی سے گردن ہلاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ کیٹین نے کام شروع کر دیا تھا۔ وہاں بہت بڑا عملہ مصروف کار ہو چکا اور اسے وہاں تمام اشیاء مہیا کر دی گئی تھیں۔

شیری نے ایک میز پر بیٹھ کر کافی طلب کی اور پھر بڑی نفاست سے اسے آمنہ کے سامنے پیش کر دیا۔

”تمہارا خیال درست ہے شیری! عاقل میرے اسٹیشن کا نہیں ہے، لیکن میں انسان کر ہوں۔ اسے اعلا معیار کا بنانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔“

”گستاخی معاف، ایک ذاتی سا سوال کرنا

چاہتا ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ کھوں۔“

”کیا آپ عاقل کو چاہنے لگی ہیں۔“
”ہاں! اس کی شخصیت پراثر ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کی طرف جھکنے کی وجہ دوسری ہے۔“

”تو پوچھ سکتا ہوں کیا۔“
”تو بڑو تو نہیں کر دو گے تم، خطرناک آدمی۔“

”دوستوں کے لیے نہیں اور ہم ایک جگہ بیٹھے ہوئے کافی پی رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم دوست ہیں۔“

”دوستی بھلاؤ گے؟“
”ایسی ویسی آزمائش تو سہی۔“

”دراصل شیری اس نمائش میں نفیہ با بر علی کی مطلوبیت دیکھ رہے ہیں۔ دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں خود اپنا مقاصد حاصل کروں۔ میں اس سے کہاں کم ہوں۔ اسے عاقل کی وجہ سے ہی یہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ میں عاقل کو حاصل کر کے اس کی شہرت گہنا بنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے میں عاقل کو چاہتی ہوں۔ ویسے بھی وہ خوب صورت ہے اور نرم خو۔ میری زندگی اس کے ساتھ بہت اچھی گزرے گی۔“

”اوہ۔۔۔! یہ معاملہ ہے، گویا فتنی فتنی۔ ایک تیرے دوستکار بے حد ذہین ہیں آمنہ صاحبہ۔“

”تم یہ بتاؤ کہ تم کیا کر سکتے ہو میرے لیے؟“
”آسمان سے ستارے توڑنے کے علاوہ سب کچھ۔“ شیری نے جواب دیا۔

”میں بھی نہیں۔“
”کوشش کروں گا کہ عاقل آپ کی امداد حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔“

”میں یہی چاہتی ہوں اور اس کے لیے منہ مانگا انعام تمہارا۔ کب سے کوشش کرو گے؟“

”یہ ذمہ داری آپ نے شیری کو سونپ دی۔ اب مطمئن ہو جائیں، بہت جلد آپ کو رپورٹ دوں گا۔ اپنا پتا اور ذاتی فون نمبر دے دیں مجھے۔“ شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

نے اس سے کہا اور آمنہ نے اسے وہی سرخ کارڈ دے دیا۔

”اوہ! یہ مجھے مل چکا ہے۔“
”اس پر جو فون نمبر درج ہے وہ میرے ذاتی فون کا ہے اور اس کی لائن الگ ہے۔“

”اور کتنے بہن، بھائی ہیں آپ کے آمنہ؟“
”اکھوتی ہوں۔“

”کمال ہے، کافی اور لیں گی آپ؟“
”نہیں شکریہ! اب مجھے اجازت دو۔ تم سے گفتگو کر کے دل کو بے حد سکون ہوا ہے۔ پتا نہیں ابھی تک عاقل واپس آیا ہے یا۔۔۔“

”ابھی نہیں آیا ہوگا، آئیے آپ کو کار تک چھوڑ دوں۔“

آمنہ کے جانے کے بعد شیری دیر تک پیشانی مسلاتا رہا تھا۔ آمنہ کی حقیقت کھل گئی تھی، لیکن عاقل کی والدہ کا محمد۔ دیر تک وہ اس بارے میں سوچتا رہا۔

”اپنا گھر“ کی بحیثیت بالکل آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ بے شمار معاملات مکمل تھے۔ عملہ رکھا جا رہا تھا۔ بہت سے کام کے لوگ مل گئے تھے۔ بدر نے اپنا شعبہ سنبھال لیا تھا۔ عظیم الشان ڈپنری میں دوائیں ذخیرہ ہو رہی تھیں۔ وارڈ، بستر اور دوسری چیزوں سے بجائے چارے تھے۔ لاکھوں روپے خرچ ہو رہے تھے۔ عاقل کو ایک نیا عہد مل گیا تھا۔ وہ اس پوری عمارت کا منتظم بنایا گیا تھا۔ آمدنی کے متعلقہ دفاتر نے کام شروع کر دیا تھا۔ عطیات کی اپیل شائع ہو چکی تھی غرض یہ کہ ایک دھوم مچی ہوئی تھی کہ کسی کو فرصت نہیں تھی۔ لیکن ان تمام کاموں کے باوجود

شیری کوشی کے معاملات سے غافل نہیں تھا۔ ایک ایک پر نگاہ تھی اس کی۔ نفیہ کی پیشنگ مکمل ہو گئی تھی۔

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

صفر کو گویوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے لندن آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا اور وہ خوشی سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیری

سے ابھی تک کوئی مشورہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ برتو لے بیٹھا تھا۔ ایسے آج کل ہر وقت کھوٹی کھوٹی نظر آتی تھی۔ اکبر ہاؤس ڈسٹیکشن چکا تھا اور اس نے گھریلو معاملات کی چھان بین پر پوری پوری نگاہ رکھنے کے لیے جدید ترین آلات کا اضافہ کر لیا تھا۔ دادا ابوکا جاسوس تھا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ چنانچہ کثیر سرمائے سے اسے چھوٹے چھوٹے ڈکٹو فون فراہم کیے گئے تھے۔ جن کے ذریعے ہر کمرے سے ہونے والی گفتگو ریسورس جاسپی کی اور ضرورت پڑنے پر اسے بھی ریکارڈ کیا جاسکتا تھا، لیکن اسے سختی سے ہدایت کردی تھی کہ صرف احکامات کے تحت انہیں استعمال کرے اور اپنے طور پر اس سلسلے میں کوئی بھی کارروائی نہ کرے۔

اس کے علاوہ آئینہ کی بارشیری کو فون کر چکی تھی اور شیری اسے مسلسل تسلیاں دے رہا تھا۔ اس نے صرف اس لیے اس کھیل کو جاری رکھا تھا کہ اس کے ذہن میں اس دن کے واقعے کا جس تھا۔

پھر ایک دوپہر اسے موقع مل گیا اور وہ ایسی جا پہنچا۔ عاقل "ابنا گھر" میں مصروف تھا۔

"آؤ شیری میاں کی دن کے بعد شکل دیکھی ہے۔" حمیدہ بیگم نے محنت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں بھی بہت محسوس کر رہا تھا اسی جان۔ چنانچہ آپ کو دیکھنے چلا آیا۔"

"دعاؤں کے علاوہ ہمیں کیا دے سکتی ہوں۔"

"دیکھی طبیعت ہے۔"

"ٹھیک ہوں۔ خدا کا احسان ہے۔"

"ایک بات مجھے بہت دنوں سے پریشان کیے ہوئے ہے اسی جان، مگر مجھتا ہوں آپ سے اپنا اور بڑے اعتماد سے آیا ہوں۔"

"خیریت مجھ سے اتنی تمہید۔ بیٹھو تو سہی۔"

حمیدہ بیگم نے تعجب سے کہا۔

"ہاں اسی ممکن ہے میرا اختصار آپ کو ناگزیر گزرے۔"

"ارے تم کو تو بیٹے اپنے بارے میں میرے

دل کا حال جاننا چاہتے ہو۔ بس اتنا کہوں گی کہ عاقل کے بعد ہمیں چاہی ہوں اور ان لفظوں میں صرف بچ ہے۔"

"خدا کی قسم، مجھے اس بچ کا یقین ہے۔ مجھے بتائیے اس دن آپ کی طبیعت اچانک اس طرح خراب کیوں ہوئی تھی۔" شیری نے ان کے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا اور اس نے محسوس کیا کہ حمیدہ بیگم کا رنگ ایک لمحے کے لیے اتر گیا ہے۔ ان کے ہونٹوں پر اچانک کھٹکی کی چوڑیاں جننے لگی ہیں اور ان کے اس انداز سے شیری کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو حمیدہ بیگم کے دل میں ہے اور یقیناً اس کا تعلق کسی نہ کسی طور آئینہ جاوید سے ہے۔ چند لمحات وہ انتظار کرتا رہا اور پھر اس نے حمیدہ بیگم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اسی جان! کسی کے دل کو کریدنا عام طور سے کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی لیکن صرف وہی کسی کے ذہن کی گہرائیوں میں اترتا ہے جس میں ہمیں کسی سے لگاؤ ہو۔ آپ نے دیکھا میں بھی تھا ہوں، اگر یہ احساس میرے دل میں پیدا ہوا ہے تو صرف یہ محبت کی بنا پر جو آپ کے لیے میرے دل میں موجود ہے۔ تاہم اگر آپ شیری کو بھی اسی قابل نہیں سمجھتیں کہ اسے اپنے کسی راز میں شریک کریں تو باخدا مجھے تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ مجھے بتائے سے انکار کر سکتی ہیں۔"

شیری کے الفاظ پر حمیدہ بیگم کا دل مسلسل متغیر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر محکم کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ شیری ان کے بالکل قریب ہی جا بیٹھا تھا۔

"اسی جان! خدا کی قسم مجھے آپ کو تکلیف دینا مقصود نہیں۔ بس یہ پچاسی دل میں چھپ رہی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ جب بھی مجھے وقت ملا میں آپ سے اس بارے میں معلوم کروں گا۔ لیکن اگر آپ مجھے نہیں بتانا چاہتیں تو میں بالکل خاموش ہو جاتا ہوں۔"

"شیری گزے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، لیکن تمہارے اس خیال کی تردید نہیں کروں گی کہ اس دن میری طبیعت بلاوجہ خراب نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کا ایک پس منظر ہے اور یہ پس منظر میری زندگی میں ایک گہرے گھاؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیری! میرے سینے میں زخم ہیں، ایسے زخم جو رستے رستے ناسور بنی چکے ہیں۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ ان ناسوروں کو بھی عریاں نہ ہونے دوں۔ کسی کو نہ دکھاؤں۔ میرا بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ میں اسے اس کا اپنی یاد دلا کر باجھولے بسرے خوابوں کو کرید کر تکلیف نہ دوں، لیکن حالات کی چکی کچھ اس طرح ماتی ہے کہ انسان اسے روکنے پر قادر نہیں رہتا۔ گیا اور وقت ہاتھ نہیں آتا، لیکن گزے ہوئے واقعات اب بھی اسی طرح تازہ ہو جاتے ہیں کہ انسان ان کے سامنے لپٹا نہیں ہو جاتا ہے۔ تم۔۔۔ تم۔۔۔ بہت ہمدرد اور نیک انسان ہو۔ اتنے احسانات ہیں تمہارے میرے اوپر کہ میں تمہارے سامنے گردن نہیں اٹھا سکتی۔ تمہاری سعادت مندی ہے کہ تم نے ان احسانات کو بھی محسوس نہیں ہونے دیا یا انہیں ہٹانے کی کوشش نہیں کی، لیکن زندگی میں پہلی بار تم نے مجھ سے کوئی سوال کیا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح انکار کروں۔"

شیری خاموشی سے ان کی شکل دیکھتا رہا تھا۔

حمیدہ بیگم چند لمحات خاموش رہیں، پھر بولیں۔

"میری زندگی سے ایک ایسا راز منسلک ہے جو میرے لیے بے حد تکلیف دہ ہے۔ یوں سمجھو کہ طویل عرصے سے میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا اور یہ ہی غلطی اٹھا کر کسی کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ قاعدہ بھی کچھ کیا تھا۔ اب میں زندگی کے ان نازک لمحات سے گزر چکی ہوں جو مجھے بے حد گراں تھے۔ بچہ جوان ہو چکا ہے خدا کے فضل سے اور تمہاری مدد سے اس نے حالات سنبھال لیے ہیں۔ میرے ذہن میں تو اب بس چند ہی آرزوئیں ہیں۔ وہی آرزوئیں جو ہر ماں کے دل میں ہوتی

ہیں۔ عاقل کا ایک چھوٹا سا گھر دیکھو۔ اس گھر میں اس کے لیے سکون ہو۔ یہ خواب اس وقت سے ہی ماں کی خواہش بن جاتا ہے جب وہ اپنے بچے کو ختم دیتی ہے۔ وہ اپنے بچے کے لیے کائنات کی ہر چیز مہیا کر دیتا چاہتی ہے۔ بس خدا نے ماں کے دل میں یہ جذبہ دیے ہیں۔ تم وعدہ کرو شیری کہ کوئی ایسی صورت حال سامنے نہیں لاؤ گے جس سے میرے عاقل کی زندگی میں تکیاں ٹل جائیں۔"

"وعدہ کرتا ہوں اسی جان کہ ایسا نہیں ہوگا۔" شیری نے پر غلظ انداز میں کہا۔

"تو سنو! آؤ جاوید، جاوید ہاشمی کی بیٹی ہے اور جاوید ہاشمی عاقل کے بھی باپ ہیں۔" حمیدہ بیگم نے کہا تو شیری سناٹے میں رہ گیا۔ اس کے عضلات میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب خیر نگاہوں سے حمیدہ بیگم کو دیکھ رہا تھا۔ تب حمیدہ بیگم نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے لگ گئیں۔

"جاوید ہاشمی نے مجھ سے شادی کی تھی اور مجھ سے منہ بھی موڑ لیا۔ مجھے یہ بات بے حد بری لگی تھی۔ میں قربانی کا بکرا تو نہیں تھی۔ میری اپنی بھی ایک حیثیت تھی۔ جاوید ہاشمی نے یہ کیوں سوچا کہ وہ انسان ہیں اور میرے والد انسان ہیں۔ دو انسانوں کے درمیان کچھ وعدے و وعید ہو گئے اور مجھے ان وعدوں کے درمیان جھونک دیا گیا۔ حالانکہ میرا ان رشتوں ناتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں جاوید ہاشمی کی زندگی میں خود بخود نہیں آئی تھی، مجھے تو میرے باپ نے اس شخص کے حوالے کیا تھا۔ حالانکہ دین و مذہب کے نام پر سانچ و معاشرے کی بنائی ہوئی حدود کے مطابق اگر مجھے کسی غریب کلرک کے حوالے بھی کر دیا جاتا تو میں اسے بھی شوہر تسلیم کر کے اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزار دیتی۔ مجھے یہ احساس زخمی کر گیا اور میں دل ہی دل میں ملنے لگی۔ اب میں جاوید ہاشمی کی ہر بات پر نگاہ رہتی تھی، لیکن میں نے انہیں نوکسنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر تقدیر نے میری پیشانی پر سیاہی کے نشانات بنانا شروع کر دیے۔ میرے والد

129

صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں۔ گویا مجھے میکے کا سہارا نہیں رہا تھا۔ جاوید صاحب کو میرے والد کی موت کے بعد مل کر کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ صرف وہی ایسی ہستی تھی جو جاوید کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ مجھے انہوں نے فرنیچر کی حیثیت دی تھی جس کی صفائی، تھرائی اور نفاست کا تو خیال رکھا جاتا ہے، لیکن اس کے بارے میں صرف یہ ہی سوچا جاتا ہے کہ وہ ایک بے جان چیز ہے۔ جذبات و احساسات سے جس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اسے بے جان چیز سے زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔

جاوید باہمی کی مجھ پر سے توجہ بہت کم ہو گئی تھی۔ ان دنوں میری طبیعت بھی بہت چڑچڑی ہو گئی تھی، کیونکہ میں ماں بننے والی تھی۔ جاوید باہمی کو شاید اس بات کا علم ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے میری جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ شبانہ قمران کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ پھر ایک دن میں نے اپنے منہ پر سے سنا کہ شبانہ قمر نے جاوید باہمی سے شادی کر لی ہے۔

مجھ پر رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آج تک مجھے میری وہ حیثیت نہیں ملی تھی جو بیوی کو شوہر کی زندگی میں ملتی ہے۔ جاوید باہمی تین دن کے بعد واپس آئے تھے۔ پھر سے سے ہی بہت خوش و خرم اور کھلے کھلے نظر آ رہے تھے، لیکن آج انہیں کچھ دوسرے حالات کا سامنا کرنا تھا۔ میں پہلی بار ان کے سامنے اس انداز میں پہنچی کہ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے قہر خیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولے۔

”کیا بات ہے؟“
”میں نے جو کچھ سنا ہے کیا درست ہے۔“ میں نے ان سے سوال کیا۔

”کیسا سنا ہے تم نے؟“
”یہ ہی کہ آپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔“
”ہوں۔۔۔ تو یہ بات تمہارے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔“

”جی ہاں!“ میں غصے سے لہجے میں بولی۔
”خوب! تمہیں ملنے والی ہے اطلاع یا نکل درست ہے۔ میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہیں اطلاع دینے والا کون تھا۔ ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد میں خود ہی تمہیں یہ بات بتا دیتا۔“
”میں جان سکتی ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔“

”اس سوال کا جواب نہایت سیدھا سادہ اور آسان ہے، میرے دل میں ایک خواہش ابھری تھی، سو میں نے شادی کر لی۔“
”لیکن آپ کو علم ہے کہ ایک عورت یہ بات پسند نہیں کرتی اور نہ ہی اپنی زندگی میں کسی اور کا حق برداشت کر سکتی ہے۔“

”تمہیں میرے اس اقدام سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی حیدرہ بیگم۔ تم آرام سے اپنی زندگی گزارو۔ تمہیں کوئی تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں جاوید صاحب۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ میں نے آج تک آپ کے سلسلے میں بہتر انداز میں سوچا ہے۔ اب مجھے آپ سے ایسی کوئی شکایت نہیں ہوئی جو میرے لیے ناقابل برداشت ہوئی اور جو قابل برداشت باتیں تھیں، انہیں میں برداشت کرتی رہی، لیکن آپ اتنی آسانی سے اس مسئلے کو سمجھ نہیں کر سکتے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں جانتا جا رہی ہوں جاوید باہمی کہ کیا کی تھی مجھ میں، جو آپ کو کسی اور کی ضرورت پیش آئی۔“
”حیدرہ! بہتر ہے کہ تم یہ سب باتیں نہ کرو۔ میرے اور تمہارے درمیان کئی اختلاف نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اپنی زندگی میں تمہاری طرف سے کوئی تردد نہ ہوئے۔“

”لیکن میری پوری زندگی زخم بن گئی ہے جاوید صاحب! آپ نے مجھے کسی کی بے جان مورت کیوں

کہا لیا ہے۔ میں بھی انسان ہوں۔ گوشت پوست کی انسان، میرے بھی جذبات و احساسات ہیں۔ میں نے آپ کے معاملات میں مداخلت اس لیے نہیں کی کہ میں آپ کو شوہر کا وہ اہم مقام دینا چاہتا تھا جو ہر عورت کا فرض ہوتا ہے۔ لیکن جاوید باہمی اس کے ساتھ ساتھ آپ کے بھی تو کچھ فرائض ہیں۔ آپ نے میری زندگی میں یہ زخم کیوں لگایا۔ آپ کو اس کا کیا حق پہنچتا تھا۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو حیدرہ بیگم! آپ بھول رہی ہیں کہ آپ میرے لیے صرف ایک احسان کا بدلہ دیتی ہیں۔ ماموں جان نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ میں ان کے احسانات کا بدلہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے ان کی یہ خواہش ادا کی کہ وہ آپ کو مجھ سے منسوب کرنا چاہتے ہیں تو میں نے انکار کر دیا، کیا حیدرہ بیگم میری سوسائٹی، میرا معیار زندگی کچھ اور ہے۔ میں نے بھی نہیں چاہا کہ آپ اپنی فقرا پرچھوڑ کر میرے ساتھ سوسائٹی میں وہ رنگ اختیار کریں جو ہمارے جیسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ میں آپ کے اپنے جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک ایسی عورت جس کی سوسائٹی میں عزت و ہوادر جو میرے وقار میں بھی چار چاند لگا سکے۔ اگر میری زندگی میں بھی داخل ہو گئی تو پھر میں اسے نظر انداز نہیں کر سکا اور میں نے اس سے شادی کر لی۔ وہ آپ کے بارے میں جانتی ہے، اس کے باوجود اس نے مجھے قبول کیا ہے۔ آپ بھی اگر اس کے بارے میں جان گئی ہیں تو اسے قبول کر لیں۔ میں آپ دونوں کو بھی آسنے سامنے نہیں لاؤں گا۔ کبھی کسی کے ذہن کو بوجھ کا شکار نہیں کر دوں گا۔ میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں آپ سے کہ آپ کو میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس پر آپ کی تکتہ چینی بھی برداشت نہیں کر دوں گا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں جاوید! میں آپ سے ایک بار پھر کہہ رہی ہوں، میں کسی کی کوئی مورت

نہیں ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ ناقصاتی کی ہے تو اس کے جواب میں، میں بھی کچھ کرنے کا حق رکھتی ہوں۔“

”مثلاً۔“ جاوید صاحب نے سوال کیا۔
”مثلاً یہ کہ اب میں آپ کی زندگی سے بالکل الگ ہو جانا چاہتی ہوں۔“
میرے ان الفاظ پر جاوید باہمی ہونچکے رہ گئے تھے۔ پھر ان کا چہرہ آہستہ آہستہ مجھے سے سر نہ ہوا تھا اور وہ سخت لہجے میں بولے۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ کہہ رہی ہیں حیدرہ۔“
”ہاں! یہ جواب ہے جاوید صاحب، صرف جواب۔“

”مگر یہ آپ کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔“
”مناسب کیوں نہیں ہوگا؟“
”آپ کس طرح میری زندگی سے الگ ہونا چاہتی ہیں۔“

”میرا اپنا عمل ہوگا۔ میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔“
”کیا آپ شبانہ کو طلاق دے سکتے ہیں۔“
”نہیں، ہرگز نہیں۔“

”تو پھر آپ مجھے طلاق دے دیجئے۔“ میں نے کہا اور جاوید باہمی حیدرہ کی شکل بتاتے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

”لیکن میں یہ بھی نہیں کر سکتا۔“
”آپ کو یہ کرنا ہوگا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ اپنے اس آخری فیصلے پر غور کر لیں۔“
”میں نے بہت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے غصے سے جواب دیا۔

”اس کے باوجود میں آپ کی طرح جلد بازی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ آرام سے یہاں رہیں۔ اگر میری ذات سے آپ کو کوئی کوفت ہوئی ہے تو میں آپ کو تنگ نہیں کر دوں گا، لیکن آپ کو طلاق دے کر

ماموں کی روح کو اذیت کا شکار نہیں کرنا چاہتا۔
 ”کیسے معصوم بن رہے ہیں آپ جاوید صاحب! میری روح کو جو بچہ کے لگ رہے ہیں، ان کا آپ کو کوئی احساس نہیں، لیکن ایک مردہ شخص کی روح سے آپ شرمندہ نہیں ہونا چاہتے۔“
 ”آپ جذباتی ہو رہی ہیں عیدہ! بہتر ہے غور کر لیں۔“ جاوید صاحب نے کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے تین یا چار دن تک جاوید صاحب کی شکل نہیں دیکھی۔ لیکن ان تین چار دنوں میں میرے ذہن میں کھولتا ہوا لاوا کچھ اور پک گیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر کچھ فیصلے کر لیے تھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ جاوید صاحب سے طلاق لے لوں گی۔

چوتھے دن جب وہ مجھے نظر آئے تو میں نے ان سے طلاق کا مطالبہ شدت سے شروع کر دیا۔ جواب میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے طلاق نہیں دیں گے۔ اگر میں ان سے واسطہ نہیں رکھنا چاہتی، نہ رکھوں۔ تب میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ان کی اس جارحیت کے جواب میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گی۔ چنانچہ جاوید صاحب کے جانے کے بعد میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ میرے ایک بہت دور کے رشتے دار دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان ہی کے پاس چلی جاؤں گی۔ گھر سے میں نے صرف چند چیزیں لی تھیں۔ حالانکہ اس گھر میں میرے باپ کا دیا بہت کچھ تھا۔ میں نے اس میں سے کچھ نہیں لیا اور خاموشی سے وہاں سے نکل کر اپنے عزیزوں کے گھر پہنچ گئی۔

میرے وہ عزیز خاصے عمر رسیدہ بزرگ تھے اور بس ٹھیک ٹھاک ہی زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اپنے طور پر زندگی گزاروں گی۔ ان پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ انہوں نے لاکھ جاہا کہ کسی طرح جاوید صاحب سے میرا تنازعہ طے کرادیں، لیکن میں نے ان سے کہا کہ اگر انہوں نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں یہاں سے بھی چلی جاؤں گی۔ خدا

کی زمین بہت وسیع ہے۔ چنانچہ میں خاموشی سے وہاں رہتی رہی۔ مجھے نہیں معلوم کہ جاوید صاحب نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی یا نہیں، لیکن میں نے دل میں تمہیں کر لیا تھا کہ اب جاوید کی شکل دیکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے۔
 کافی دنوں کے بعد ایک دن مجھے خط ملا۔ یہ خط میرے ان عزیزوں کے نام ہی تھا، لیکن اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ خط پر جاوید کی تحریر دیکھ کر میں چونک پڑی۔ ان کے ہاتھ کی تحریر میں پہچانی تھی۔ چنانچہ میں نے اس خط کو کھولنے کا گناہ کر لیا۔
 جاوید صاحب اور میرے ان رشتے دار کے درمیان خط و کتابت ہو رہی تھی۔ انہوں نے میری موجودگی کے بارے میں جاوید صاحب کو اطلاع دے دی تھی۔ چنانچہ میں اپنے عہد کے مطابق خاموشی سے وہ جگہ چھوڑ کر چل پڑی۔ میں نے اپنے ان رشتے داروں کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ میں کہاں جاؤں گی۔ میں نے وہ شہر بھی چھوڑ دیا اور ٹرین میں بیٹھ کر چل پڑی۔

لیکن میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں نے زمانہ گپاٹھٹ میں میری حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور سبز غفار نامی ایک مہربان خاتون نے مجھے وہاں سہارا دیا۔ ٹرین ہی میں عاقل پیدا ہوا۔ وہ خاتون مجھے اپنے گھر لے آئیں۔ بہت ہی خدا ترس خاتون تھیں۔ میں نے انہیں اپنی حیثیت نہیں بتائی۔ سبز غفار کے دو بیٹے یورپ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور وہ یہاں تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ عاقل ان کی کوشش میں پانچ سال تک ان کے زیر سایہ پرورش پاتا رہا۔ پھر ان کے دونوں بیٹے آ گئے۔ وہ یورپ سے شادیاں کر کے آئے تھے۔ سبز غفار ان کی یہ سرکشی برداشت نہ کر سکیں اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد میرا وہاں رہنا ممکن نہ رہا، کیونکہ حالات سازگار نہیں تھے۔ میں نے وہ جگہ چھوڑ دی، لیکن اب میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے محلے میں مکان لے کر میں نے عاقل

کی پرورش شروع کر دی۔ میں سلائی کرتی تھی۔ یوں مائل کو پر دان چڑھا رہی تھی۔
 میں نے اسے ایک چھوٹے اسکول میں تعلیم دلوائی اور اس کے بعد اس کے لیے وہ شہر چھوڑ کر ایک دوسرے شہر میں آ گئی اور وہ شہر یہ ہی ہے میرے بیٹے، لیکن یہ جاوید باجی کا شہر نہیں تھا۔ میں نے اس کے بعد سے بھی جاوید باجی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہاں ہے، کیا کر رہا ہے، اس کا کیا حال ہے، شائد قبر کا کیا ہوا، کوئی بات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بس میری لگن، میرا عاقل تھا۔ میری محنت خراب ہوتی چلی گئی۔ عاقل نے تعلیمی مراحل طے کیے، لیکن وہ سیدھا سادا نوجوان تھا۔ کافی کوشش کے باوجود وہ اپنے لیے کوئی شے جیکر نہ بنا سکا، یہاں تک کہ ہمیں چھبھاری مدد مل گئی، ہوئی اور ہم یہاں آ گئے۔ میں یہاں آنے کے بعد کسی حد تک پرسکون ہو گئی مگر کبھی کبھار جاوید نے یہاں آ کر پھر میرے اندر بھونچال پیدا کر دیا۔ اس کے باپ کا نام جاوید باجی ہے اور اس نے اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتایا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی جاوید باجی ہے۔ آمنہ جاوید یقیناً شانہ فخر کی بیٹی ہوئی اور اس کا نام سن کر میں پر داشت نہیں کر سکتی تھی اور میری حالت خراب ہوئی تھی۔ یہ ہے میری کہانی جو بظاہر عام سی کہانی ہے۔ اس میں کوئی ندرت، کوئی جدت نہیں ہے، لیکن میں نے۔۔۔ میں نے تمہاری خواہش کا احترام کیا ہے بیٹے! میں نے بس تمہاری خواہش کا احترام کیا ہے۔
 حمیدہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شیری مٹا رنگا ہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا، پھر اس نے ذرا ہجھاری لگے تھیں۔

”مجھے بہت افسوس ہوا ای جان! مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔ واقعی مردوں کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے حقوق بھی دیے ہیں جن سے وہ ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ہی جیسے ایک انسان کی زندگی برباد کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ بہر طور اسی طویل عرصہ

گزر چکا ہے۔ کیا آپ کے دل میں جاوید باجی کے لیے گمنامی نہیں ہے؟“
 ”نہیں شیری! اب کیا رکھا ہوا ہے زندگی کے وہ ماہ و سال برباد کر دیے ہیں۔ اب تو عاقل میری استغلوں کے سال ہوئے ہیں۔ بس اس کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں۔ باقی کوئی سوچ میرے لیے قابل توجہ نہیں ہے۔ اس کہانی کو تم نے سن لیا۔ اب اسے اپنے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کر لو۔ مجھے بتاؤ بیٹے اور کیا کر سکتی ہوں میں تمہارے لیے؟“
 ”شکر ہے ای جان! بس کچھ نہیں، اب مجھے اجازت دیجیے۔“ شیری نے کہا۔
 ”جائے بتا دوں؟“

”نہیں امی! ضرورت محسوس نہیں ہو رہی، ورنہ آپ کے سامنے آ کر انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔“ شیری نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ لیکن حمیدہ بیگم کی کہانی اس کے ذہن میں چکرا رہی تھی۔ آمنہ جاوید، عاقل کی بہن ہے۔ جاوید باجی یہاں موجود ہیں۔ ایک انتہائی دولت مند آدمی اور عاقل ان کا بیٹا ہے۔ آمنہ جاوید اگلوئی اولاد ہے۔ یعنی ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ اب تو ان آمنہ صاحبہ سے کچھ زیادہ ہی تعلقات بڑھانا ہوں گے۔ معاملے کو سنبھالنا زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی بہتر صورت حال نکل آئے تو عاقل کی زندگی میں بھی تبدیلیاں آ سکتی ہیں۔

بابر علی صاحب کا فون آ گیا تھا۔ آج شام کو وہ واپس آ رہے تھے۔ عموماً وہ اطلاع دیے بغیر ہی آ جاتے تھے، لیکن فون پر انہوں نے کچھ خاص برائیتیں دی تھیں جو خاص طور پر شیری کو بالکل معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔

بہر صورت کوئی تین، ساڑھے تین بجے کے قریب بیگم صاحبہ نے ”اپنا گھر“ میں فون کر کے شیری کو فوراً ہی طلب کر لیا۔

شیری اس وقت کی ضروری کام میں مصروف تھا۔ اس نے بیگم صاحبہ سے پوچھا کہ اس وقت اس کی

کیا ضرورت پیش آگئی ہے تو بیگم صاحبہ نے کہا۔
”شام کو پانچ بجے کی فلائٹ سے باہر علی صاحب واپس آ رہے ہیں۔ میں تمہیں بالکل تکلیف نہ دیتی لیکن تم سے مشورہ کرنا بے حد ضروری ہے اس لیے آ جاؤ۔“

”جی بہتر! ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ شیری نے جواب دیا تھا۔ اس نے ملازموں میں کچھ بھاگ دوڑ محسوس کی تھی۔ بیگم صاحبہ پریشان ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شیری کو دیکھتے ہی کہا۔

”آ رہے ہیں اور اپنے ساتھ کچھ مہمان بھی لا رہے ہیں۔ میں متھی ہوں کہ یہ کون ہیں۔“
”کون ہوں گے۔“ شیری نے تعجب سے پوچھا۔

”تمہیں علم نہیں ہے کچھ دنوں سے انہیں بیٹیوں کی شادی کی فکر بھی لاحق ہو گئی ہے۔ نفیہ کے لیے کسی رشتے کی بات بھی کی ہے انہوں نے، میرا خیال ہے وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔“ بیگم صاحبہ نے بے زاری سے کہا۔

”اوہ۔۔۔ اچھا! بہر طور میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”بھئی میں پریشان ہو گئی ہوں یہ سن کر۔ ظاہر ہے کہ تمہارے علاوہ میں اور کس سے مشورہ کر سکتی تھی اب تم ہی کچھ کرو۔“

”مگر کیا ہے بیگم صاحبہ؟“

”شیری! اگر یہ لوگ وہی ہوں تو کیا ہوگا۔“

”کیوں! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“

”بھئی۔۔۔ تم تو سنجیدگی سے سوچ ہی نہیں رہے ہو۔ باہر علی صاحب ہم پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتے ہیں۔ نفیہ کے لیے جو بات تم نے میرے ذہن میں بٹھادی ہے بیٹے اب میں اس سے متحرف نہیں ہو سکتی لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ باہر علی صاحب مخالفت برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ تمہارے سلسلے میں انہوں نے جو کچھ کیا

ہے۔ اس میں ناکام رہے ہیں اور ان کی یہ ناکامی اب شدید جھلجھٹ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب اگر یہاں بھی انہوں نے ہماری مخالفت محسوس کی تو بالکل ہی آڈٹ ہو جائیں گے۔ بہر طور وہ گھر کے سربراہ ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ ہمیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے ہیں۔ تم ہی بتاؤ اب میں کیا کروں۔“

”بیگم صاحبہ! آپ کا شیری موجود ہے۔ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ ہوگا، سنجال لیں گے۔“

”لیکن شیری! میں تو تمہارے لیے بہت پریشان ہوں بیٹے، اگر کسی وقت انہوں نے تمہارے سلسلے میں ویٹو استعمال کر لیا تو کیا ہوگا۔“

”مثلاً۔۔۔ شیری نے سوال کیا۔“

”مثلاً وہ اس بات پر تل گئے ہیں کہ تمہیں اس گھر میں نہ رہنا دیا جائے گا تو پھر پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”بیگم صاحبہ! شیری آپ کا خادم ہے۔ باہر علی صاحب کی بھی دل سے عزت کرتا ہوں۔ اگر ضرورت پڑے

حال ایسی ہوگی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں یہاں سے چلا جاؤں گا، لیکن آپ کے ذہن اور دل سے تو نہ دور ہو سکوں گا۔“

”اسی نہیں ہوگا شیری! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں پہلے ہی اس سلسلے میں فیصلہ کن انداز میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ تمہارا مستقبل اب ہمارے ساتھ ہی ہے۔ ہم مر جائیں گے تو تمہیں بھی چلے جانا لیکن اپنی زندگی میں ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ خواہ اس کے لیے ہمیں کئی بہت بڑے نقصان سے دوچار کیوں نہ ہونا پڑے۔“

”آپ میرے لیے جذباتی نہ ہوں بیگم صاحبہ اور نہ ہی اس انداز میں سوچیں۔“

”کیا بیگم صاحبہ، بیگم صاحبہ کی رٹ لگا رہی ہے۔ بار بار تمہیں یاد دلانا پڑے گا کہ مجھے تم تنہائی

میں بیگم صاحبہ نہ کہا کرو۔“

”معاف کیجیے گا گی جان، میں بھول گیا تھا۔“

”بس تو پھر بتاؤ۔“

”کچھ نہیں انہیں آنے دیجیے۔ حالات کو احتیاط سے سنجال لیں گے، کتنے افراد آ رہے ہیں۔“

”کچھ بھی تو نہیں معلوم، بس فون کر دیا ہے۔“

”آئے دیجیے۔ زندگی ان ہی ہنگاموں سے مہارت ہوتی ہے امی جان! دیکھ لیں گے ان مہمانوں کو بھی۔ ویسے آپ باہر علی صاحب کے حکم کے مطابق تیاریاں شروع کر دیجیے۔ میرے لیے کوئی حکم ہو تو فرمائیے۔“

”شام کو پانچ بجے ایرپورٹ پہنچو گے۔“

”کیوں! میری شکل دیکھ کر باہر علی صاحب مجھ کو نہیں جانیں گے۔“

”بڑے ہیں تو مجھڑ جائیں۔ اب ایسا بھی کیا۔ دو تین کارپاں لے جاؤ میں بھی چلوں گی، بدر نفیہ اور نفیہ بھی چلیں گے تاکہ فوری طور پر باہر علی صاحب کو کوئی شکایت نہ ہو۔ میری خواہش ہے کہ حالات کو آہستہ آہستہ سنجالا جائے، لیکن بیٹے یہ ذمہ داری بھی میں تمہارے ہی سپرد کر رہی ہوں۔ عاقل میرے ذہن میں یوں رچ بس گیا ہے کہ میں اب اسے نکال نہیں سکتی اور اس دوران میں، میں نے ایک اور بات بھی محسوس کی ہے۔

یوڑھی ضرور ہو گئی ہوں، لیکن آنکھیں اتنا دھوکا بھی نہیں کھا سکتیں، نفیہ اور عاقل ایک دوسرے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔“

”امی جان! میں نے آپ کو ہلکے سے اشارے دیے تھے۔ وہ غلط نہیں تھے۔“

”ہاں۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ بچوں کی خوشیوں کے لیے ہی تو ماں باپ اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ اگر بچے ہی ہماری ضد کی جبینٹ چڑھ جائیں تو پھر پھر ہمارے ماں باپ ہونے کا کیا

فائدہ۔“

”زندہ باد! امی جان، زندہ باد، بڑی اچھی بات کہی آپ نے، مطمئن رہیے، پانچ بجے ہم سب تیار رہیں گے۔“ شیری نے کہا اور گھوڑی دیر کے بعد بیگم صاحبہ پر رخصت ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

سوچنے کی ضرورت تھی، حالانکہ اس کا ذہن جس برقی رفتار سے کام کرتا تھا۔ اس کی مثال ملنا مشکل تھی، لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں بڑی گہرائی سے سوچنا تھا۔ عاقل کی زندگی کا سوال تھا۔ حمیدہ خاتون میں۔ اپنا گھر تھا، نفیہ بھی، مصطفیٰ تھا، ابیسہ بھی اور نہ جانے کون کون تھا اور پھر۔۔۔ اور پھر کوئی اور بھی تھا جس کے لیے شیری کو بہت کچھ کرنا تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی ہی وقف کر دی تھی ان لوگوں کے لیے، کچھ یادیں، کچھ اوراق احساس کے جھونکوں کے ساتھ الٹ گئے اور ان کی پرچھائیاں ان کے چہرے پر نمایاں ہو گئیں۔ اس وقت کوئی کے رہنے والے اگر شیری کو دیکھتے تو پچھا ان پاتے کہ یہ ہنس مکھ تو جوان بھی کرب سے آشنا ہو سکتا ہے۔ اس کا وجود تو مسرت اور ہمتوں کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس کی ذات تو مسیحا کی دھوکوں کے لیے اور اگر کوئی ذہنی انجمن کا شکار ہو جاتا تو اس کی آنکھیں شیری کو تلاش کرنے لگتیں اور جب شیری کا چہرہ نظر آ جاتا تو دل کا اضطراب خود بخود کم ہو جاتا۔ نفیہ ہو جاتا کہ اب مشکل حل ہو جائے گی۔ یہ اعتقاد بھی بخود نہ ہوتا، لیکن وہ شیخ اعتماد خود کتنا مجروح ہے کسی کو گمان بھی نہیں ہوگا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے سینے میں بھی سوز ہے۔

چند نکات یہ احساسات اس کے چہرے پر نمایاں رہے اور پھر اس نے خود کو سنجال لیا۔

”ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے شیری! انھو سنجال جاؤ۔“ اس نے خود سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

نئے مہمانوں کے استقبال کے لیے اسے بہت سی

چند نکات یہ احساسات اس کے چہرے پر

نمایاں رہے اور پھر اس نے خود کو سنجال لیا۔

”ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے شیری! انھو سنجال جاؤ۔“ اس نے خود سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

نئے مہمانوں کے استقبال کے لیے اسے بہت سی

چند نکات یہ احساسات اس کے چہرے پر

نمایاں رہے اور پھر اس نے خود کو سنجال لیا۔

”ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے شیری! انھو سنجال جاؤ۔“ اس نے خود سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

نئے مہمانوں کے استقبال کے لیے اسے بہت سی

چند نکات یہ احساسات اس کے چہرے پر

نمایاں رہے اور پھر اس نے خود کو سنجال لیا۔

”ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے شیری! انھو سنجال جاؤ۔“ اس نے خود سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

نئے مہمانوں کے استقبال کے لیے اسے بہت سی

مہکتے الفاظ

☆ کسی آدمی کو جب اس کی بساط سے زیادہ دنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ برا ہو جاتا ہے۔ (حکیم اقلیدس)

☆ ہم سفید کونجوں کا ایک غول ہیں جو نیلے آسمان میں اپنی اپنی منزل کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ خوش خوش پھر کسی کو اپنی منزل خوبصورت باغ میں ملتی ہے اور کوئی رات کی سپاہی میں سکت چٹانوں سے ٹکرا کر خارزاروں میں گر پڑتی ہیں۔ (خلیل جبران)

☆ دھوکا ہو یا دکھ تب ان کا صدمہ زیادہ اور حملہ شدید ہوتا ہے جب انسان ذہنی طور پر تیار نہ ہو سکی تو اس صدمے کے نتیجے میں جان ہی ہار جاتے ہیں۔ (اختر عباس)

☆ آدمی عزت اور اس سے زیادہ محبت کا آرزو مند ہوتا ہے اور یہ دونوں نعمتیں جب دولت کے بغیر ملنے لگیں تو اصل دولت ہوتی ہے۔

ناممکن

ترقی کے اس دور میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہر شخص فنکار ہو گیا ہے اور اس نے ایسے ایسے ہنر سیکھ لیے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر خود انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اب کسی شخص کی ظاہری صورت دیکھ کر اس کے بارے میں صحیح اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

زمین پر اتر گیا۔ انہوں نے دور سے آنے والے مہمانوں کو دیکھا، بیڑی سے جو اشخاص باہر ملی کے ساتھ نیچے اترے ان کی تعداد چار تھی۔ ان میں ایک دبلے پتلے، دروازہ قامت شیردانی میں ملیوں، لیکن اچھی صحت کے مالک ادیب عمر کے حضرت تھے۔ بڑی بڑی موچیں جو خاص انداز میں پھیلائی گئی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک گول مٹول محترم جو بیسی پہنے ہوئے تھیں۔ چھوٹے سے قد کی مالک، لیکن انتہائی فرسودہ قسم کے میک اپ سے آراستہ ایک صاحب زادی، وہ بھی خوب صورت سی بیسی پہنے تھی اور اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک تھیں۔ بال جدید طرز کے کٹے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ایک حضرت سوٹ میں ملیوں، یہ بھی ایک باپ کی طرح دہلی پتی جسامت کے مالک تھے۔ چہرہ صاف تھا۔ خدوخال اچھے خاصے تھے۔ لیکن بانی کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا ان کے بارے میں۔ دور ہی سے ان مہمانوں کو دیکھا گیا تھا اور ٹھوڑی دیر بعد شام وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے وہ سب باہر نکل آئے۔ بیگم صاحبہ نے آگے بڑھ کر ان سے تعارف حاصل کیا۔ گول مٹول خاتون سے ہاتھ ملایا۔ بچے اور بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بھائی صاحب کو سلام کیا گیا۔ بھائی صاحب کچھ تباہ چیز معلوم ہوتے تھے۔ غیر ملک میں بھی شیردانی کا استعمال ان کی اس طبیعت کا غماز تھا کہ وہ وطن پرستوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ باہر ملی صاحب سرور نظر آرہے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں سے ان کا تعارف کرایا اور آخر میں جب ان کی نگاہ شیریں پر پڑی تو انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا، لیکن کرنل یوسف صاحب ہی شیریں کی طرف بڑھ آئے تھے۔

”اور۔۔ ایک آدمی تو چھوڑ ہی دیتا ہے، تم کون ہو۔ چلو ہم لوگ خود ہی آپس میں تعارف حاصل کر لیتے ہیں۔“

”یہ کام ہو جائے گا۔“

”ہو نہیں جائے گا، بلکہ ابھی ہونا چاہیے۔ میرے ذہن میں تو آپ کا خیال بالکل ہی نہیں آیا تھا۔ یہ مہمان بڑے اہم قسم کے ہیں اور ان کے بارے میں ہمیں ہر قسم کے حالات سے آگاہ ہونا ضروری ہوگا۔“

”تو آئیے۔۔۔ آپ ان جگہوں کا تعین کر دیجیے۔ جہاں مجھے اپنے ڈکٹافون لگانے ہوں گے۔“ اکبر نے کہا اور شیریں نے گردن ہلا دی۔

ٹھوڑی دیر بعد وہ اوپر والی منزل کے ان کمروں میں پہنچ گیا جہاں ملازمین اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ ان کمروں کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ نہایت قیمتی ڈیکوریشن پیش رکھ دیے گئے تھے۔ شیریں اور اکبر اپنے مطلب کی جگہوں کا انتخاب کرنے لگے اور منتظر طور پر انہوں نے وہ جگہیں منتخب کر لیں جہاں ڈکٹافون چکانے تھے۔ خاص قسم کے ڈکٹافون تھے جن کے پیچھے سے بڑے بڑے ہوتے اور یہ ریڈ اس قسم کا تھا کہ اسے جہاں بھی چپکا دیا جائے وہاں سے آسانی سے چھڑایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ تینوں کمروں میں تین مناسب جگہوں پر ملاقات ڈکٹافون چپکا دیے گئے۔ کسی کو بھی کانوں کاں خبر نہ ہو سکی کہ یہ وہ جگہیں تھیں جن کی آرائش میں جگہی اور اب اس بات کا امکان نہیں کہ ملازم وہاں ہاتھ لگائیں گے۔ اس کام سے پہلے ہی ہونے کے بعد دونوں باہر نکل آئے۔ شیریں نے اپنا کھانا شام دادا ابو کو دلایا کہ کچھ مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں اسے مصروف رہنا ہے۔ چنانچہ وہ اپنا کھانا کھائیں پیچھے لے گا۔ دادا ابو نے بھی کچھ دیکھا تھا کہ اب کوئی خاص کام نہیں ہے۔ لہذا وہ اطمینان و سکون سے اپنا کام کرے۔

شام کو گاڑیاں تیار ہو گئیں۔ نفیسہ، امیہ، بدر، صفدر، اکبر، بیگم صاحبہ اور شیریں ڈرائیوروں کے ساتھ چل پڑے اور اپر پورٹ پر پہنچ گئے۔ ٹھوڑی دیر میں طیارہ فضا میں نظر آیا اور پھر طیارہ جلد ہی

تیار یاں کرنی تھیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور شیریں ابھی اپنا کام ختم نہیں کر پایا تھا کہ اکبر نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور شیریں کی چونک پڑا۔

”ارے۔۔۔ ارے آؤ اکبر آؤ، خیریت، کوئی خاص بات ہے۔“

”نہیں چیف! ان دنوں طبیعت ذرا کچھ اداس ہے۔“ اکبر نے دہانہ لال کھاتے ہوئے کہا اور شیریں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آؤ ٹھیکو اور طبیعت کی اداسی کی وجہ بتاؤ۔“

”چیف! آپ کا اکبر ایک سرگرم کارکن ہے اور جب معاملات ٹھنڈے ہوں تو پھر بحال زندگی میں کیا مزارعہ جاتا ہے۔“ اکبر نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ اکبر! بات تو آپ کی بالکل درست ہے۔ لیکن آپ کو خوش ہو جانا چاہیے کہ آپ کا جاسوسی خبر بہت جلد چلنے والا ہے۔“

”واقعی۔“ اکبر نے ایک دم منہ بھاڑ کر پوچھا۔

”ہاں! البتہ میری رائے ہے کہ آپ اپنا کام شروع ہی کر دیجیے۔“

”لیں سر! آپ مجھے حکم دیجیے۔“ اکبر نے فوراً اٹیشن ہو کر کہا۔

”کچھ مہمان آ رہے ہیں آپ کے ڈیڑی کے ساتھ اور اکبر ہمارا تجربہ ہے کہ باہر ملی صاحب جب بھی باہر سے کوئی عجب لے کر آتے ہیں اس کے پیچھے کوئی منصوبہ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ سنے مہمانوں کی جاسوسی لازمی چیز ہے۔“

”گڈ! یہ ہوتی نا بات، آپ کے پاس آنے سے کچھ نہ کچھ کام تو مل جاتا ہے تو پھر کیا حکم ہے میرے لیے۔“

”ملازمین کمرے آراستہ کر رہے ہیں، سجادت کی چیزیں بچانی جاری ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اپنا دائرہ کار میں نظام قائم کر لیتے تاکہ آپ ان مہمانوں کی گفت و شنید سے آگاہ ہو سکیں۔“

قبل کراس

روشن آرا

نہلے پہ دھلا اور سیر کو سوا سیر
ضرور ٹکراتا ہے۔ ایسے ہی دو پیار
کرفنے والوں کی کہانی جس میں
سے ایک سیر تھا تو دوسرا سوا
سیر۔

سسپنس اور حیرت سے بھرپور ایک اچھوتی کہانی

جمع کرنے کے لیے نکلے تھے کسی نے انہیں لوٹنے کی
کوشش کی۔ وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہے تھے
جو دفتر کی عمارت سے چند کڑے فاصلے پر تھا۔ یہ
شاہراہ جو درمیان میں تھی وہ بے حد مصروف ترین تھی
لیکن اس وقت ٹریفک سڑک پر بہت کم ہوتا تھا کیوں
کہ ادھر رہائشی عمارتیں بھی واضح تھیں۔ یہاں صرف
دو بلند و بالا عمارتیں تھیں جن میں مختلف کمپنیوں کے
دفاتر تھے۔ اس پارکنگ لاٹ پر دفتر کی گاڑیاں کھڑی

ایک دفتر کے ایک کام سے ہاؤس
بلڈنگ فاس کارپوریشن کے لیے راج دس بجے نکلی
تھی۔ جب میں دفتر ایک بجے پہنچی تو اس وقت
سارے دفتر میں زبردستی منسلی ہوئی تھی۔ پورا
اسٹاف ٹولیوں کی صورت میں کمر پھر میں مصروف
تھا۔ میں حیران تھی کہ آخر کیا بات ہو گئی ہے۔
ہوا ہے تھا دفتر کے کیشیر ارشد کمال جو محض
تھے۔ بارہ بجے ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے بینک میں

اعظم آپ فکر نہ کریں۔“
”او کے چیف! آپ کا جاسوس آپ کی ہدایت
کے مطابق کام کرے گا۔“ اکبر نے جواب دیا اور
شیری بالکل مطمئن ہو گیا۔
رات کے کھانے کی محفل بڑی جان دار تھی۔
ڈاننگ ہال میں کافی بڑی سی میز پر مختلف
انواع کے کھانے جن دیے گئے تھے۔

جو دیلے پتلے شردانی میں بیوس حضرت
تھے۔ وہ برٹش فورس میں کرنل کا عہدہ رکھتے تھے۔
ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ یوسف نام تھا اور نقشہ غلط
کرتے تھے۔ یقیناً شاعر بھی ہوں گے۔ اس کے
بارے میں ابھی کوئی معلومات یہاں کے رہنے
والوں کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ گول منول بیگم
صلحہ اگر کسی غریب گھرانے میں ہوتی تو جنت
کہلاتیں کرنل یوسف کی اہلیہ کی حیثیت سے ان کا
نام ماہ جین تھا۔

صاحب زادی البتہ ماں کی جسامت کے
مٹی تھیں۔ نہایت ہی نرم و نازک سبک غلط
مالک تھیں اور ان کا نام ماہ رخ تھا۔ صاحبہ
زادے کا نام ثاقب تھا۔ ثاقب یوسف صاحب
شکل سے کسی قدر اخفق نظر آتے تھے۔ دیے تھے
قبول صورت اور نفاست پہنچانے کے کپڑوں سے
اشتی ہوئی پر فیم کی خوشبو مہال کا دماغ خراب
کیے دے رہی تھی۔ غالباً تیز خوشبو استعمال کرنے
کے عادی تھے۔ شیری نے عمدہ لباس پہنا تھا اور
وہ کسی خادم کی حیثیت سے نہیں بلکہ گھر کے ایک فرد
کی حیثیت سے ڈاننگ ہال میں ٹیبل کے گرد بڑی
ہوئی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی ہدایت اسے بیگم
صاحبہ نے کی تھی۔ دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ بیگم
صاحبہ نے خاص طور سے عاقل کو یہ سوچایا تھا اور اس
سلسلے میں شیری کو ہدایت کردی تھی کہ عاقل کو
بہترین سوٹ میں لے کر آئے۔ چنانچہ بیگم صاحبہ
کے ذہن میں کیا پروگرام تھا۔

(جاری ہے)

”خاکسار کو شہر بار کہتے ہیں۔“
”اے۔۔۔“ کرنل صاحب چونک کر اسے
دیکھنے لگے۔ اس وقت باہر علی صاحب نے آگے بڑھ
کر کرنل صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر آہستہ سے
بولے۔

”آئیے کرنل صاحب گاڑیاں موجود ہیں۔ گھر
پر چل کر گفتگو ہوگی۔“ کرنل صاحب نے دو تین بار
مڑ کر شیری کو دیکھا تھا۔ لیکن شیری بیگم کی شکل بتانے
ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ پھر اسے ملازموں کی
گاڑیوں میں بیٹھنا پڑا۔

گوشی میں ان کی پذیرائی بڑے شان دار
انداز میں کی گئی۔ بیگم صاحبہ نے باہر علی صاحب کو
خوش کرنے کے لیے ملازموں کو نئے لباس سے
آراستہ کیا تھا اور تمام ملازم ایک جگہ ان کے
استقبال کے لیے جمع تھے۔ بہر طور مہمانوں کو فوری
طور پر ان کے کمروں میں پہنچا دیا گیا حالانکہ بیگم
صاحبہ کو مہمانوں کی تعداد نہیں معلوم تھی، لیکن انہوں
نے تین کمرے آراستہ کرائے تھے جو کافی کشادہ
تھے۔ پہلے تو یہ لوگ ایک کمرے میں جمع ہو گئے
تھے۔ شیری وہاں سے چلا آیا تھا۔ اس لیے اسے
نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کے درمیان کیا گفتگو
ہوئی۔ بہر طور یہ پورا خاندان بے مقصد یہاں نہیں
آیا تھا اور شیری کو اس سلسلے میں ان کے بارے میں
سب کچھ جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے
اکبر سے ملاقات کی۔ اکبر بھی خیر انداز میں شیری کو
دیکھ رہا تھا۔

”چیف! دشمن آگیا ہے۔“
”ہاں اکبر! تم یوں کرو کہ اپنے کمرے میں تمام
تیاریاں مکمل کرو۔ ان لوگوں کی سب باتیں ریکارڈ
ہوئی جائیں۔“

”چیف! مجھے کچھ کیٹ درکار ہوں گے۔
بروقت گفتگو وغیرہ ریکارڈ کرنے کے لیے مجھے
کیٹوں کی کافی تعداد چاہیے۔“
”وہ آپ کو مہیا کر دیے جائیں گے۔ جاسوس

کی جاتی تھیں۔ جب وہ پارکنگ میں دفتری گاڑی کے پاس پہنچے تو ایک بد معاش نے جو پارکنگ لاث میں کی گاڑی کی آڑ میں کھڑا تھا تیزی سے نکل کر ان کا راستہ روک لیا۔ ایک لکھا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں ترپ رہا تھا۔ اس نے چاقو ان کے سینے پر رکھا دوسرے ہاتھ سے بریف کیس پھینک لیا اس لئے ان پر خوف سے سکتہ سا چھا گیا۔ وہ نہ تو شور مچا سکے اور نہ ہی انہوں نے مزاحمت کی۔ ڈاکو کے بھاگنے پر انہیں ہوش آیا تو انہوں نے چیخا چلنا شروع کر دیا۔ ان کے پیچھے چلانے پر کچھ لوگوں نے اس بد معاش کا تعاقب کیا تو وہ بریف کیس پھینک کر بھاگ نکلا۔ ارشد کمال بریف کیس کے ساتھ واپس دفتر پہنچے تو ان کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ کتنی ہی دیکھ کر ان کے حواس قابو میں نہیں آتے تھے۔

وہ کوئی پانچ برسوں سے بینک میں دفتری رقم جمع کرانے جا رہے تھے۔ آج تک ان کے ساتھ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شہر میں اس قسم کی وارداتیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی چونکہ ان کے ساتھ پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گئے تھے۔ دوسرے دن سے انہوں نے رقم بینک لے جانے سے انکار کیا تو ان کا تبادلہ کر کے قہمت کو کشمیر بنا دیا گیا۔ اس نے بی کام کیا ہوا تھا۔ اس کا انتقال لاہور سے تھا۔ وہ کراچی آ کر ملازمت کر رہی تھی۔ وہ بہت تجربہ کار اور ذہین لڑکی تھی۔

طے یہ ہوا کہ روزانہ قہمت کے ساتھ کوئی لڑکی بریف کیس لے کر بینک جائے گی البتہ اس کام کے لیے دفتری گاڑی استعمال نہیں کی جائے گی۔ جب لڑکیاں ان کے کمرے سے نکل کر اپنی اپنی میزوں پر آئیں تو نرسین نے نئے دفتر میں کام کرتے ہوئے صرف تین مہینے ہو رہے وہ اس سے سرگوشی میں بولی۔

”قہمت تم نے بڑی ہماری ذمہ داری قبول کی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی ارشد کمال صاحب جیسا

واقعہ پیش آ سکتا ہے۔“

”جو بھی واقعہ پیش آتا ہے آنے دو۔“ قہمت نے سرگوشی میں آہستہ سے جواب دیا۔ ”میرا کیا جاتا ہے۔ اس میں سراسر کمپنی کا نقصان ہوگا اور پھر یہ عہدہ اور ذمہ داری سچے صاحب نے سونپی ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی پیش کش نہیں کی۔“

”تم نے اتنی بڑی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیوں نہیں کر دیا۔“ نرسین بولی۔ ”تم نے دانستہ بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔“

”اس لیے کہ اس میں ترقی ہوئی ہے اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا ہے۔“ قہمت نے کہا۔ ”میں اسے کیسے چھوڑ دیتی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہمیں معاشی حالات کے لیے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔“ نرسین نے ایک سرد آہ بھری۔ ”ہماری ضروریات اور مجبوریاں بھی بہت ہیں۔ پوسٹوں اور فزوند تیار رہی تھی کہ تمہاری شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اس کا کیا پتہ؟“

”چل رہی تھی لیکن اب چل نہیں رہی ہے۔“ قہمت نے افسردگی سے بتایا۔ ”لو کے والوں نے اوپر لڑکے نے بھی مجھے پسند کر لیا تھا۔“

”پھر کیا ہوا۔“ نرسین نے دریافت کیا۔

”جب لڑکے نے بھی پسند کر لیا تو بات آگے کیوں نہیں بڑھی؟“

”اس لیے کہ میرے پاس بچہ جو نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”ایک لڑکی کی شادی کے لیے کم از کم لاکھوں رقم چاہیے۔“ نرسین کہنے لگی۔

”مجھے ہی دیکھ لو۔ ہر مہینے میرے لیے ایک نہ ایک رشہ آتا رہتا ہے۔ میرے والدین کے پاس چونکہ صرف چالیس ہزار روپے ہیں۔ اس لیے بات چیت ٹوٹ جاتی ہے۔“

دوسرے دن شام کے وقت قہمت دفتر سے نکلی تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے برس سکتے ہیں۔ جو بس اسٹاپ

اس کے دفتر کے سامنے تھا وہاں سے اس کے روٹ کی بس نہیں جاتی تھی۔ یہاں سے بس میں سوار ہونے کی صورت میں اسے دو بیٹیں تبدیل کرنا پڑتی تھیں۔ اس کا بس اسٹاپ دفتر سے نصف فرلانگ پر تھا۔ وہ وہاں تک پیدل ہی جاتی تھی۔ اس وقت تمام دفاتر چھوٹ چکے تھے۔ اس لیے مردوں اور لڑکیوں کا ایک سیلاب بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی وہ ذرا آگے ہی بڑھی تھی کہ اس نے محسوس کیا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے غیر محسوس انداز سے مڑ کر دیکھا تو اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ اس سے چند قدم پیچھے ایک شخص کسی انگریزی فلم کے ہیرو کی طرح وجہہ اور دراز قد اس کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ اس کا اندازہ یوں درست ثابت ہوا تھا کہ اس شخص کی نگاہیں اس کے سر پر اپرجی ہوئی تھیں۔ اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا کہ وہ اسے درزیدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ قہمت نے اپنی نظریں پھیر لیں۔ پھر اس نے چند لمحوں کے بعد کسی ہاتھ سے پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنے آپ کو اس شخص کی نگاہوں کی گرفت میں پایا۔ اس شخص کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو قہمت کے بدن میں سنسنی سی دوڑ مچ گئی۔ اسے اس بات پر سخت حیرت ہو رہی تھی کہ اس سڑک پر اور بھی خستین اور جوان لڑکیاں چل رہی تھیں اور ان میں بے پناہ شش بھٹی تھی۔ جب کہ وہ ایک سانولے رنگ کی عام لڑکی تھی۔

ابھی وہ بس اسٹاپ سے کچھ ہی فاصلے پر تھی کہ اچانک بادلوں نے اپنا دامن اوڑھ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس نے جلدی سے اپنا تحمیل ہٹا کر سر پر رکھ کے ادھر ادھر دیکھا۔ شاید قریب میں کوئی ریسٹورنٹ یا سائبان ہو۔ قریب میں کوئی ریسٹورنٹ تو نہ تھا البتہ سو بڑھ سو قدم پر کے ایف سی تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے وہ پوری طرح بھیگ جاتی۔ وہ جانے بچاؤ دھڑکتی رہی تھی کہ کسی نے اس پر چھتری کھول دی تھی۔ اس نے چونک کر حیرت سے

دیکھا۔ یہ تو وہی شخص تھا جو اس کے تعاقب میں آ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبراہٹ میں اس نے سوچا کہ وہ چھتری کے نیچے سے نکل جائے مگر پھر بھیگ جانے کے خیال سے رک گئی۔ اس نے نو جوان کا شکر یہ ادا کرنے کے بعد سڑک کا جائزہ لیا۔ دور تک کسی گاڑی کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یکا یک بارش نے طوفانی صورت اختیار کر لی اور تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ نو جوان بھی اس کی پریشانی کو بھانپ گیا تھا۔

”میرا خیال ہے یہ طوفانی بارش فوری رکنے والی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”آئے سانے کے ایف سی میں بیٹھتے ہیں۔ بارش تھمے گی تو آپ چلی جائے گا۔“ قہمت کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چاہتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کے کانوں میں ستار کے دل کش سرنگ رہے ہوں۔ اس شخص کی آواز میں کوئی سحر تھا۔ وہ اس سحر کی اسیر بنی اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ خواہش کے باوجود بھی کے ایف سی نہیں گئی تھی۔ وہ اس شاعرانہ لہجے کی اس لیے بھی محسوس ہو سکتی تھی کہ اس کی تنخواہ اس عیاشی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اسے اپنی نصف تنخواہ ہر ماہ اپنی ماں کو بھیجنا پڑتی تھی جو لاہور میں اس کے ماموں کے ساتھ رہتی تھی۔ سات ہزار روپے اس ڈربے کے کرائے میں نکل جاتے تھے۔ جسے اس کی مالکن قلیل کتنی تھی۔ باقی رقم میں اسے اپنا گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک خالہ اس کے گھر کے قریب رہتی تھی۔ وہ بیوہ تھی۔ وہ اسے بھی ہر ماہ ہزار روپے روپے دیتی تھی۔ کیوں کہ وہ اس کے ہاں چھٹی کا دن گزارتی تھی۔ خالہ اس کے لیے کسی اچھے رشتے کے لیے بھی کوشاں رہتی تھی۔ کے ایف سی میں اس سے ہمیشہ رش دیکھا تھا۔ لیکن وہ بارش کی وجہ سے کچھ بھیگ گیا تھا۔ اتفاق سے ایک کونے والی میز جس کے گرد صرف دو کرسیاں تھیں۔ وہ اس پر جا بیٹھے۔ ہونٹ میں بیٹھے ہوئے مردہ، لڑکے، لڑکیاں، عورتیں اور جوڑے بارش کا پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ لیکن ہر گز اور چکن کی دوسری

ڈشیں، کوئلڈز ٹکس اور چائے کافی بھی چل رہی تھیں۔ وہ شخص میز پر اسے بٹھانے کے بعد اس کے اور اپنے لیے برک اور چکن لیک اور کافی لے آیا۔ اس کے اندازے کے مطابق یہ دو تین ہزار روپے کی تھیں۔ وہ یہ سب دیکھ کر ایک دم سے شپٹا گئی۔ پھر اس نے کہا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے نہ تو کچھ کھانا پینا ہے۔ نہ مجھے بھوک لگی ہے جو آپ اتنا کچھ اٹھا لے۔“

وہ اتنی ساری چیزیں لے آیا تھا۔ وہ گھٹت کی بات سن کر بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”مجھ تانچہ کی طرف سے ایک انجانے دوست ساتھی کے لیے شام کا ناشتا اور کافی۔۔۔ شام اور بارش کا لطف دو بار لکرنے کے لیے۔“

”مگر مسٹر۔!“ وہ سر کو جھکا دے کر بولی اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میرا نام کامران ہے۔“ وہ اپنا تعارف مسکراتے ہوئے نے تلے اور متاثر کن لہجے میں کرانے لگا۔ ”دیکھیے آپ مجھے کوئی فلت نہ سمجھیے۔ میں بارش کی وجہ سے آپ کو پریشان دیکھ کر آپ کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا۔ اگر آپ جاہل تو ہم دوست بن سکتے ہیں ورنہ یہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے کو فراموش کر دیں گے۔“

گھٹت کا دل انوکھے خیالات سے دھڑکنے لگا۔ آج تک کسی مرد نے اس سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی اس جیسی معمولی شکل صورت کی لڑکی کو دوستی کی پیش کش کر سکتا ہے۔ وہ اس وقت خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔

”میں ایک معمولی سی لڑکی ہوں اور آپ ایک صاحب حیثیت آدمی ہیں۔“ گھٹت نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مگر۔۔۔“

”میں کوئی امیر کبیر آدمی نہیں ہوں۔“ کامران

اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”اس بات کا آپ نے کیسے اعزازہ کر لیا۔“

”جب آپ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں ہیں تو اتنے بڑے ریسٹورنٹ میں مجھے کس لیے لے آئے۔“ وہ بڑی سادگی سے بولی۔

”اوہ۔ یہ بات ہے۔“ کامران کے لبوں پر ایک دل کش مسکراہٹ بھیل گئی۔ ”اصل بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست ظفر دو برس کے لیے کینیڈا ملازمت کے لیے گیا ہوا ہے۔ اس فلیٹ کو وہ مجھے رہائش کے لیے دے گیا ہے جو کلفٹن میں ہے۔ یہ فلیٹ مفت میں ملنے سے میری ماہانہ تین ہزار روپے کی بچت ہوگئی۔ اس لیے میں ذرا ہاتھ کھول کر خرچ کرتا ہوں۔“

”میرا نام گھٹت ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں ایک تعمیراتی مینیجمنٹ کی مشیر ہوں اور فیڈرل بی ایریا میں رہتی ہوں۔“

اس کے سامنے ٹرے پر چائے، میٹھا اور چکن برکس رکھا ہوا تھا جسے دیکھ کر اس کے دل میں بانی بھر بھر کر آ رہا تھا۔ یوں بھی اس ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے وقت اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ وہ مسکے الفی میں اس کھانے کے خواب دیکھتی تھی وہ آج پورا ہو گیا تھا۔

ناشتے کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں بتاتے رہے۔ گھٹت نے اسے اپنی بی بی مار کے بارے میں بتایا جو اس کے دل میں رہتی تھی۔ اپنی خال اور اپنے بارے میں بھی بتایا۔ کامران نے اسے بتایا کہ وہ ایک پرائیویٹ جاب کرتا ہے، اس کے علاوہ اسے کمیشن وغیرہ بھی مل جاتا ہے جو بیس پچیس ہزار روپے بن جاتے ہیں۔

بارش پورے دو گھنٹے تک ہوتی رہی تھی۔ اس دوران وہ بڑی حد تک بے تکلف ہو چکے تھے۔ گھٹت نے فحسوں کیا کہ کامران نے اسے پسند کر لیا ہے۔ وہ نہ صرف اس کے دل میں بلکہ اس کے من میں بھی آ بیٹھا۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس پر محبت کا فیر طاری تھا۔ اس نے سٹھارہ میز کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو ہر طرح اور ہر زاویے سے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ اس نے بھی اس انداز سے اپنے آپ کو کھین دیکھا تھا۔ لیکن آج بات کچھ اور ہی تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کے بدن کے نشیب و فراز میں اتنی دلکشی ہے کہ ایک مرد کو دلوانا بنا سکتی ہے۔ گو کہ اس کی رنگت اجلی نہیں ہے لیکن اس کی سادگی رنگت میں نمک ہے۔ اس کا بدن بے حد مہر پور ہے۔ اگلے روز وہ دفتر پہنچی تو اسے بس کی وجہ سے دس منٹ کی تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ سارا راستہ کامران کے خیالوں میں کھوئی رہی تھی اور دفتر پہنچی تو کامران اس وقت بھی اس کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اسے اس بات کا حال بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے ذمے آج ایک ایسا کام سونپا جا رہا ہے۔ اس نے فم وصولی کے کمرے میں آکر دیکھا تو وہ کچھ مینیجمنٹ کے گاہکوں سے اقساط کی رقمیں وصول کر رہی تھی۔ پھر اسے ایک فلت خیال آیا کہ اسے چیک رقم لے کر جانا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا تھا۔

ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے منیجر صدیقی صاحب نے اسے اور غزالہ کو کمرے میں بلا کر تجوری میں سے لے کر وصول شدہ رقم کی جو تین لاکھ تین ہزار تھی۔ وہ دولاکھ نوے ہزار روپے پانچ سو اسی ہزار کے نوٹوں میں تھے۔ چھوٹے نوٹ بینک میں جمع نہیں کیے جاتے تھے کیوں کہ دفتر کے اخراجات اور مزدوروں کو یومیہ اجرت دینے کے لیے روک لیے جاتے تھے۔ جہاں تعمیراتی کام ہو رہا تھا وہاں مزدوروں کو روزانہ اجرت دی جاتی تھی۔ اس نے اور غزالہ نے مل کر نوٹ گنے۔ اس وقت نسرین منیجر صاحب کے لیے چائے لے کر آئی۔ گھٹت نے ایک موٹے کاغذ کے بڑے لفافے میں جس پر مینیجمنٹ کا نام چھاپا ہوا تھا اس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھ دیں۔ کل دو لاکھ پانچ سو تھی۔ یہ لفافہ بڑی آسانی سے اس جھیلے نما پرس میں آ گیا اور

باہر سے لگتا بھی نہیں تھا کہ اس میں نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ صدیقی صاحب یہ دیکھ کر اور بھی خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر جاؤ۔

وہ ٹھیک بارہ بجے دھڑکتے دل سے دفتر سے نکلی تو میں، نسرین، افریوہ اور غزالہ نے اسے الوداع کہا اور اس کی ڈھارس بندھائی۔ وہ بظاہر بڑی تامل اور پرسکون فی دفتر سے نکل کر فلت کے پاس آئی مگر اس کا دل سینے میں بری طرح دھڑک رہا تھا اور ایک انجانا سا خوف دامن گیر تھا۔ اپنی زندگی میں وہ بھی اتنی بڑی رقم اپنے پرس میں لے کر نہیں نکلی تھی۔ جس وقت وہ عمارت سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی اس کی طرف دیکھتی ہوئی ہر آنکھ سے اسے خوف سا آ رہا تھا۔ وہ بڑی محتاط اور چوکنا تھی۔ اس نے پرس کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ مگر ایک ہاتھ سے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ بس اسٹاپ پر پہنچی تو وہ پیدہ پیدہ ہو چکی تھی۔ کل کی بارش سے موسم خوش گوار ہونے کے بجائے اور گرم ہو گیا تھا اور جس بھی ہو رہا تھا۔ اسے ہر شخص مشکوک سا لگ رہا تھا۔ وہ بس میں سوار ہو کر بینک کے سامنے اتری اور اس نے بینک میں قدم رکھا تو جان میں جان آئی اور اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ اس کے سارے بدن میں ایک عجیب سی فرحت دوڑ گئی۔ پھر اس نے بینک سے صدیقی صاحب کو فون کر کے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دے دی۔ جب وہ وہاں دفتر پہنچی تو نہ صرف منیجر صدیقی صاحب بہت خوش تھے بلکہ وہ بھی، جیسے وہ کوئی معرکہ سر کر کے آئی ہو۔ صدیقی صاحب کے خیال میں یہ تجربہ بہت کامیاب رہا تھا اور کوئی بدامناں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک لڑکی اپنے پرس میں اتنی بڑی رقم بینک میں جمع کرانے لے جا سکتی ہے۔ گھٹت کا حوصلہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ اس نے چائے مجھ سے اور نسرین سے بڑے غرور سے کہا تھا کہ وہ دس لاکھ کی رقم بھی لے جا سکتی ہے۔ اس کی بات سن کر نسرین مسکرائی تھی اور میں خاموش رہ گئی تھی۔

شام میں جب وہ ڈیوٹی آف کر کے دفتر کی عمارت سے باہر آئی تو اس نے کامران کو بے چینی سے منتظر پایا۔ اس نے کامران کی آنکھوں میں محبت کا والہانہ انداز دیکھا تو وہ کسی نئی نوبلی دلن کی طرح شرما کر رہ گئی۔ کامران نے ایک انگریزی فلم نائی ٹینک کی دو ٹکٹیں بک کی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں سیدھے سینما ہال پہنچے تو فلم کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ انگریزی فلمیں نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے اس فلم کی بہت تحریف سنی تھی۔ اب اس فلم کی ایک لمبے عرصے کے بعد دوبارہ نمائش ہو رہی تھی۔ فلم دیکھتے ہوئے ایک بے حد جذباتی ردناوی منظر آیا تو کامران نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس کی کس نس میں ایک اونچی اور لطیف لہر دوڑ گئی اور سارے بدن میں خون رقص کرنے لگا۔ اس نے بھی کامران کا ہاتھ بے خودی سے تھام لیا۔ جب وہ دونوں سینما ہال سے نکلے تو ان کی محبت بھری کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کامران نے ایک قریبی باری کیو میں لے جا کر نہ صرف چلن، نچنے کھلانے بلکہ اس سے محبت بھری باتیں بھی کیں اور اس کے حسن و جمال کی تعریفیں بھی کرتا رہا تھا۔

چار دن اور بیت گئے۔ نگہت رقم جمع کرانے کے لیے بینک برابر جاتی رہی تھی۔ اسے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ ان چار دنوں میں اس کی ملاقات کامران سے دہر تہ ہوئی تھی۔ وہ دونوں فلم دیکھنے کے بجائے سفاری پارک اور ساحل سمندر کی سیر و تفریح کرتے رہے تھے۔ بیچے والے دن کامران نے ہفتے کے روز فلم اور ڈنگار پروگرام بنایا۔ فلم دکھانے کے بعد اسے فلیٹ لے جا کر دکھایا جو اس کے دوست کا تھا۔

کامران نے اس سے دریافت کیا۔ ”تم مجھے اپنی خالہ جان سے ملوانے کب لے جاؤ گی؟“
”تم خالہ سے کس لیے ملنا چاہتے ہو؟“ نگہت نے انجان بن کر پوچھا۔
”اس لیے کہ ان سے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے مانگ لوں۔“ کامران نے جواب دیا۔ ”میں ایسا مخصوص کر رہا ہوں کہ اب میں تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔ معلوم نہیں تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا۔ ساری رات تمہارا خواب دیکھتا رہتا ہوں۔“
”میرے ذہن بے نما کمرے کے درو دیوار بھی مجھے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔“ وہ بھی دل کی بات زبان پر لے آئی۔ تمہارا خیال مجھے سونے نہیں دیتا ہے۔ میں انگاروں پر لوتی رہتی ہوں۔ تم آئندہ اتوار کو چل کر میری خالہ سے مل لینا۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ پہلے کوئی فلیٹ کرائے لے لوں پھر اس کے بعد تمہاری خالہ سے ملنے چلوں۔“ کامران نے کہا۔

”کیا تم اپنے دوست جیسا گٹھری فلیٹ کرائے پر لو گے؟“ نگہت نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔
”نہیں۔“ کامران نے سر ہلایا۔ ”اے فلیٹ کا

کرایہ دس ہزار روپے ہوتا ہے۔ میں کہاں ایسا فلیٹ لے سکتا ہوں۔“
”مجھ کو چھوٹوں میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ جا کر زندگی گزارو۔ ہم دونوں وہاں جا کر ملازمت کر کے زندگی گزاریں۔ میں نے سنا ہے کہ سکا پور بہت خوب صورت ہے وہاں کی زندگی بھی اتنی ہی خوب صورت ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ وہاں جا کر رہنے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ بولی۔ ”میں نے بھی سکا پور کی بہت تحریف سنی ہے۔“

”میری ہونے والی بیگم صاحبہ! وہاں جا کر رہنے کے لیے کم از کم تین لاکھ کی رقم چاہیے۔“ کامران نے خوشی سے کہا۔

”تین لاکھ روپے کس لیے؟“ نگہت نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے رقم چاہیے۔“ کامران بتانے لگا۔ ”چونکہ ہمیں وہاں مستقل رہنا ہے اس لیے ملازمت ملنے تک۔ نوکری فراہم نہیں مل جائے گی۔ اس کے لیے دو ایک مہینے دوڑ دو پھر تو کرنا ہوگی۔“

”ہم تین لاکھ روپے کہاں سے لائیں گے؟“ نگہت کا دل اور چہرہ بچھ گیا۔ ”میرے پاس تو تین ہزار روپے بھی نہیں۔“

ہفتے کے روز بھی وہ حسب معمول دفتر کی رقم ویک میں جمع کرانے کے لیے نکلی۔ بس میں سوار ہوئی۔ دفعتاً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ وہ جو رقم لے جا رہی ہے اگر یہ رقم ہاتھ لگ جائے تو گیارہ تاریخ کو تینوں سے چار لاکھ روپے کی رقم بھی ہاتھ لگ سکتی ہے۔ کیوں نہ نہ صبر اور انتظار کرے۔ گیارہ تاریخ کو یو پی رقم پر ہاتھ مارا جائے۔ پھر اس رقم سے سنگاپور جانا جاسکتا ہے۔ رقم اڑانے کا صرف ایک بار ہی موقع ملے گا۔ کیوں نہ اونچا ہاتھ مارا جائے۔ ایسا موقع کب کہاں ملے گا۔

نگہت کی چوری ہوئی۔ اس کے اندر کی نگہت بولی تو وہ اسے سمجھانے لگی۔ ”اس کہانی نے اسے چار برسوں میں کیا دیا۔ اس کی کیا اصلاح میں سے کسی کی خواہ بڑھانی نہیں تھی۔ جب بھی خواہ بڑھانے کا مطالبہ کیا گیا کہانی نے ایک سو ایک غدر پیش کیے کہ ملک اور ہمارے بارے کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ افراط زر کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے آمدنی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ یہی زبردست خسارے میں جا رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

ہفتہ کی شام وہ کامران کے ساتھ ایک نئی انگریزی فلم دیکھنے چلی گئی۔ ان دونوں نے ہوش میں کھانا کھایا اور کامران کے ساتھ ہی فلیٹ پر چلی گئی۔ اس کا ارادہ رات رکنے اور یہی کی رقم اڑانے کا منصوبہ بنانے کا تھا۔ جب اس نے سنگاپور کو کھٹکھٹکا موضوع بنایا تو کامران نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

”نو ذہن تیل ہوگا نہ رادھانا ہے گی۔ ہمارے پاس تین لاکھ روپے ہوں گے اور نہ ہم سنگاپور جا سکیں گے۔ لہذا تم وہاں کے سین خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“
”اگر تم ہمت اور حوصلہ کرو تو ہمارے پاس تین چار لاکھ کی رقم آ سکتی ہے۔“ نگہت اس کی آنکھوں میں چھائی ہوئی بولی۔

”وہ کیسے؟“ کامران اس کے چہرے کو نظر سے کی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔

”وہ ایسے۔۔۔۔۔“ نگہت نے ہنس کر کہا اور اسے اپنا منصوبہ بتایا۔ ”یہ کیسا منصوبہ ہے۔ ہے نا شان دار۔ زوردار۔“

”یہ کام اتنا آسان نہیں جیسا تم سوچ رہی ہو۔“ کامران نے کہا۔ ”اس میں خطرہ ہے۔ اگر میں پکڑا گیا تو میں جیل کی ہوا کھا رہا ہوں گا اور تم میرے لیے بے آب مایہ کی طرح ترپ رہی ہوگی۔“

”کام ایسا کچھ مشکل نہیں۔“ نگہت بولی۔ ”تم مرد ہو کر بزدلی کی باتیں کر رہے ہو۔“

”آخر تم اتنا بڑا خطرہ کس لیے مول لینا چاہتی ہو۔“ کامران نے حیرت سے کہا۔

”ایک حسین اور خواب ناک زندگی گزارنے کے لیے۔“ نگہت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ سنگاپور میں رہ کر وہاں کے ماحول اور سائنسوں سے محفوظ ہوں۔ وہاں بھی زندگی یہاں بالکل نہیں ہے۔“

”میں خود اس شہر اور یہاں کی زندگی سے عاجز اور بے زار آچکا ہوں۔ کاش ایسا ہو سکتا۔“

نگہت نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ کامران کو کلور و فام میں بیٹھا ہوا رومال ساتھ رکھنا تھا۔ نگہت نے اسے بتایا تھا کہ اس کا دفتر عمارت کی نویں منزل پر واقع ہے۔ وہ ٹھیک بارہ بجے اس لفٹ سے نیچے جاتی ہے، جو صرف ڈائریکٹروں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ آٹھویں منزل سے اس لفٹ پر سوار ہو جائے۔ اسے کلور و فام والا رومال ساتھ رکھے ہوش کر دے۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی اس کے پرس سے نوٹوں والا لفافہ نکال لے اور پانچویں منزل پر اتر کے وہ عجیبی جھے کی طرف چلا جائے۔ وہاں جو لفٹ ہوگی اس سے نیچے جا کر سیدھے گھر چلا جائے۔ پھر وہ شام کے وقت اس کے فلیٹ پہنچ جائے گی۔ یہ ایک سیدھا سادا اور آسان منصوبہ ہے۔

بدھ کے روز اس منصوبے پر بڑی خوش اسلوبی سے عمل کیا گیا تھا۔ مجھے بھی اس کا بتایا ہوا منصوبہ ہے حد سیدھا سا اور اوپر عیب لگا تھا۔ کامران نے اسے دیوچ کر رکھو دوام والا رو مال سوکھا کر بے ہوش کر دیا اور اس کے پرس میں سے وہ لفافہ نکال لیا۔ جس میں ایک لاکھ اسی ہزار کی رقم تھی۔ وہ لفافہ لے کر پانچویں منزل پر اتر گیا اور پھر وہ جی جھے کی طرف چلا گیا۔ پھر جی جھے کی لفٹ سے نیچے آ گیا۔

جب گھٹک ہو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو منجر صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک کوچ پر لیٹا پایا۔ کمرے میں صدیقی صاحب، جنرل نیجر کے علاوہ سب اسپیکر اور اس کا ایک ماتحت بھی موجود تھا۔ سب اسپیکر نے اسے کوئی ایک گھنٹے تک اپنے فضول سوالات سے پریشان کیا اور اسے شاید اور پریشان کرتا کر حوالدار اسے یہ بتاتا کہ جی جھے کے لفٹ میں نے پانچویں منزل سے لفٹ میں ایک دروازہ قد اور بارشیل جوان آدمی کو ایک پھولے ہوئے لفافے کے ساتھ کر ڈانڈ طور پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

گھٹک دل میں بہت مسرور تھی کہ اس کا منصوبہ بے حد کامیاب رہا۔ کامران بڑے سکون و اطمینان سے لفافہ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ جس وقت وہ نیجر کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو صدیقی صاحب نے اس کا پرس اس کی طرف بڑھا دیا۔ جب وہ اپنے کین میں بچی تو نرسن اپنی میز پر نہیں تھی۔ وہ ڈائریکٹر تنگ صاحب کے کمرے میں شاید کوئی فائل لے کر گئی ہوئی تھی۔ گھٹک کے لیوں پر ایک خفیہ میسرکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی اس کامیابی کی خوشی میں ناچنے لگے، قہقہہ لگائے، کیوں کہ اس لیے بھی اسے بے انتہا خوشی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنی کمپنی سے تنخواہ بڑھانے کا انتظام بہت سہولت سے لیا تھا۔ دفتر کی چمچی سے ڈراور پیلے نرسن بیک اپ کرنے کے لیے پاؤڈر دم کی تو اس نے برقی

سرعت سے اپنی میز کی دروازے سے لفافہ نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس لفافے میں ایک لاکھ اسی ہزار کی رقم تھی۔ کامران جو لفافہ لے گیا تھا اس میں وہ جعلی نوٹ تھے جو بچے کھیلنے کے لیے خریدے ہیں وہ چشم تصور میں کامران کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے گھر پہنچ کر لفافہ ڈالیں چک چھوڑ دیا کہ اس کے سوا اسے کوئی بھی وہاں سے نکال نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کسی کا خیال جاسکتا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے سے سیدھی کامران کے فلیٹ پر پہنچی۔ کامران اسے دیکھتے ہی برس پڑا۔

”آخر مجھے بے وقوف بنانے اور یہ ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس ڈرامے کے پیچھے نہ صرف وقت خراب ہوا بلکہ ہاتھ بھی کھینچ گئے۔“ اس نے غصے میں آ کر جعلی نوٹوں کی گڈیاں لفافے سے نکال کر فرش پر پھینک دیں۔

”ہاتھ کچھ کیوں نہیں لگا۔“ وہ دلیل سے انداز سے مسکرائی۔ ”ایک لاکھ اسی ہزار روپے نقد ملے ہیں۔“

”کیا مطلب۔“ وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

”مطلب یہ ہے کہ اصلی لفافہ میں نے اپنی میز کی دروازے میں رکھ لیا تھا۔“ گھٹک نے چمک کر کہا۔

”تم نے ایسا کیوں اوجھل کر لیا۔“

کامران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”تمہیں بیانے کے لیے۔“ گھٹک کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ”کیونکہ بہت خطرہ تھا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ اس نے گھٹک کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

”اگر تم کسی وجہ سے پکڑے جاتے تو پھر یہ رقم ہمارے ہاتھ نہیں لگتی۔“ گھٹک نے بتایا۔

”تم جتنی حسین ہوتی ہی ذہین اور تیز بھی ہو۔“ وہ گھٹک کی ذہانت پر حیران ہوا تھا۔ ”وہی تم ذہین اور تیز دکھائی نہیں دیتی ہو اور ہاں تم نے رقم تو

اپنے پاس ہی حفاظت سے رکھی ہے تاہم اس کے پاس تو نہیں رکھوائی۔“ کامران نے پوچھا۔

”اس رقم کو میں نے بڑی حفاظت سے سنہال کر رکھا ہوا ہے۔“ گھٹک نے جواب دیا۔ ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ سنگاپور جانے کی تیاریاں شروع کر دو۔“

”ایک لاکھ اسی ہزار روپے سے کیا ہوگا میری جان۔“ وہ اس کے چہرے پر جھٹکے لگا۔ ”دو لاکھ روپے اور بھی چاہئیں۔“

”وہ بھی ہو جائیں گے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“ وہ قاتحانہ انداز سے مسکرائی۔ ”میں اب۔۔“ کامران کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو یوں لٹے نہیں دیا۔

دوسرے دن رقم لے جانے کی ذمہ داری نرسن اور غزالہ کو سونپی گئی۔ صدیقی صاحب رقم کے ساتھ گھٹک کے کین میں آئے تھے۔ ان تینوں نے مل کر رقم کی جو ایک لاکھ ساٹھ ہزار سی۔ نرسن نے اپنے ہاتھوں سے نوٹوں کی گڈیاں ایک بڑے لفافے میں رکھیں اور اس کا چھ بند کر کے اس پر شپ چکا دیا اور اس لفافے کو شاہجیک بیک میں رکھ لیا جو گھر کے رنگ کا تھا۔ باہر سے دیکھنے سے چھپا نہیں چلتا کہ اس بیک میں کیا ہے۔ ایسے شاہجیک بیک عام طور پر ہینری، ترکاری، پرچون کا سامان اور کپڑے رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ غزالہ اپنا پرس لینے چلی گئی اور نرسن اپنا بیک ایک درستی کرنے پاؤڈر دم۔۔۔ وہ کین میں اسے چھوڑ گئی۔

غزالہ اور نرسن کو بیک رقم لے جانے کا جو کام سونپا گیا تو اسے یوں لگا جیسے اسے اوپر سے نیچے پھینک دیا گیا ہو۔ ایک طرح سے مزید رقم کے حصول کا منصوبہ خاک میں مل کر رہ گیا تھا۔ گیارہ تاریخ آنے میں ابھی چار دن باقی تھے۔ اسے ان چار دنوں میں کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ وہ گھر سے صدمے سے سوچ رہی تھی کہ اگر اس تاریخ تک لاکھوں کی رقم حاصل نہیں ہوتی تو اسے مزید ایک مہینہ انتظار کرنا ہوگا۔ نرسن اپنے بیک اب کا جائزہ لے کر آئی اور کین سے بیک اٹھا کر نکال گئی۔ غزالہ اس کے انتظار میں

باہر کھڑی تھی۔

پہلے کے روز تک وہ رات دن سے تدبیریں سوچتی چلی آ رہی تھی۔ کامران کے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں آ سکا تھا۔ وہ نرسن کے ہاتھ سے شاہجیک بیک چھین کر بھاگنے کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ہفتے کے روز نرسن رقم کو لفافے میں اور لفافہ اپنے پرس میں رکھ کے پاؤڈر دم چلی گئی۔ اس کا چار دنوں سے یہی معمول بن گیا تھا۔ اچانک گھٹک کے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو وہ اچھل پڑی۔ اس نے اپنی اس تدبیر کے بارے میں کامران کو بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے سر پرانز دینا چاہتی تھی۔ پیر کے روز گیارہ تاریخ تھی۔ اس روز تین سے چار لاکھ کی رقم بھی ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی اس تدبیر سے اتنی خوش اور اس میں ایسی کھوٹی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے آپ کو کامران کے ساتھ سنگاپور میں سیر و تفریح اور قریبی مولن مناتے ہوئے محسوس کیا۔

پیر کے روز وہ اپنے کین میں بچی تو اپنی تدبیر پر عمل کرنے کے خیال سے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ نرسن ڈائریکٹر تنگ کے کمرے میں فائل لے کر گئی ہوئی تھی۔ اس ڈائریکٹر کی نگین حراچی کے بارے میں وہ جان چکی تھی۔ وہ نرسن کو کسی نہ کسی بھانے سے زیادہ دیر تک روک لیتا تھا۔ اسے چائے کافی بھی پلاتا تھا۔ نرسن جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی۔ اسے باتیں کرنے اور لبھانے کا فن بھی خوب آتا تھا۔ وہ جب بھی تنگ کے کمرے سے آئی تھی تو اس کا چہرہ اور لباس ساری کہانی سناتا تھا۔ نرسن کے واپس آنے تک وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی اور ناٹل انداز سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ٹھیک سوا گیارہ بجے صدیقی صاحب اور غزالہ اس کے کمرے میں رقم لے کر داخل ہوئے۔ رقم تین لاکھ چالیس ہزار سی۔ ان تینوں نے مل کر جلدی سے اس رقم کی نقی کی۔ پھر اس رقم کو تین لفافوں میں رکھا گیا۔ حسب معمول غزالہ کمرے سے نکلی تو نرسن بھی

اس کے پیچھے پوڈروم چلی گئی تو وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اس نے شاپنگ بیگ سے لفافہ نکال کر الماری کے نیچے اس طرح سے چھپا دیا کہ اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنی میز کی دروازے سے وہ پھولا ہوا لفافہ نکال کر شاپنگ بیگ میں رکھ دیا جو وہ اپنے پرس میں رکھ کر لائی تھی۔ سرین کے پوڈروم سے آکر شاپنگ بیگ اٹھا کر لے جانے تک اس کا دل سینے میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب کو پرسکون بنانے کے لیے تین گلاس شند پانی پیا۔

تجربہ نے یہ منصوبہ بناتے ہوئے تمام پہلوؤں پر سوچ لیا تھا جاسوسی کہانوں نے اس کا ذہن بھرنا بنا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بینک بچھ کر دروازہ افشا ہونے پر اس پر کوئی آج نہیں آ سکتی تھی۔ کیوں کہ غزالہ اور سرین مورد الزام ٹھہری تھیں اور ان کی کسی بات کا پولیس یقین نہیں کرتی۔ اگر اس سے بھی پوچھ بچھ کی جاتی اس کے پرس اور اور میز کی تلاشی لی جاتی تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔ سین اور الماریوں کی بھی تلاشی لینے سے وہاں سے بھی کچھ نکلنے سے رہا۔ الماری کے نیچے جو جگہ تھی وہاں کسی کا خیال نہیں جاسکتا تھا۔ بالفرض محال وہاں سے لفافہ برآمد ہو جاتا تو سرین ہی چھٹی کیوں کہ الماری اس کی کرسی کی پشت پر تھی۔

بارہ بج کر تیس منٹ پر دفتر میں ایک بھونچال سا آگیا۔ بینک مینجر نے ٹیلی فون پر دفتر کو اطلاع دی تھی کہ ایک دروازہ آگ اور بارش محض سرین کو بینک کے باہر ریلواریو دکھا کر اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین کر فرار ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے ہوا کہ راہ گیر کچھ نہیں سمجھ سکے۔ بینک مینجر نے صدیقی صاحب کو خود بینک بلا لیا تھا۔

غیر منتظرانہ تجبیت کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ سرین کے ساتھ بھی یہ ذہنی کا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ وہ دل میں جتنی خوش تھی اس سے کہیں زیادہ

حیران بھی ہو رہی تھی۔ آج اس اتفاق نے اس کی ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ اب وہ بڑے اطمینان سے لفافہ اپنے پرس میں رکھ کر لے جاسکتی تھی۔ اسے کسی بات کا خوف و خدشہ نہیں رہا تھا۔ دفتر میں اس منشی خیر منشی خیر منشی چیل گئی تھی۔ اس ڈیکٹ کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اس شخص کا جو بیٹہ بتایا گیا تھا اس سے بہت ملتا جلتا تھا جس نے تجبیت کو رد مال سمجھا کر بے ہوش کیا تھا اور نوٹوں کا لفافہ لے گیا تھا۔ تجبیت کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ کامران تو نہیں تھا۔ کہیں اس نے سرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ تو نہیں چھینا۔ اس کے خیال میں اس کا کامران ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ دن دہاڑے ایک عجیبان علاقے میں ڈیکٹ کی واردات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ سرین کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھیننے والے شخص کی شکل کامران سے ملتی تھی۔

کوئی دو بجے سرین اور غزالہ آئی تھیں۔ غزالہ کا ردروائی کی وجہ سے ان دونوں کو بینک میں زیادہ دیر رکتا ہوا تھا۔ سرین اتنی خوف زدہ اور ہراساں نہیں تھیں جتنی غزالہ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں جلد ہی دفتر سے چھٹی لے کر چلی گئی تھیں۔ سرین کا چھٹی لے کر جانا اس کے حق میں زیادہ بھروسہ ہوا تھا۔ اس نے چھٹی کے وقت بڑے اطمینان سے رقم کا لفافہ الماری کے نیچے سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لیا تھا۔ جب اس نے گھر پہنچ کر لفافہ نکال کر دیکھا تو سو اور ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دیکھیں تو اسے لگا کہ گڈیاں اسے مسکرا کر دیکھ رہی ہیں۔ یہ رقم نہیں اس کے سہانے خواب تھے۔ اب سنگاپور بام پر رہ گیا تھا۔ وہ کسی اس کی محبت تھی۔ اس کا محبوب تھا اور اس کی مسرت بھری زندگی۔ اس نے یہ سب کچھ صرف اور صرف کامران کو پانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔ وہ کامران کے قلیٹ پر پہنچی تو کامران موجود

نہیں تھا۔ کامران نے اسے ایک ڈبلی کیٹ پالی دے رکھی تھی۔ کچھ دیر بعد کامران آیا تو وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ جب اس نے کامران سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ ”محبیت جب آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے۔ ٹریولنگ ایجنسی خسارے کی وجہ سے بند کر دی گئی ہے اور پھر اس کا دوست کینیڈا سے ایک ہفتے کے بعد آ رہا ہے اور اس کے ساتھ میں اس کی غیر ملکی بیوی بھی ہے۔ اسے اس کے آنے سے دو دن پہلے قلیٹ خالی کرنا ہوگا۔“

”اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔“ وہ چپکٹی ہوئی اس کے قریب ہونے لگی۔ کامران کا مودت آف تھا۔ ”تمہارے نزدیک پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں اب کہاں ہوں گا۔ چار پانچ دنوں میں قلیٹ کرائے پر کہاں کھائے گا پھر اس کے لیے ڈپازٹ کی رقم چھپیں نہیں ہزار روپے کہاں لگے گا اور پھر کڑا برسر کیسے ہوگی۔ کیوں کہ مجھے کوئی سے نکال دیا گیا ہے اور تم سے بے کاری کی حالت میں شادی کیسے کر سکتا ہوں۔“

”جو ہوا وہ بہت اچھا ہی ہوا۔“ وہ اس کے گلے میں ہاتھیں جمال کر کے شوق سے بولی۔ ”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ کامران مگر گمایا۔ ”مجھ پر مصیبت آن پڑی ہے تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”چار پانچ دن کے بعد ہم دونوں سنگاپور میں ہوں گے۔“ تجبیت اس کی طرف دیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”وہاں جا کر شادی کر کے نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

”لگتا ہے کہ تم باہل ہو گئی ہو۔ ایک لاکھ اسی ہزاری رقم ہمارے پاس گھبرا گئی ہے تم اونچے اونچے خواب دیکھنے لگی ہو۔“ کامران نے غصے سے کہا۔ ”اب میرے پاس پانچ لاکھ کی رقم موجود ہے۔“ وہ سینہ پھلا کر بولی۔ ”اب تو ہم سنگاپور جاسکتے ہیں نا۔“

”اتنی بڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آگئی۔“ کامران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”تم مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی ہو۔“ تجبیت نے اسے قدرے تفصیل سے سارا واقعہ سنایا۔ ”اب تمہیں یقین آ گیا۔“

”اوہ تم نے تو کمال کر دیا۔ میری جان۔“ کامران نے خوشی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ کل سے ہم سنگاپور جانے کی تیاری شروع کر دیں گے۔ ہمیں سب سے پہلے اس رقم میں سے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے لیے کٹ کر باقی رقم کو ڈالر میں تبدیل کرنا ہوں گے۔ پھر ایسا کر کل شام کے وقت اپنا پاسپورٹ اور ساری رقم لے کر آ جاؤ۔ میں وہ ایک آدمیوں سے بات کرتا ہوں۔ وہ غیر ملکی کرسی کا کاروبار کرتے ہیں۔“

تجبت رات دس بجے تک قلیٹ میں رہی تھی۔ وہ دونوں جشن بھی مناتے رہے اور سنگاپور جانے اور خریداری کا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے تھے۔ مگر آکر اس نے سوچا کہ مال کو اس رقم میں سے بچھیں ہزار اور اپنی خالہ کو دس ہزار دے دے گی۔ وہ سنگاپور جا کر مال کو ہر ماہ کچھ رقم بھیجتی رہے گی۔ وہ سنگاپور جانے سے دو ایک دن پہلے ہوائی جہاز سے سب لاہور جا کر اسے رقم دے کر شام کی فلائٹ سے واپس آ جائے گی۔ انہیں لاہور روانہ کی اور واپسی کے بارے میں کامران کو بھی نہیں بتائے گی۔ روانہ کی سے ایک دن قبل وہ دفتر جا کر اپنا استعفا پیش کر دے گی اور اس کی وجہ یہ بتائے گی کہ لاہور میں اس کی شادی طے ہو گئی ہے۔

صبح وہ سینہ سے بے دار ہوئی تو اس پر ایک فٹرسا چھایا ہوا تھا اور کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس کا دل دفتر کو جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد دفتر میں فون کیا تو پتا چلا کہ سرین اور غزالہ بھی آج دفتر نہیں آئی ہیں۔ اس نے صدیقی صاحب سے فون پر کہہ دیا کہ اس کی ماں کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی اطلاع آئی ہے وہ آج لاہور جارہی

اس نے پچاس ہزار کی رقم گھر میں چھپا کر رکھ دی۔ پھر وہ ساری رقم پرس میں لے کر کامران کے قلیٹ پر پہنچی تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ کامران قلیٹ میں نہیں تھا۔ اس نے رقم کے لفافے کامران کے بیڈ روم میں رکھ دیے۔ اس نے کامران سے کہا تھا کہ وہ دفتر سے واپسی پر رقم لے کر آئے گی۔ لیکن وہ اس لیے جلدی آگئی تھی کہ اس کا دل گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ کامران کے ساتھ رات جویشن متایا تھا وہ پھر سے اس جشن کی یاد تازہ کرنا چاہتی تھی۔

گھبت نے سوچا کہ کامران کے آنے تک سولینا چاہیے۔ اس خیال سے وہ بیڈ روم میں آگئی اور غیر ارادی طور پر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ پھر اس پر جیسے کوئی بجلی آگری۔

پھر اس نے نسرین کو دیکھا جو کامران کے ساتھ قلعہ لگاتی ہوئی تھیں۔ اسے اتنی ہی ایک لمحے کے لیے اس کے سارے بدن کا خون برف ہو کر رہ گیا۔ اس کا دماغ ایک دم بھک سے اڑ گیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ جیسے کسی بھیانک خواب سے جھگی۔ وہ اپنا پرس لے کر دوسرے بیڈ روم میں آگئی۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ لفافے الماری میں سے نکالے۔ اس نے کمرے کا دروازہ اتنا کھلا رکھا تھا کہ اس میں ایک جھری بن گئی تھی۔ اس کمرے میں پردے کھڑکیوں پر کھینچے ہوئے کی وجہ سے اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑی تھی۔ باہر سے اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ گھبت کا نہ صرف دماغ بلکہ پورا بدن بھی سنسنار رہا تھا۔ جیسے اسے بجلی کا جھکا لگا ہو۔ وہ دونوں بیڈ روم میں داخل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے پردے ہٹ کر روٹی کر دی تھی۔ لاؤنج میں اندھیرا سا تھا اس کی کس نس میں بجلی کی رو کی طرح سنسنات اثر رہی تھی۔ اس کی کچھ جھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ ان دونوں کے ہاتھیں کرنے کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ کامران مسخرانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”کلو اپنے آپ کو بہت حسین، بے حد

ڈھن اور نجانے کیا کچھ سمجھتی ہے۔ میں نے بھی اسے محبت کے جال میں پھنسا کر ایسا بے وقوف بنایا ہے کہ وہ ساری زندگی یاد کرے گی۔ کیوں؟ میرا منصوبہ کیسا راہ وہ کس بری طرح چھن گئی۔“

”بے حد شان دار۔“ نسرین نے جواب دیا۔ ”مگر وہ حرافہ بھی کم نہیں ہے۔ دیکھو تو سہی اس نے کس ہوشیاری سے دفتر سے لفافے تبدیل کر دیے۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر میرے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین لیا اور مجھ پر رشک کرنے لگے کہ میں نے تمہیں ڈھل کر اس کیا ہے۔ اب تمہیں میری بات کا یقین آیا کہ یہ ساری کارستانی اس پڑیل کی تھی۔“

”اب میں بھی اسے ڈھل کر اس کروں گا۔“ کامران استہزائی لہجے میں بولا۔ ”وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہو چکی ہے کہ آسانی سے بے وقوف بن جائے گی۔“

”اچھا اب میں چلوں۔“ نسرین ہلکی سی ہجرے لہجے میں بولی۔ ”وہ تمہاری کال کو بھی بھونچے آتی ہوگی۔“

”نہیں تم نہیں جاؤ گی۔“ کامران نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہ شام چھ بجے رقم لے کر آئے گی۔ ابھی تو دو بج ہی نہیں بجے ہیں۔ نہیں اس کامیابی پر نہ صرف جشن منانا بلکہ تیار کی کا پروگرام بھی بنانا ہے۔ ہم تین دن کے بعد کھانا سے چھو ہو جائیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ اس بیڈ روم کے پردے پاؤں نکلی۔ اب اسے ان لفافوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ محتاط انداز سے باہر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ کمرے کا پردہ قدرے ہٹا ہوا تھا۔ وہ غلاط کی دلدل میں اتنے دھنس چکے تھے کہ انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ جب وہ لفافے سے نیچے جا رہی تو اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس کے خواب شے کی طرح چٹنا چور ہو گئے تھے اور ان کی کرجاں اس کے دل میں چھپ رہی تھیں۔ وہ دل میں کامران کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔

”تم نے ایک عورت کا پیار دیکھا ہے اور اب اس کا انتقام بھی دیکھو۔ تم نے مجھے فریب دے کر جو داغ لگا لیا اب میں بھی تم پر اور تمہاری اس ناگن پر بھی داغ لگاؤں گی۔ اب تم دونوں سنگاپور میں نہیں جیل میں آتی مونا منانا۔“

اس نے ایک سولہ برس کے لڑکے کو پی سی او کے قریب روک کر پوچھا۔ ”تم کہاں تک پڑھے ہو۔“

”میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہا ہوں۔“ اس لڑکے نے جواب دیا۔

”تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟“

”پولیس افسر۔“

”کیا تم ایک نیک کام کر سکتے ہو۔“ گھبت بولی۔ ”نہیں تمہیں اس کے عوض پچاس روپے دوں گی۔“

”کیا۔“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ان دو نمبروں میں سے کسی فون کر کے کہنا کہ کل جو صدر کے ایک بینک کے باہر ڈھنکی کی واردات ہوئی تھی اور ڈاکو ایک عورت کے ہاتھ سے تین لاکھ اپنی ہزار کی رقم چھین کر بھاگ گیا تھا وہ کلفٹن میں ڈریم لینڈ اپارٹمنٹس کے چاروسو نمبر کے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ رقم الماری میں ہے۔ جلد سے جلد وہاں پہنچیں کیونکہ وہ اور اس کی بیوی سنگاپور فرار ہونے والے ہیں۔“

”یہ دوفر کہاں کے ہیں؟“

”ایک پولیس اسٹیشن کا اور دوسرا کہنی کا۔“

گھبت نے جواب دیا۔

جب اس نے جوان لڑکے نے دونوں جگہ ٹیلی فون کر دیا تو اس کے سینے میں بھڑکنی آگ سرد ہو گئی۔ گھبت لڑکے کو پچاس روپے کا نوٹ دے کر سیدھے میرے ہاں آگئی۔ میں بھی اس روز دفتر نہیں گئی تھی۔ اس نے مجھے اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنائی۔ اس کا دل ایک دم سے بھر آیا۔ باوجود کوشش کے وہ آنسوؤں پر قابو نہ پاسکی۔

ک

راشد میاں سحدے کو بچپن ہی سے پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھ ملتی ہو جانے پر بے حد خوش تھے ایک روز ترنگ میں راشد میاں نے سحدے سے پوچھا۔

”تمہیں کھانا کھا دیا وغیرہ بھی پکانا آتا ہے یا نہیں۔“

”کھانا پکانا وغیرہ جیسا کام میں نے کبھی کیا تو نہیں۔“ سحدے نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

”لیکن بچپن کے کھانے پکانے کے طریقے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تمہیں یاد نہیں بچپن میں ہم جب گھر گھر اور مہمان مہمان کھیلا کرتے تھے تو میں مٹی کے قلعے اور آلو جو پڑ کے پانی میں بھوٹ موٹ کے چولہے پر پختا اچھا پکاتی تھی۔“

☆

کک آف دا جنگل

شیر کو جنگل میں جو بھی جانور ملتا۔ اسے گردن سے دو پتلا اور پوچھتا۔

”کک آف دی جنگل کون ہے؟“

سب جواب دیتے: ”حضور! مائی باپ

آپ ہیں۔“

شیر گھومتا ہوا ہاتھی کے پاس پہنچا اور اس سے بھی یہی سوال پوچھا۔

ہاتھی نے سنا۔ اٹھنیاں سے شیر کو سونٹ میں جکڑا اور کھڑا کر مین پر بٹھ دیا۔ شیر کمر سہلاتا ہوا اٹھا اور بولا۔

”بھائی صاحب! اگر آپ کو معلوم نہیں تھا تو خاموش رہتے۔ یہ کیسا مذاق تھا۔“

.....

کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں
سب جانز ہوتا ہے۔ ایک لڑکے کی
داستان جو محبت میں پاگل ہو چکا تھا
اور اپنی محبت کو پانے کے لیے کچھ
بھی کر گزرنا چاہتا تھا

دلچسپ اور سبق آموز معاشرتی کہانی

میرا نام شہزاد ہے۔ شہزاد ہایوں، عروسی
۲۳، ۲۴ کے لگ بھگ ہوئی۔ گھر، عزیز واقارب،
محلے، اسکول، پھر کالج سب ہی جگہ سے مجھے خوب
صورت اور قابل ہونے کی سنائی گئی۔ میں خود بھی
محسوس کرتا تھا کہ قدرت نے مجھے اچھے ذہن کے
ساتھ اچھی شکل و صورت عطا کی ہے۔ ارد گرد کی
عورتیں تو اکثر میری ماں سے میرے متعلق تعریف ہی
کرتی تھیں۔

میں اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا، ہم تین
بہن بھائی تھے۔ بہن سب سے چھوٹی تھی اور اسکول
کے آخری سال میں پڑھ رہی تھی۔ بھائی کالج کے
آخری سال میں پڑھ رہا تھا۔ میری اور بھائی کے
ہی لوگوں کی خواہش تھی کہ میں ابھی اور پڑھائی
کروں۔
میرے والد کی صدر میں کپڑے کی دکان تھی۔
مالی حالات ہمارے گھر کے خاصے اچھے تھے، میرے



چھوٹے بھائی خرم ہایوں نے والد صاحب کے
ساتھ دکان سنہال لی تھی۔ اس لیے مجھے یہ فکر بھی نہیں
تھی کہ والد کے برس کو مجھے سنبھالنا ہے۔ میرا تو ایک
خواب تھا جو میں، امی ابو تینوں ایک ساتھ دیکھ رہے
تھے کہ میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ پڑھا
لکھا اور قابل آدمی بنوں۔

میری زندگی برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چل
رہی تھی۔ صبح اٹھنا، نماز پڑھنا اور پھر ناشتہ کر کے کالج
کی تیاری کرنا۔ چار بجے تک کالج سے واپس گھر آنا،
کھانا کھا کر آرام کرنا پھر ایک انسٹی ٹیوٹ جانا، وہاں
سے واپس آ کر رات کا کھانا کھانا اور پھر سونے تک
مسلسل پڑھائی کرنا۔

میرے اس شب و روز میں ایک دن اچانک
تبدیلی آگئی۔ ہوا یوں کہ میں کالج کے لیے اسٹاپ پر
آیا تو اس وقت لوگوں کا اتنا رشتہ نہیں تھا۔ میں حسب
معمول اپنی بس کھانے کے لیے اسٹاپ پر موجود
اخباروں کے اسٹال پر کڑا اخباروں کی سرچشموں پر
نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ دھنک ایک بجلی سی میری آنکھوں کو
خبر ہو گئی۔ ایک لمحے کو سب کچھ دھندلا سا گیا اور
جب روشنی لوٹی تو میں اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو مجھ سے
چھ سات گز کی دوری پر کھڑی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا
ہو گیا تھا، بس میں اسے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اس نے بھی
شاید یہ بات محسوس کر لی تھی کہ کوئی اسے گھور رہا ہے۔
اس نے میری طرف دیکھا، مجھے یوں لگا کہ وہ
آنکھوں کے رستے میرے دل میں اترتی جا رہی
ہے۔

میری بے خودی پر ایک لمحے کو اس کے لبوں پر
مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔
لیکن میں اسے مسلسل دیکھ رہا تھا، مجھے یہ بھی احساس
نہیں تھا کہ میں بس اسٹاپ پر کھڑا ہوں۔ اتنے میں
ایک بس آئی اور وہ بس کی طرف بڑھ گئی۔ بس میں
چڑھنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا تو نہ
جانے مجھے کیا ہوا۔ میں بلا سوچے سمجھے اس کی بس میں
چڑھ گیا اور راستہ بنا ہوا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے

وہ مجھے دکھائی دے۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، وہ
ایک بار پھر سے مسکرائی۔ مجھے لگا اس کی مسکراہٹ
مجھے حوصلہ دے رہی ہے۔ یہ بات میری لیے باعث
تسکین تھی۔ وہ گلشن اقبال ہینچ کر ایک اسٹاپ پر اترتی
تو میں بھی وہیں اتر گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے
پچھلے ایک قطار میں اس طرح چل رہے تھے کہ دونوں
کے درمیان صرف دس گز کا فاصلہ تھا۔ مختلف گلیوں
سے گزر کر وہ ایک مکان کے گیٹ پر رک گئی۔ چند
منٹوں بعد دروازہ کھلا اور وہ اندر غائب ہو گئی۔ مجھے
 سخت مایوسی ہوئی۔ واپس لوٹ جانے کا سوچا، لیکن
قدم نہیں اٹھ سکے۔ اسی طرح سے دس منٹ گزر گئے
اور پھر اچانک وہ مجھے مکان کے اوپر ہی مجھے میں ایک
کھڑکی میں دکھائی دی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی
تھی۔

اس کی اور میری آنکھیں ایک دوسرے میں ضم
ہو چکی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر سے
مسکراہٹ ابھری، اس بار اس نے مسکراہٹ کے
ساتھ ساتھ ہلا کر پچھلے کوا اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔ میں
سمجھ گیا کہ اس نے مجھے اللہ حافظ کہا۔

میں اس روز کہیں نہیں جاسکا اور سیدھا گھر چلا
آیا۔ امی مجھے وقت سے پہلے گھر پر دیکھ کر پریشان
ہو گئیں۔

”شہزاد! کیا ہوا۔ آج تم جلدی لوٹ آئے
ہو۔“ امی کے سوال پر مجھے پہلی بار جھوٹ کا سہارا لیتا
پڑا۔

”وہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں کب
تک جاگتا رہا اور کب سو گیا۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہے
کہ جاگنے یا سونے کے باوجود میں صرف اس لڑکی ہی
کو دیکھتا رہا ہوں۔ میں اس وقت جاگا جب امی، ابو
کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ تب مجھے معلوم
ہوا کہ رات ہو چکی ہے اور ابو کے آتے ہی امی نے
انہیں تمام صورت حال سے آگاہی دی۔
”کیا ہوا ہے۔“ ابو زود دیک ہی بیٹھ گئے۔

”جانتے نہیں، لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے انہیں سلی کرانے کی کوشش کی۔

”تم نے اپنے اوپر بڑھانی کا بوجھ بھی بہت ڈال لیا ہے۔ ذرا سائنا خیال نہیں کر رہے ہو۔“ امی کی جھکی میں محبت کا سمندر اٹھ رہا تھا۔

مجھے سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ میں اپنے والدین سے جھوٹ بول رہا تھا۔ ”نہیں، اب میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

”چلو پھر کھانا کھانے باہر آ جاؤ۔“ ابو نے ہدایت کی اور پھر کچھ دیر بعد میں گھر والوں کے ہمراہ کھانا کھا رہا تھا۔

میں بالکل رو بوٹ والی حالت میں کھانا کھا رہا تھا۔ مگر سے نکل کر میں بالکل ٹھیک وقت پر اس جگہ پہنچا، جہاں وہ لڑکی کل مجھے ملی تھی۔ لیکن وہ آج وہاں نہیں تھی، میں نے پورے ایک گھنٹے تک اس کا انتظار کیا۔

مجھے کان کو دینے بھی دیر ہو چکی تھی، اس لیے کانچ جانا بے کار تھا لہذا میں بس پکڑ کر سیدھا کھٹن اقبال پہنچ گیا۔

مجھے بہت زیادہ زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی اس لیے کہ چندہ منٹ کے بعد ہی وہ لڑکی مجھے مکان کے اوری حصے میں دکھائی دے گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، وہ ہلکے آسانی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ وہ مجھے آج، کل سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں اسے جھکی باندھے محسوس رہا تھا۔ میرا دل اتنا تیز و تھرک رہا تھا کہ میں خود اس کی تیزی کو محسوس کر رہا تھا۔

مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب دوپہر ہو گئی۔ مجھے تو جب احساس ہوا جب اس نے اللہ حافظ کہہ کر کھڑکی بند کر دی۔ اب مجھے وہاں سے روانہ ہونا تھا، لیکن اس وقت گھر نہیں جاسکتا تھا۔ جلدی گھر جانے کا مطلب گھر والوں کے سوالوں کا سامنا کرنا تھا۔ لہذا میں ایک دوست سے ملنے روانہ ہو گیا۔

کامران مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گیا۔ ہم دونوں نے میزک ساتھ کیا تھا۔ کامران کے والد نہیں تھے،

اس لیے اس نے مزید بڑھانی نہیں کی اور چاب کر لی۔ ایک سال قبل اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں باہر چائے کے ہول پر آ بیٹھے۔ کامران نے چائے کا آؤ رورے کر مجھے مخاطب کیا۔

”آج مجھے میری یاد کیے آ گئی اور وہ بھی اس وقت، یہ وقت تو تیرا کانچ کا ہے۔“ وہ میری روشنی سے بخوبی آگاہ تھا۔

”آج مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔“ میں بہت سنجیدہ تھا۔

”بہت خیریت تو ہے۔“

”مجھے ایک لڑکی نے پریشان کر دیا ہے۔“ میں اسے تمام تفصیل بتاتا چلا گیا۔

کامران میری روداد سن کر مسکرانے لگا اور پھر بولا۔ ”بے وقوف زیادہ سوچنے کے بجائے اس سے ملو اور بات کرو۔“

جب میں کامران کے پاس ملا سے روانہ ہوا تو یہ بات ملے ہوئی تھی کہ مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے۔

اس دن میں گھر پہنچا تو میں نے گھر والوں کو بالکل احساس نہیں ہونے دیا کہ میں کانچ نہیں گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے لوگوں کو شک ہو۔

میری اور اس کی ملاقات کو، جو صرف ایک دوسرے کو دیکھنے تک محدود تھی، چھ روز گزر چکے تھے۔ ساتویں دن وہ مجھ سے باہر ملنے پر راضی ہوئی، اس کے محلے سے دو ایک پارک میں، میں اور وہ ملے۔

”ہم ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں اور حالت یہ ہے کہ روز دیکھے بغیر دن نہیں گزرتا۔“ میں نے بات کرنے کا آغاز کیا۔

”میرا نام زوئی ہے۔“ اس کی مترنم آواز میرے کانوں میں رس گھولی جی پئی تھی۔

”میں شہزاد“ میں بولا۔ ”اپنے گھر میں سے بڑا ہوں۔“ میں اسے اپنے گھر والوں سے متعلق تفصیل بتاتا چلا گیا۔

اس نے بتایا کہ جس روز میں نے اسے پہلی بار اپنے اسٹاپ پر دیکھا تھا، وہ دو دن کانچ کسی کام سے

آئی تھی اور واپس جا رہی تھی۔ اس روز مجھے یوں لگا میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں، اس لیے کہ وہ دو گھنٹے میرے ساتھ رہی تھی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میرے یہ دو گھنٹے کب گزر گئے۔

دیرے دیرے ہماری ملاقاتیں طویل ہوتی چلی گئیں۔ دو ماہ کس طرح گزر گئے، کچھ خبر نہیں ہوئی۔ مجھے ان مہینوں میں اپنی بڑھانی، اپنے مستقبل سے کوئی دل چسپی نہیں رہی۔ مجھے گھر والوں کی فکر نہیں تھی، میری دل چسپی تھی کہ وہ صرف زوئی ہی۔

ہماری دوستی اس بج پر پہنچ چکی تھی کہ میں راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگا۔ جس کا میرے گھر والوں کو بھی پتا نہیں تھا۔

یہ سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ ایک روز زوئی نے کہا کہ ہم اس طرح روزانہ باہر نکل سکتے ہیں لہذا تم میرے گھر کی محبت پر ملنے آیا کرو۔ میں نے فوراً ہائی جیکلی اور پھر جیکلی گلی سے باپ کے ذریعے میں چھت پر پہنچ جاتا تھا۔ زوئی کی بہانے سے چھت پر آ جاتی اور ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔

جب میں وہاں جاتا تو نصف رات بیت چکی ہوتی تھی۔ مجھے اپنے گھر میں بھی چوروں کی طرح داخل ہونا پڑتا تھا۔ زوئی نے مل کر آنے کے بعد بھی مجھے دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔ کمرے میں چاروں طرف زوئی محسوس رہی ہوتی تھی، کبھی وہ مسکرائی تھی تو کبھی ہنسی تھی۔ اس کی ہر حرکت سے مجھے تسکین ملتی تھی اور نہ جانے میں کب سو جاتا تھا۔

”زوئی، اب شاید میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں۔“ میں اس سے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنی بے لوث محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

”مجھے تمہاری یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔“ وہ بڑی آواز سے بولی۔

”کیوں؟ کیا کیا میں نے۔“ میں چونکا۔

”مردوں کی طرح زندہ رہنے کی بات کرو۔“

مجھے مرد پسند ہیں، بڑا دل اور کم زور لوگ میری نفرت کے بھی قابل نہیں ہیں۔“ اس نے تیزی کے ساتھ اپنے ہاتھ کو کھینچ لیا۔

”واقعی میں غلط ہوں۔“ میں نے فوراً بات سنبھالی۔ ”مجھے تو تمہارے ساتھ جینا ہے، زندگی بھر ساتھ رہتا ہے اور میں گدھا ہوں، فضول میں مرنے کی بات کر رہا ہوں۔“

”تم خوش قسمت ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ اس کی آواز میں عجیب سارعب تھا۔ ”ورنہ میرے اوپر تو بہت لوگ چان دیتے ہیں۔“

ایک لمحے تو مجھے یوں لگا وہ میری تو بہن کر رہی ہے۔ ”میرے ساتھ رہنے والے بھی مجھے خوب صورت تو جوان سمجھتے ہیں۔“

وہ بڑے زور سے ہنسی، پھر آواز دبا کر بولی۔ ”تم ہرمان گئے۔ نہیں، تم بھی وجہ ہو اس لیے تو اس وقت میرے ساتھ ہو۔“

”کبھی کبھی تم عجیب سی بات کرتی ہو۔“ اس نے مجھے محسوس کر دیکھا۔ ”عجیب سی بات ہی کرتی ہوں، عجیب سی لگتی تو نہیں ہوں۔“

”اب تم ہرمان لگی ہو۔“ میں مسکرایا۔

”چلو کوئی اور بات کرتے ہیں۔“ اس نے موضوع بدلا اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس نے انگڑائی لینے ہوئے ایک طویل سی جھانکی۔ ”چلو، مجھے نیند آ رہی ہے۔“

میں نے دیکھا کہ آج وہ اپنے وقت سے ایک گھنٹے قبل ہی رخصت ہو رہی تھی۔ میں چلنے کے ارادے سے اٹھ گیا۔

”کل نہیں مل سکوں گی ایک شادی میں جانا ہے، پتا نہیں کب تک لوٹوں۔“ اور میرے جانے کا انتظار کیا بغیر وہاں سے چلی گئی۔ چند منٹ بعد میں بھی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

دوسرے روز رات کے گیارہ بج گئے، لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر تک کر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میرے قدم خود بخود زوئی کے مکان کی

طرف اٹھ رہے تھے۔ جب میں زونہ کے مکان کے نزدیک پہنچا تو سوا بارہ کا ٹائم تھا۔ میں نے کچھ نہیں سوجا اور اسنے طے شدہ راستے کی مدد سے اوپر چھت پر پہنچ گیا اور جیسی کے پیچھے، جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے، وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ شاید وہ آجائے۔ صبح کے پانچ بجے میں مایوس ہو کر وہاں سے واپس لوٹ آیا۔

میں تین دن تک لگا تار وہاں جاتا رہا، لیکن وہ نہیں آئی۔ میری کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ چوتھے روز میں دن کے وقت اس کی ملی میکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک گھنٹے بعد مجھے اس کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے مجھے دیکھا ضرور، لیکن مسکرائی بالکل نہیں۔ دو منٹ بعد وہ وہاں سے ہٹ گئی، لیکن میں اپنی جگہ ڈار ہا۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ پھر آئی۔ اس نے مجھے چند لمحے گھور کر دیکھا، اس کے بعد وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ بالکل نہیں آئی۔ میں نے اس جگہ مزید دو گھنٹے بر باد کیے، لیکن اسے نہیں آنا تھا سو وہ نہیں آئی۔

میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر معاملہ کیا ہے اور زونہ کے روپے میں یہ اچانک تبدیلی کیونکر آئی ہے۔ میں جتنا اس مسئلے پر سوچتا تھا اتنا ہی پریشان ہو جاتا تھا۔

میں پورا دن شام ہونے تک یونہی مڑوں مڑوں پر مڑ گشت کرتا رہا پھر اپنے دوست کامران کے پاس چلا آیا۔ میں نے اسے تمام صورت حال سے آگاہی دی، اس نے یہ کہہ کر ملی دی کہ وہ کسی بات پر خفا ہو گئی ہوگی، اکثر لڑکیاں ذرا ذرا سی بات کو بڑا کر کے ناراض ہو جاتی ہیں اور پھر انہیں بڑی مشکل سے راضی کرنا پڑتا ہے۔

چنانچہ میں دل میں تپہ کر کے رات دس بجے اس کے مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ میں آج اپنے وقت سے دو گھنٹے قبل ہی آ گیا تھا۔ مکان کی پوری چھت پر دریائے تھا، لیکن یہ خاموشی بہت دیر تک قائم

نہیں رہی۔ دس منٹ بعد ہی زونہ وہاں پہنچ گئی۔ وہ مجھے وہاں بے وقت پا کر ششدر رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا، لیکن منہ سے کوئی لفظ باہر نہیں آ رہا تھا۔

”کیوں، حیران کیوں ہو۔“ میں بڑی نرمی اور محبت سے بات کر رہا تھا۔

وہ بہت اعتماد والی لڑکی تھی، اس نے فوراً ہی خود کو سنجال لیا۔ ”تم آتی جلدی آگئے ہو؟“

”دیر سے تو میں کئی بار آیا ہوں، لیکن نہ جانے تمہیں کون سی مصروفیت مل گئی ہے کہ اب تم سے ملنا ہی نہیں ہو رہا ہے۔“

”تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ، ابھی گھر کے سب ہی لوگ جاگ رہے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں، اگر انہیں ہماری محبت کا آج علم ہونا ہے تو ہو جائے دو۔“ میں نے کہا۔ ”آخر ایک دن تو بات سب کے سامنے آتی ہی ہے۔“

”اس طرح رات کے وقت لڑکی کو کوئی بات سامنے آتی ہے تو بات بنتی نہیں بلکہ بڑبڑاتی ہے۔“ اس کی آواز، کچھ دنوں میں سختی تھی۔

”مجھے اب کسی کی پروا نہیں ہے، کسی کا ڈر نہیں ہے۔“ میں بھی مضبوطی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

”لیکن مجھے پروا ہے لہذا تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ غصے سے کہتی تھی۔

”زونہ! یہ ظلم مت کرو، بغیر قصور کے سزا مت دو۔ اگر مجھے سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو میں یہ جاننے بغیر کہ میں قصور دار ہوں یا نہیں، تم سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں گڑگڑا رہا تھا۔

”دیکھو، گھر پر ہمان آئے ہوئے ہیں لہذا ابھی تم چلے جاؤ۔ میں تمہیں بعد میں ملتی ہوں۔“ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں، اس لیے تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ لیکن مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ تم بدل گئی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ کیوں لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو۔“

وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”میں اب تم سے نہیں ملنا چاہتی ہوں۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھی۔ ”دیکھو، ہم ملے تھے، یہ ٹھیک ہے، تم نے مجھے بہت چاہا یہ بات میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ لیکن اب میں تم سے نہیں مل سکتی ہوں۔“

”کیوں۔“ میری آواز خاصی بلند تھی۔ اس نے ڈر کر اطراف میں دیکھا پھر بولی۔

”میری شادی ہو رہی ہے، میرا رشتہ طے ہو چکا ہے۔“

اس کے الفاظ میرے وجود پر ایٹم بم بن کر گرے اور میرے چوتھوں سے اڑ گئے۔ دل ڈوب گیا، دماغ ماؤف ہو گیا۔ آنکھوں کے آگے جیسے اندھیرا آ گیا ہو۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہیں میری اس بات سے بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔“ وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔

”لیکن ہم سب سچی لڑکیاں ہیں، کیا کر سکتی ہیں۔ کمر والوں نے جہاں طے کر دی، وہاں شادی کرنا پڑتی ہے۔ میں بھجھ رہی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میرا دماغ بھک سے اڑ چکا تھا۔ میری پوری دنیا تار کی می میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

میں اس وقت چونکا، جب ایک پولیس کا فٹبیل نے آ کر یہ خبر دی کہ میرے گھر والے مجھ سے ملے آئے ہیں۔ میں اٹھ کر سالنوں کے نزدیک آ گیا۔ جہاں میرا باپ جسے میں نے ایک دم بوڑھا کر دیا تھا، اس کے ساتھ میری ماں، جو چند روز ہی میں برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔

وہ دونوں روزانہ مجھ سے ملنے آتے تھے اور پوری ملاقات میں صرف روتے تھے۔ میں تو ایسا پتھر دل ہو چکا تھا کہ نہ تو انہیں تسلی دیتا تھا اور نہ ان کے آنسو پوچھتا تھا۔

میری ماں تو بس ایک ہی بات بولتی رہتی تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ تو نے یہ سب کیا کر دیا۔ اب میں

دیس

ایک خاتون کی گاڑی مصروف ترین سڑک پر خراب ہو گئی۔ خاتون نے بہت کوشش کی کہ گاڑی اسٹارٹ ہو جائے لیکن وہ نہ ہوئی۔ اتنے میں خاتون کی گاڑی کے پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگ گئیں۔ ہارن پر ہارن بج رہے تھے۔ سب سے زیادہ ہارن خاتون کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کار کا ڈرائیور بجاتا رہا تھا۔ اس پر خاتون کو سخت غصہ آیا وہ تھلائی ہوئی اپنی گاڑی سے اتریں اور پچھلی کار کے ڈرائیور سے جا کر بولیں۔

”میں آپ کی گاڑی کا ہارن بجاتی ہوں۔ اتنی دیر میں آپ میری گاڑی اسٹارٹ کر دیں۔“

اسے کیا بتاتا کہ میں نے یہ سب کیوں کر دیا۔ اس لیے کہ خود میرے پاس جواب نہیں تھا کہ میں نے زونہ کو کیوں جان سے مار ڈالا۔ ہاں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو ٹھیک ہی مارا۔ وہ میری محبت کی قاتل تھی، وہ میرے مستقبل کی قاتل تھی۔ وہ میرے ماں باپ کے خوابوں کی قاتل تھی۔ وہ میرے پورے گھر کی قاتل تھی۔

ایک ہفتے بعد مجھے حوالات سے جیل بھیج دیا گیا اور باقاعدہ سے میرے مقدمے کا آغاز ہو گیا۔ میرے والدین کا کافی پیسے خرچ کر رہے تھے مجھے بچانے کے لیے۔ ادھر زونہ کے والد نے بھی بڑا وکیل کیا ہوا تھا۔

ہمارے ملک میں مقدموں کے فیصلے جلد نہیں ہوتے ہیں لہذا میں بھی منتظر تھا کہ کب میرے مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کب تقدیر یہ طے کر گئی ہے کہ میں نے زونہ کے ساتھ ٹھیک کیا یا پھر میں غلط تھا۔

﴿.....﴾

سائنس میں متعدد آنکھوں کے نام گنوا دیے جنہیں سننے کے بعد لڑکے نے ایک لمحہ سوچا۔ پھر بولا۔ ”فی الحال مجھے ایک گلاس ٹھنڈا پانی دو۔“

بیرا بدلاتا ہوا چلا گیا اور دوسری میز سے پانی کا بھرا ہوا جگ اور گلاس لاکر لڑکے کی میز پر زور سے رکھا۔ لڑکے نے لپک کر پیرے کا گریبان پلٹا لیا۔

”ساللا! ایسا پلڑا ماروں گا کہ تیری باہر آ جاوے گی۔“

”جہاں سنبا ل کر بات کرو صاب ہم کو بھی گندہ گردی آوے ہے۔“ بیرا بھی اٹھ پڑا۔ قریب تھا کہ دونوں کھم گٹھا ہو جاتے کہ فیجر نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

”ای کا ہو رہا ہے بھیلو!“ جب کہ ہوٹل میں موجود دوسرے لوگ اپنی جگہ صم صم بیٹھے رہے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ ایسے میں میرا خاموش تماشا بننا بیضا رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں اپنے پوری کباب کچھوڑ کر اٹھا اور دونوں کو علیحدہ کیا اور لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر اپنی میز پر آ گیا۔

”ذرا ذرا سی بات پر نمبر لوڑ نہیں کرتے یارا!“ میں نے لڑکے سے کہا

”دیکھو نا صاب! ساللا دو کوڑی کا بیرا روہا بہ (رحم) دکھاتا ہے۔“

میں نے گلاس میں پانی اٹھیل کر اسے دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ میں نے سامنے سے گزرتے ہوئے دوسرے بیرے کو بلا کر دو کباب اور چار پوریاں لانے کو کہا۔

”بہنیں صاب جی امیرے لیے کچھ نہ منگوؤ۔“ میں کچھ کھانے پینے کے موڈ میں نہیں۔ لیکن اس وقت تک بیرا آرڈر لے کر جا چکا تھا اور اس بار خلاف توقع واپس آنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”بہنیں صاب جی آپ کھائیے۔“ اس نے پھر تکلف کیا۔

”ارے یارا بہادر لوگ تکلف نہیں کرتے۔ کھاؤ بیو جان بناؤ۔“ میں نے انہی لوگوں کے انداز

اور کی ٹاؤن کے ۱۳ اور ۱۳ نمبر کا علاقہ دیا گیا کہ آپ وہاں جا کر اپنے مشن کا آغاز کریں۔

میں ایک دو دن تو اس علاقے میں محوم پھر کر وہاں کے ماحول کا اندازہ لگاتا رہا۔ وہاں مجھے ہر طرح کے لوگ نظر آئے۔ غریب لوگ بھی، متوسط طبقے کے افراد بھی، کھاتے پیتے اور خوش حال لوگ بھی، پڑھے لکھے بھی اور جاہل اور لکھ مار بھی۔

شام کے وقت وہاں چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں اور رستورانوں میں خاصی بھیڑ بھاڑ نظر آئی۔ بہاری کباب اور کچوری، جسے وہاں کے لوگ پوری کہتے ہیں خاص آسٹم کے طور پر بہت استعمال کیے جاتے ہیں۔ سموسے اور کیکڑے بھی دستیاب ہوتے ہیں مگر شام کا خاص کھانا بہاری کباب اور پوری ہوتا ہے۔

میں نے بھی دو تین دن اس علاقے کے سروے کے دوران بہاری کباب اور کچوری کا خاص لطف لیا۔ یہاں جانے بھی پوچھی جاتی تھی ہے۔ جن میں خصوصی طور پر پلائی ڈولائی جاتی ہے۔

ایک دن میں کوئی ہوٹل میں پوری کباب کھا رہا تھا کہ دیکھا ہوٹل میں ایک لڑکا داخل ہوا جسے دیکھتے ہی کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے فیجر کے علاوہ ہوٹل کے بیرے اور گاہک چمکنا ہو گئے۔ لڑکے کی عمر بدقت تمام سولہ سترہ برس ہوگی۔ دبلا پتلا، سر کے بال بے ترتیب، ٹیٹس اور پینٹ میں ملیں، ٹیٹس کے بن کھلے ہوئے، انگلیوں کے درمیان گلٹی ہوئی سگریٹ۔ وہ ایک خالی ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بیرا اس کے قریب آیا اور کندھے پر پڑی جھانڈن سے میز صاف کرنے لگا۔

”تم لوگ بڑے ہڈ حرام ہو گئے ہو۔“ لڑکے نے بیرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گاہک آ کر بیٹھا سوکھتا رہتا ہے اور تم لوگ جانے کہاں۔۔۔“

بیرے نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہیں سوال کیا۔ ”کیا لاؤں آپ کے لیے؟“

”کیا کیا ہے تمہارے ہوٹل میں؟“

بیرا روایتی انداز میں شروع ہو گیا اور ایک

سماج سدھار ایک ایسا ادارہ جس کا کام معاشرے کے بگڑے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانا تھا۔ ان کی اصلاح کرنی تھی۔ کیا یہ اتنا ہی آسان کام تھا؟

سماج سدھار ادارہ

محمد علی

معاشرے کی الجھنوں کو سلجھانے والے ایک شخص کی داستان

ہم کچھ دوستوں نے مل کر ایک سماج سدھار ادارہ بنایا تھا۔ ہم اپنا وقت بے مقصد کاموں میں صرف کر دیتے ہیں، یہ وقت کسی نیک کام کے لیے صرف کریں۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے مشفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسے افراد کی جو غلط راستے پر چل رہے ہیں اصلاح کرنی چاہیے۔

ابتدا میں ہم نے اس مقصد کو سامنے رکھ کر کئی مضامین لکھے اور انہیں مختلف اخبارات و جرائد میں شائع کروایا۔ مگر ہم اس بات کا اندازہ نہ لگا سکے کہ ان مضامین کو سننے والوں نے پڑھا اور ان میں سے کتنے لوگ متاثر ہوئے۔ لہذا ہماری انجمن نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈ کر لانا ہوگا جو بے راہ روی کا شکار ہیں۔ ان سے بالمشافہ بات کرنا چاہی ہوگی اور ان پر محنت کرنی ہوگی۔ چنانچہ انجمن کے اراکین کو ایک ایک علاقہ دے دیا گیا کہ وہاں جائیں اور اپنے افراد کو افروکھلاش کر کے ان کو سمجھائیں۔ اس ضمن میں مجھے

ہم کچھ دوستوں نے مل کر ایک سماج سدھار ادارہ بنایا تھا۔ ہم اپنا وقت بے مقصد کاموں میں صرف کر دیتے ہیں، یہ وقت کسی نیک کام کے لیے صرف کریں۔ بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے مشفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسے افراد کی جو غلط راستے پر چل رہے ہیں اصلاح کرنی چاہیے۔

ابتدا میں ہم نے اس مقصد کو سامنے رکھ کر کئی مضامین لکھے اور انہیں مختلف اخبارات و جرائد میں



میں کہا اور پھر وہ شروع ہو چکا تھا۔

جب وہ دو چار تھکے تھکے کھانچا تو میں نے محض اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔ ”اراس ہول کا نام فوجی ہول کیوں ہے؟ اس میں تو مجھے کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے ہنسنے کی فوجی ہول ہے۔“

”ہم نے تو بھی اس بات پر سوچا بھی نہیں صاب جی!“ اس نے پوری کباب کھاتے ہوئے کہا۔ ”ہوگا کبھی کوئی فوجی جس نے بھی ہینیاں (ہیپاں) ہول کیا ہو۔ ہم تو ہوں سنیالے کے بعد سے اس کو اسی نام سے دیکھ رہے ہیں۔ ای تو ہول کے مالک لوگوں کو معلوم ہوگا۔“

”لیکن مجھے تو معلوم ہوا ہے اس کے مالک بھی کئی بدل چکے ہیں۔“

”ہاں صاب! اب سالہا کاروبار میں رکھا کا ہے۔ جتنا کم از کم ہے۔ ایک تو مٹکانی، دوسرے آئے دن ہنگامے فساد، ہڑتال، جلاؤ کھیراویسے میں جنس (بزنس) کا کھانک ہوگا۔“

اس روز کباب اور پوری کھلا کر اور ملائی والی چائے پلا کر میں نے اس لڑکے سے گویا دوستی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ پھر بھی کبھی سرشام اس سے اسی طرح کہیں نہیں ملاقات ہوئی رہی۔ اس کا نام صاب تھا۔ آوارہ گردی اور بدعاشی کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں کرتا تھا۔ ۱۳ نمبر کے علاقے میں کہیں رہتا تھا۔ اب میں آہستہ آہستہ اس پر اپنا کام کرنے لگا۔ بڑے غیر محسوس طور پر اسے سمجھانے سمجھانے لگا کہ وہ اپنی ساری بدعاشیوں کو چھوڑ کر بندے دا پتر بن جائے۔ کوئی کام کاج کرے۔ شریف آدمی بن جائے۔ بدی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کے راستے پر چل پڑے، لیکن ایک دن اچانک وہ جیسے پھٹ پڑا اور میز پر زوردار ہاتھ مار کر بڑے غصے سے بولا۔

”نیکی۔۔۔ نیکی۔۔۔ نیکی۔۔۔ یہ آپ ہر وقت نیکی کا پہاڑ کیوں پڑھتے رہتے ہو صاب جی! مجھے بتی کرنی ہے، نیکی، مجھے بتی دینا ہے نیکی۔“

میں نے اس کے لہجے کا برا متایا نہ اس کی

بات کا۔ بڑے پیار سے اس سے کہا۔ ”یار تیرا سلطان رانی والا روپ بڑا اچھا لگتا ہے۔ کاش کہ تو خود اموٹا اور کھڑا جوان ہوتا تو جیج سلطان رانی لگتا۔“

اپنی تعریف سن کر اس کا غصہ خنڈا ہو گیا۔ بائی کا ایک گلاس چڑھا کر بولا۔ ”صاب جی! ہم سے نیکی دینی کی بات مت کیا کرو۔ ہم جیسے بھی ہیں ٹھیک ہیں۔ ہم نیکی بن کر سر پھرے بن کر اپنی مٹی خراب کرنا نہیں چاہتے۔“

میں ہنس دیا۔ مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر وہ بولا۔ ”آپ ہنس کیوں رہے ہو صاب!“

”ہنس اس لیے رہا ہوں کہ تم نے بالکل بچوں جیسی بات کہی ہے۔“

”بچوں والی بات کیسے؟“

”ایک دن میں نے ایک بچے کو دیکھا۔“ میں نے کہا۔ ”حاجت ضرور یہ کرتے کے بعد بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ اس کی ماں اس کے پیچھے پیچھے دھڑکی مٹی مٹا دھلا دھلا۔“

”نہیں میں نہیں دھلاؤں گا۔ مجھے کیلئے دو۔“

میں جیسا ہوں ٹھیک ہوں۔“

میری یہ مثال سن کر وہ بھی ہنس پڑا۔ ”صاب جی! تم بھی بڑے عجیب آدمی ہو۔ تمہاری باتیں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔“

”صوبو بھائی! تم بھی نیکی اور نیکی سہی باتیں کرتے ہو۔ اب دیکھو تم نے جو یہ باتیں کہیں ہیں جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں۔ میں نیکی اور شریف بن کر اپنی مٹی خراب کرنا نہیں چاہتا۔ تو یہ بات سننے میاں کی بات بھی نہیں۔ جس طرح سننے میاں کو دھونا ضروری ہے اسی طرح تمہاری موجودہ حالت کی درستی بھی ضروری ہے۔ تم نے کیسے کہہ دیا میں جیسا بھی ہوں ٹھیک ہوں۔“

صوبو چند لمحوں تک خاموش رہ کر مجھے سمجھاتا رہا پھر بڑے دھمی لہجے میں بولا۔ ”صاب جی! آپ لوگ سرپ (شریف) بننے کو تو بولتے ہو، لیکن سرپ کا

ماٹھ کوئی نہیں دیتا۔ آپ جیسے سرپ لوگ بھی لہکتے کا سجا (سزا) جھگڑتے والوں کی کوئی مدد نہیں کرتے۔“

صوبو کے لہجے میں جو درد پوشیدہ تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت تجربے سے گزر چکا ہے۔ اس لیے ایسی جلی کی باتیں کر رہا ہے۔ میں سونے لگا تب بھی صوبو ملای جانے کی ضرورت کو پیش کر دیا کہ اس کی کوئی بات تھی کہ وہ شرافت اور شریفوں سے اس طرح الگ ہے۔

”ارے صوبو! تم یہاں بیٹھے ہو۔ میں تمہیں دھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔“ میں نے برا بھلا کر دیکھا۔ ہماری میز کے قریب ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔

”کیا بات ہے چاچا! تم ہم کو کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟“ پھر چاچا کے کمرے بولنے سے پہلے خود ہی بول پڑا۔ ”کھیر (کھیر) چھوڑ داس کسے (فیس) کو تم بیٹو! اچھا ہوا تم آگے آگے۔“

آنے والا ناخوشی سے بیٹھ گیا۔ ”یہ صاب جی جو میرے سامنے بیٹھے ہیں۔“ صوبو نے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہم کو سرپ بنانا چاہتے ہیں۔ تم انہیں بتاؤ میرا باپ سرپ تھا۔ اس کو اس کی سرلہکت کا کا صلا ملا اور آج تک اس کی کا سجادہ بھگت رہا ہے۔“

آنے والے شخص نے غور سے میری طرف دیکھا پھر ایک خنڈی آہ بھر کر بولا۔ ”صاب جی! اس کا باپ بڑا نیکی اور شریف آدمی تھا۔ غریب ماں باپ کی اولاد ہونے کے باوجود اس نے بہت معقول تعلیم حاصل کر لی تھی۔ وہ اپنی تعلیم عمل کرنے کے بعد کوئی اچھی سی ملازمت کر کے اپنے بوڑھے باپ کو آرام دینا چاہتا تھا کہ اسے یہ معلوم ہوا وہ جس ہول میں کام کرتا ہے اس کے مالک کا مقروض ہے قرض کی رقم اچھی خاصی ہے۔ اس کے باپ نے یہ قرض اس کی اور اس کی بہن کی شادی کے لیے لیا تھا۔ اس نے ہول کے مالک سے بات کی۔ میرے ابا

کی جی چھٹی کردیں میں آپ کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔“

مالک ہنسا۔ ”ارے بھی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر تم باپ کا قرض چکانا ہی چاہتے ہو تو ہمیں میرے ہول میں ملازمت کر لو اور اس ملازمت کے دوران باپ کا قرض ادا کر دو۔“

”تو کیا میں اتنا پڑ لکھ کر باجی کی جگہ میرا گیری کروں۔“

”ہاں تمہارا یہ سوچنا بھی غلط نہیں ہے۔ تم پڑھ لکھ کر باؤ بن گئے ہو۔ باپ کی جگہ جیرہ گیری تو نہیں کر سکتے۔“ مالک نے فکر مند لہجے میں کہا۔ پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ”تم پڑھ لکھے ہو تو پڑھنے لکھنے کا کام کر لو۔ ہول کے منیجر بن جاؤ۔“

اس نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ”چلو چلے گا۔ اس طرح تو باجی کو کھر بٹھا کر آرام کرنے کا موقع دے سکوں گا۔“

اور پھر وہ اسی ہول میں ملازمت کرنے لگا جہاں اس کا باپ بھی تھا۔ وہاں وہ منیجر بن گیا۔ ایک مہینے کے بعد ریاض الحق نے مالک کو مہینے بھر کا حساب کتاب پیش کیا تو وہ دنگ رہ گیا۔ ”ارے بھائی ریاض الحق میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”نہیں جناب! آپ جاگ رہے ہیں۔“

”مگر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ یہ جو تم نے ایک مہینے میں اتنی آمدنی دکھائی ہے تو کیا یہ صرف حساب کتاب میں ہے یا۔۔۔“

”یہ سارے میسے میں نے بینک میں جمع کرادیے ہیں۔ آپ کے اکاؤنٹ میں۔“

”مگر اتنا منافع، اتنا منافع تو چھ مہینے میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اتنا منافع ایک مہینے میں کیسے ہو گیا بھائی ریاض الحق!“

”حاجی صاحب! آپ اگر برا نہ منائیں تو ایک بات عرض کروں۔“

”ہاں ہاں کو۔“ مالک نے کہا۔

ایک پروفیسر صاحب کلاس میں داخل ہوئے۔ آرام سے بیٹھے کے بعد بائیں جیب میں اپنا قلم تلاش کرنے لگے۔ جب بائیں جیب میں اپنا قلم تلاش کرنے کے بعد نہیں ملا تو گھبرا کر بولے: ”اوہ میں اپنا قلم تو گھر میں ہی بھول آیا، اب کیا ہوگا۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر سوچنے لگے، پھر نکال کر ایک ان کی آنکھوں میں چمک اٹھی اور ایک لڑکے سے کہنے لگے۔ ”سنوٹم ذرا دوڑ کر جاؤ اور میرے گھر سے قلم لے آؤ۔“ لڑکا بڑے ادب سے بولا۔ ”لیکن جناب! مجھے آپ کا گھر نہیں معلوم۔“ پروفیسر صاحب نے جواب دیا: ”کوئی بات نہیں لو میں گھر کا پتا کھنڈے سے رہا ہوں۔“ انہوں نے دائیں جیب سے قلم نکال کر ایک کاغذ پر پتہ لکھا اور بولے: ”یہ نوڈر جلدی آنا مجھے قلم کی سخت ضرورت ہے۔“

☆

سر جن صاحب بہت تیزی سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئے اور گلیٹ بھرے انداز میں بولے۔ ”دیکھو میاں! سر جی نے بہت ترقی کر لی ہے اور زمانہ بھی بہت تیز رفتار ہو گیا ہے میں جن مریضوں کا آپریشن کرتا ہوں وہ ای دن بستر سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور پانچ منٹ چلتے پھرتے ہیں دوسرے دن وہ ایک کھٹے کے لیے چلتے پھرتے ہیں سمجھئے۔ کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔“ ”جی ہاں! میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ آپریشن کے لیے مجھے لینے کی مہلت دیں گے یا کھڑے کھڑے ہی آپریشن کریں گے۔“ مریض نے جانا چاہا۔

لوں کا کرنا ہے پورے کاروبار کا نظام اپنے ہاتھ لے لیں اور اپنی مرضی کے مطابق اپنا ہول بنائیں۔“

”صاحب! اس کا باپ میرا حقیقی بھائی نہیں ہے۔ میرا دوست ہے۔ لیکن بھائیوں سے بڑھ کر مجھے ایک ایک بات ملنا تھا اور جب ضرورت پڑتی تھی مجھ سے مشورہ بھی لیتا تھا۔“

”آپ یہ بتائیں محترم شمس الحق کے والد ریاض الحق کے کہنے پر حاجی صلاح الدین نے اپنے ہول کا کاروبار خود سنبھال لیا تھا۔“ میں نے چاچا جی سے پوچھا۔

”جی بھئی بتانے جا رہا ہوں صاحب جی! ریاض الحق کے کہنے پر حاجی صاحب کرسر کرمیدان میں آئے۔ اب وہ خود تھے اور ریاض الحق جیسا تھی اور دیانت دار تھے۔“

”صاحب جی! یہ سب کچھ ہی دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہول نے بڑی ترقی کر لی۔“

”صاحب جی! ایک بات تو بتانا میں بھول ہی گیا۔“ حاجی صاحب نے جب عمل طور پر ہول کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تو انہیں آہستہ آہستہ پتا چل گیا کہ ان کے محلے میں کتنے لوگ ان کے بدخوا ہیں جو ان کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچاتے رہے ہیں اور اب بھی موقع مل دیکھ کر ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔ لہذا انہوں نے ایسے تمام ملازمین کو ایک ایک کر کے نکال دیا۔ سابقہ منیجر کو تو ریاض الحق جی آدھے پہلے وہ نکال چکے تھے۔ باقی لوگ جب نکلے تو سابقہ منیجر شبیر خان سے ملے اور پتا دیکھ کر اس کے سامنے روپا گیا اور شبیر خان کو بتایا کہ سارے فساد کی جڑ نیا منیجر ریاض الحق ہے۔ شبیر خان کو ان لوگوں نے یہ کہہ کر بھی بھڑکایا کہ غالباً آپ کے خلاف بھی اسی منیجر نے درغلا یا ہوگا۔ ان سب باتوں نے شبیر خان کو کھٹکتا کر دیا اور اس نے کہا۔

”اب حاجی اور اس کے نئے منیجر کو سبق دینے کا وقت آ گیا ہے۔“

آپ نے کبھی کسی سے یہ نہیں پوچھا جو کچھ کرتے ہو اس کا کیا حساب کتاب ہے۔“

”ہاں یہ میرا قصور ہے۔“ مالک نے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے تم میری آنکھیں کھول دی ہیں۔“

”محترم! اگر آپ کو اپنے کاروبار کو سنبھالنا ہے آپ کو بہت وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوں گی سارے نظام کو خود اپنی سخت نگرانی میں چلانا ہوگا۔ آپ نے تو بھی اس بات کی بھی خبر نہیں لی کہ سامان آپ کے ہول کے لیے خریدا جا رہا ہے وہ کیا ہے۔“

حاجی صلاح الدین نے ہاتھ اٹھا کر ریاض الحق کو روک کر پھر بولے۔ ”میں تمہاری اس بات کا مطالبہ نہیں سمجھا۔ ہول کے لیے جو سامان خریدا جا رہا ہے کیا ہے۔“

”حاجی صاحب! کھانا اور کھانا مال خریدا جا رہا تھا، لیکن اعلیٰ کوالٹی کے ٹائم ریسٹورنٹ میں لکھے جاتے تھے۔ مثلاً ہمیں کدو گوشت خریدا جاتا تھا، لیکن پھر کدو گوشت کی قیمت ناہر کی جاتی تھی۔ یہی حال کھانا تیل اور مسالا جات کا تھا۔ اسی طرح بھری ترکاریوں کی کوالٹی بھی ناہر اور کھانا بھی تھی۔ ایسے میں آپ خود ہی سوچئے۔ ہول میں آنے والے مالک کس قدر غیر مطمئن ہو کر لوٹتے ہوں گے۔ لیکن اب جب انہیں اچھا اور تیز کھانا مل رہا ہے تو فطری طور پر ان کی تعداد بڑھ گئی ہے اور ہول کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا ہے۔“

”بیٹے اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے مجھے مکمل طور پر گمراہ ہونے سے بچالیا۔“

”میں نے نہیں حاجی صاحب! آپ کو اللہ نے بچالیا ہے، لیکن ایک بات میں آپ سے عرض کروں گا۔ اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ میں بھی آپ کا ملازم ہوں۔ پتا نہیں کب شیطان میرے نفس پر بھی حاوی ہو جائے۔ اس لیے میں آپ سے درخواست

”میں نے اپنا چارج سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے حساب کتاب کے کھاتوں کا مطالعہ کیا تو مجھے چلرا گیا۔ خدا کی پناہ اتنے چھوٹے سے ہول کے لیے اتنی خریداری۔ میں نے اگلے روز سے خود خریداری کا کام سنبھال لیا۔“ ریاض الحق نے مالک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گوشت کی دکان پر گیا تو قصاب نے کہا، صاحب جی! اپنے گھر کا پتا بتائیں۔“

”کیوں میرے گھر کے پتے سے تمہیں کیا کام ہے۔“

”ارے صاحب! ہم آپ کے گھر پر گوشت بھجوائیں گے نا۔“

”کیسا گوشت؟“

”صاحب جی! ہول کے حساب سے آپ کے گھر گوشت جائے گا نا۔“

”کیوں جائے گا؟“

”یہ تو ہم کو معلوم نہیں پہلے والے منیجر صاحب ڈھائی تین کلو گوشت روزانہ اپنے گھر بھجواتے تھے نا۔“

”مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ ہول کے حساب سے میرے گھر ایک بوٹی بھی نہیں جائے گی۔“

”آپ کی مرضی۔“ قصاب نے کندھے اچکا کر کہا۔

”صاحب جی! ریاض الحق بولا۔ ”یہی حال بھری ترکاری والوں کے ساتھ بھی تھا اور چاول، دال، آٹا اور سالن کی دکان سے بھی تھا۔ منیجر صاحب کے گھر کی ساری ضرورتیں آپ کے ہول کے حساب سے پوری ہوتی تھیں۔“

ہول کے مالک نے اپنا سر ہٹا کر ریاض الحق بولا۔

”حاجی صاحب! ہول کے دوسرے ملازمین بھی حسب استطاعت آپ کو چونا لگاتے تھے۔ جس کو جہاں موقع ملتا تھا ہاتھ دکھا جاتا تھا۔ ایسے میں آپ کا کاروبار چل رہا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی

ڈور احساس کی

فاطمہ توقیر

خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس انداز میں مجھے جھنجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ میں تو بس کچھ عرصے دور رہنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ یہ رشتے اتنے نازک نہیں تھے کہ ٹوٹ جاتے۔

اس شمارے کی ایک حساس و دل گداز سچی کہانی



تھا۔ پولیس کے آتے ہی ان لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

”ہائے ہائے منجھرنے مالک کو گولی مار دی۔“ ہوں میں موجود غنڈوں کے ساتھیوں نے یعنی شاہدین کی حیثیت سے ریاض الحق کے اقدام قتل کی گواہی دی۔ ہوں کے ایک دو کارندوں نے اس بیان کو جھٹلانے کی کوشش بھی کی تو پولیس نے انہیں مار پیٹ کر خاموش کر دیا اور ریاض الحق کو گرفتار کر کے لے گئے۔

یہاں تک کہہ بخش الحق کے چاچا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر بولے۔ ”اور وہ آج بھی اپنی نیکی، سچائی اور بے کتناہی کی سزا بھگت رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کے بال بچے بھی ایک طویل عرصے سے در بدر ہو رہے ہیں۔ یہ ہمسوا کی پڑھے لکھے، نیک، شریف اور دیانت دار باپ کا بیٹا ہے جو باپ کے جرم بے گناہی کی وجہ سے اس حال کو پہنچ گیا ہے۔“ چاچا کی آواز بکھرنے لگی تھی۔ میں نے ان کی طرف بالی کا گلاس بڑھاتے ہوئے پانی پی کر ان کی طبیعت کچھ تسکین دی تو انہوں نے کہا ”صاحب جی! ابرامت مانے گا۔ ہمسو جیسے بڑے گناہگار نو جوانوں کو راہ راست پر لانے سے زیادہ ضروری ان لوگوں کی اصلاح ہے جو معاشرے کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں، لیکن معاشرے کو سدھارنے کے بجائے اسے بگاڑنے والوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ سانپ کا سر کچلنے کے بجائے اسے دودھ پلا رہے ہیں۔“

”کیوں چاچا جی! میں اس مرحلے پر آپ سے تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔ معاشرہ کو بگاڑنے والے ٹھیکے داروں اور سانپ کو دودھ پلانے والوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام جیلاں سے کیا جائے۔ ہمسو جیسے مجرموں کو مار سدھا لیا گیا تو یہی لوگ بڑے مجرموں کو راہ راست پر لانے کا کام بہتر طریقے پر کر سکیں گے۔“

اور اس نے در پردہ ان کے خلاف سازشی کارروائی شروع کر دی۔ اب حاجی کے ہوش میں اکثر گزریز ہونے لگی۔ کچھ غنڈے موالی اکثر بے وجہ ہی ہوش میں دنگا فساد کرنے لگے۔ وہاں جا کر کسی بہانے بات کا جھگڑا بناتے اور مار پیٹ اور توڑ پھوڑ شروع کر دیتے۔ ریاض الحق نے تھا نے پولیس کو ان حالات سے باخبر کیا مگر پولیس پہلے ہی ریاض الحق سے خوش نہیں تھی۔ اس کے باوجود کارندوں کا حلوہ باغ و اس نے بند کر دیا تھا۔ جب کہ بیشتر خان کے دور میں انہیں ملکی چھوٹی تھی۔ جو چاہا ہو کھانا پینا اور ہاتھ منہ صاف کر کے چلتے۔ اب جو گزریز ہو رہی تھی اس کے پس پردہ چونکہ بیشتر خان ہی تھا اس لیے پولیس اس کا یا اس کے پیلوں کا ساتھ دیتی یا ریاض الحق کا۔ پولیس آتی بھی تو بہت دیر سے اور اگر کسی کو پکڑ کر لے بھی جاتی تو تھوڑی دور لے جا کر چھوڑ دیتی۔

”ایک دن ایک غنڈے نے۔۔۔“ چاچا نے ذرا رک کر سانس لینے کے بعد کہا۔ ”مخلص اس بات پر ایک بیرے کو مارنا شروع کر دیا کہ میز صاف کرنے وقت اس کی صافی اس کے کپڑے سے بھگوئی تھی۔ ریاض الحق بھاگ کر آیا اور بیرے کو غنڈے کی دسترس سے آزاد کرانا چاہا تو اس نے بیرے کو پچھے دھکیل کر ریاض الحق پر فائر کر دیا۔ گولی اسے نہیں لگی جب کہ وہ غنڈے کے ہاتھ سے پستول چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ گولی کی آواز سننے ہی پولیس آ گئی تھی۔ دیکھا تو پستول ریاض الحق کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف حاجی صلاح الدین خون میں لٹ پت تڑپ رہے ہیں۔ دراصل غنڈے نے جو گولی چلائی تھی اس کا نشانہ ریاض الحق نہیں حاجی صاحب تھے۔ ریاض الحق تو بیرے کو بچانے کے لیے غنڈے پر پل بڑا تھا اور گولی چلانے پر پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ مگر غنڈے نے عمل طور پر ریاض الحق کے خلاف سازشی پلان تیار کیا ہوا

وہ دیکھائی ایسا تھا میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو فرش پر گر جاتی۔ میرے وجود پر کبھی طاری کسی اور آنکھوں کے سامنے اندیرا سا چھارا تھا۔ میری پور پور سے جیسے لوہنگ رہا تھا۔ میرا اعتماد کرجی کرجی ہو کر بکھر گیا تھا لیکن میں نے بڑی جرأت اور حوصلے کے ساتھ وہ باتیں ہی کہیں جنہوں نے میری حقیقت مجھ پر کھول دی تھی میں اپنے مقابل کھڑی خود سے سوال کر رہی تھی تم کون ہو؟

نے ضبط اور محل کے ساتھ خود پر قابو پایا تھا اور دیوار سے لگے لگے کھڑی تھی۔

پھر اس ہستی کی آواز سنائی دی جس نے اٹھارہ برس مجھے ممتاز اور پیارا دیا تھا۔ وہ میری ماں تھیں۔ ”پر دین ہمارا خون نہیں ہے، ہم! اور تم جانتے ہو کہ ہمارے خاندان میں کسی ایسی لڑکی کو جگہ نہیں دی جاسکتی تھی جو۔۔۔۔۔“

”لیکن امی وہ دونوں بچپن سے اکٹھے رہے ہیں اور اب فرحان بے مضد ہے کہ پروین ہی سے ٹاڑی کرے گا۔ بتایا ابو سے کہہ دیں کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وہ سوچ لیں۔“ بیبا بڑے سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”ہم مجبور ہیں بیٹے! بڑے بھیا خاندانی اصولوں کے سخت پابند ہیں اور وہ اس راز سے آگاہ بھی ہیں۔“ ابو نے افسردہ لہجے میں کہا۔

میں اس سے زیادہ نرسن کی اور رڑوڑے قدموں سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے اپنی کھانگی اور عروسیوں پر آنسوئیں بہائے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا کہ اس خاندان کو مسائل اور الجھنوں کا شکار نہیں ہونے دوں گی۔ میں ان کا بھرم قائم رکھوں گی کہ انہوں نے اٹھارہ برس ایک بے سہارا بچی کو اپنی بیٹی بنایا۔ اس کی پرورش کی اسے عمما پیارا اور شفقت دی۔

تمام رات میں سوچتی رہی کہ کون ہوں؟ میرے والدین کون تھے؟ میں کس کا خون ہوں؟ کیا میرا کوئی بھی نہیں؟ ان لوگوں سے تو اب کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ اٹھارہ برس انہوں نے میرا راز چھپایا تھا۔ یہ شاید آج بھی زبان نہ کھولے اگر فرحان اپنی ماں سے کہہ کر میرے رشتے کے طالب نہ ہوتے۔ یہ فرحان میرے تایا کے بیٹے اور میرے بچپن کے ساتھی ہیں چند دنوں سے گھر کے بھی افراد پریشان تھے لیکن مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ بھائی اور نرسن بیچانے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ بیبا بھی چپ چاپ تھے۔ میں مجھ کی ک نرسن بیچا کے پردیس جانے کی بنا پر بھی اداس

ہیں۔ بیبا دولہا بھائی کے پاس لندن جا رہی تھیں۔ چھٹی کا دن گزار کر پھر لاہور آگئی تھی اور یہاں میری طبیعت بے چین رہی جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ کان سے واپس ہوشل آئی تو کسی کی چین نہ تھا۔ میں اپنی روم میٹ سے کہہ کر اچانک واپس آگئی۔ راستے میں بس خراب ہونے کی وجہ سے عشاء کے بعد چینی۔ حویلی کے گیٹ سے گزر کر میں اپنے کمرے میں آئی۔ بیک رکھا اور امی سے ملنے ان کے کمرے کی جانب جا رہی تھی کہ بڑے کمرے سے باتوں کی آوازیں سنائی دیں اور اپنا نام سن کر میرے قدم رک گئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ میں واپس آگئی ہوں۔

فرحان میرے بچپن کے ساتھی تھے۔ ہم امی حویلی میں کھیلنے کوڑے خور تک پہنچتے تھے۔ ان سے مجھے محبت بھی تھی لیکن میں نے بھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ ابھی ابتدائی تعلیم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ تایا ابو اپنے نئے مکان میں چلے گئے تھے جہاں انہوں نے قصبے کی نئی آبادی میں بنوایا تھا۔ فرحان بھی آتے بھی تو اب ہم پہلے کی طرح نہیں ملے۔ نئے مکان نے میری ٹیکل کان میں داخل کیا تو میں ہلا ہوش ہو گئی اور ہوش میں رہتی تھی۔ وہ بھی مجھ سے کانچا ہوا ہوش تھا۔ ملنے نہ آئے۔ چھٹیوں میں حویلی ہی میں ملاقات ہوئی۔ کبھی انہوں نے مجھ سے کوئی ایسی بات بھی نہ کی تھی۔ میں تصوراتی غلطی میں رہنے والی لڑکیوں میں سے نہ تھی اور نہ ہی میری طبیعت اس انداز میں ہوئی تھی۔ فرحان کی شادی کی بات چلی تھی انہوں نے اپنی پسند کا اظہار کر دیا۔ ہمارا بچپن کا ساتھ تھا اور بزرگ اس سے بے خبر نہ تھے۔ پھر میرے والدین یا گھر کے کسی فرد نے مجھے غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ امی نے بھی یہ نہ کہا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں۔ بیبا میری ہر خواہش پوری کرتے۔ بیبا اور بھائی مجھ سے پیار کر گئے۔ تایا ابو ورنہ میں ملی لیکن امی کی تربیت کا آئیں۔ گو میں ناز و نف میں ملی لیکن امی کی تربیت کا انداز منفرد تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ انسان کو ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

حالات بدلنے کے ساتھ وقت کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں۔ امی نے مجھے ایسی تعلیم اور تربیت دی تھی کہ مجھ میں ہر دکھ سننے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے چٹانوں سے ٹکرانے کی جرات بخشی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھرن اور دکھ کسی بھی جسم لے سکتے ہیں اس لیے جرات و حوصلے کے ساتھ جینا کیونکہ صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا سامنا کر دو کہ جذباتی عواطف بہتر نتائج نہیں رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی حقیقت جانتے کے بعد میں نے اپنے بھرمے ہوئے وجود کو سیٹھ لیا تھا۔ آنسو نہیں بہائے تھے۔ حوصلہ نہیں ہارا تھا اور غم و ہمت کے ساتھ جینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ اس عظیم عورت کی تعلیم و تربیت ہی کا اثر تھا کہ رشتے صرف خون ہی کے نہیں ہوتے۔

ابھی کبھی ہوئی ایک ایک بات آج مجھ پر واضح ہوئی جلدی تھی۔ لیکن ان کی نگاہیں مستقبل پر تھیں۔ اسی دن کے لیے تو انہوں نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ میں خال خال کھڑی ہوئی تھی کہ معائنہ ابوبی قرقر تھی ہوئی آواز سنائی دی۔

”پروین ہمارے خاندان کی بیو نہیں بن سکتی کہ اس کا اس خاندان سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ پروین ہمیں فسادات کے دوران میں ایک کھیت کے اندر اس حالت میں ملی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی کی فحش کے بازوؤں میں چسپی چپچپ کر رہی تھی۔ ان دونوں میں اس علاقے کا تھا نہ انچار مال کی گود میں نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور پھر تمہاری ماں کی گود میں دے کر ان سے کہا کہ آپ کی بچی چند روز مکمل وفات پاگئی تھی۔ قدرت نے اتنی ہی عمر کی محسوم بچی دے دی۔ اسے ہی پروین سمجھے۔ ہم اور نرسن ان دونوں تفصیلات میں تھے۔ پروین کی وفات کی خبر کسی کو ابھی نہیں دی گئی تھی۔ بیبا اسی روز ہمارے ہاں آئے تھے جب ہم اس سچ ماہ کی بچی کو لائے تھے جس کا نام ہم نے پروین ہی رکھا تھا۔“

ابو نے کچھ دیر بعد مزید کہا ”میں یہ راز کبھی ظاہر نہ کرتا لیکن فرحان نے جب والدین سے پروین

کے رشتے کے لیے کہا اور مجھے بھی آج اس حقیقت کو تمہارے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو ہم یہ بھلا چکے تھے کہ یہ ہماری بیوی نہیں ہے۔“ اس سے قبل کیا باتیں ہوئی تھیں مجھے علم نہ تھا میں فیصلہ کر چکی تھی کہ ان کے لیے ابھرن نہیں ہوں گی۔ رات گئے مجھے نیند آئی۔ صبح آکھ کھلی تو سورج نکل آیا تھا اور امی میرے بستر کے قریب بیٹھی تھیں میں نام نہ تھی۔

انہوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”فعلو بابا نے بتایا کہ تم رات عشاء کے بعد آگئی تھیں۔ شاید تمہاری طبیعت خراب تھی آتے ہی سوئیں۔ مگر شاید تم سوئیں نہیں تھیں ٹھیک طرح۔“ میں نگاہیں جھکا کر بیٹھی تھی۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آئیں میرا سر اوپر اٹھایا اور چہرے پر نگاہیں جھاکر بولیں۔

”زندگی کی حقیقتیں انٹھ ہوتی ہیں۔ بیٹی! تم اگر خود آگئی کے چکر میں پڑ گئیں تو کیسے جی سکو گی۔ میں نے اسی دن کے لیے تمہیں تربیت دی تھی۔ میری تربیت کو نہ بھلاؤ بیٹی!“

پھر وہ میرے کمرے سے چلی گئی۔ میں سوچتی رہ گئی کہ یہ خاتون جو میری ماں ہیں، کتنی بڑی نفسیات داں اور قیافہ شناس ہیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں کہا اور یہ ہر بات سمجھ گئیں۔ انہوں نے جی ہی تو کہا تھا کہ زندگی کی حقیقتیں انٹھ ہوتی ہیں اور ان ہی حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تو انہوں نے مجھے اس بیچ اور ان خطوط پر تربیت دی تھی۔ میں بستر سے اٹھی اور منہ ہاتھ دھو کر بڑے کمرے میں آئی تو وہاں صرف امی بیٹھی تھیں۔ گھر کے دیگر افراد ناشتا کر چکے تھے۔ ملازمہ برتن اٹھا کر لے گئی تو امی نے پوچھا کہ میں اتنی جلدی کیسے آگئی؟ میں نے بھانہ کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے چلی آئی اور راستے میں بس خراب ہونے کی وجہ سے دیر ہوئی۔ میں نے کسی کو نہ بتایا صرف سر بھاری تعاب ٹھیک ہوں۔ امی مسکرائیں پھر بولیں ”ذہن پر زور نہ ڈالو۔“

ابھی زندہ ہیں تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔“
ان کی باتیں ذرا سختی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے جھوٹ بولا ہے اور تسلی بھی دی کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ وہ میری ماں ہیں۔ بھابھی اور نرسین بچیا کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ابو اور بھیا بھی گھر میں نہ تھے۔ صرف امی تھیں میں خاموش بیٹھی تھی۔ امی بھی خاموش تھیں جیسے سوچ رہی ہوں۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔

لہجہ میں کہا۔
”آپ پریشان نہ ہوں امی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں اس خاندان کی آن قائم رکھوں گی جس خاندان نے مجھے والدین اور بہن بھائیوں کی محبت دی ہے۔ آپ سے صرف ایک التجا ہے کہ مجھے فرحان سے ملنے کی اجازت دے دیں۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلی۔“
”پروین بیٹی!“ امی نے مضطرب لہجہ میں میری بات کاٹ دی۔

”اس انداز میں نہ سوچو بیٹی! ہم تمہیں اپنی بیٹی ہی کی طرح اس گھر سے رخصت کریں گے۔ رہی فرحان سے ملنے کی بات تو تم اس سے کیا کہو گی؟ اور پھر تم جانتی ہو کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے! تمہارے ابو اجازت نہیں دیں گے۔“

”میرا ان سے ملنا بہت اہم ہے امی! ابو اور تایا ابو کے درمیان نفرت کی دیوار بھی اٹھ چکی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ۔۔۔۔۔“
میری بات سمجھنے کی کوشش کرو رہا تھا۔
”تو تمہارے ابو اپنے بھائی سے تعلق توڑ سکتے ہیں۔ لیکن۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

وہ اب بھی اپنے شوہر کو میرے ابو کہہ رہی تھیں جنہوں نے مجھے باپ کی شفقت دی تھی میرے ناز اٹھائے تھے۔ وہ میری ذرا سی تکلیف پر پریشان ہو جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے گھر داری اور نشاندہ بازی کی تربیت دی تھی۔ ذرا بڑبڑا کر کھائی اور چائے کے حالات سے خبردار نہ ہونے کی تربیت دی تھی۔ چوٹی کے بزرگوں کے سوا پہلے سے علم تھا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں جب ان کی بیٹی پروین کی ولادت ہوئی تھی تو بھیا اور نرسین بچیا اپنے فیصلوں میں تھے۔

انہوں نے تو اپنی نوزائیدہ بہن کو دیکھا بھی نہ تھا۔ حالات بڑے دگرگوں تھے۔ جب قدرت نے مجھے ان کی گود میں ڈالا تو میں چھ ماہ کی تھی۔ اب بھی بات صرف چوٹی کے یکینوں کے درمیان تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں ان کی بیٹی تو تھی لیکن مجھے بیٹی

کو وہ حقوق حاصل نہ تھے جو اس خاندان کی بہو بنتے اشراف دے سکتے۔ امی نے کو مجھے بڑی تسلیاں دی تھیں لیکن میں جو کچھ سوچ چکی تھی مجھے اسی پر عمل کرنا تھا۔ ہر چند کہ فرحان سے ملاقات ان حالات میں ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی اور ماں نے ایک بار کہا تھا کہ کم زور قوت ارادہ کی انسان ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ جب کوئی ایمان یا مسئلہ درپیش ہو تو فکر مند ہونے کی بجائے اس پر غصہ سے دل و دماغ اور عمل کے ساتھ غور کرو اور جب کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ تو اس پر عمل کرو نتائج کو خدا پر چھوڑ دو میں نے بھی کیا کیا۔

رات کو عشاء کی نماز کے بعد جب سب سوئے تھے میں چلے گئے تو میں بھی اپنے کمرے میں چلی آئی لیکن بچاں جلد سو جانے کی عادی تھیں۔ میں نے کمرے کی کھڑکی پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحوں کے بعد میں اپنے کمرے سے نکلنے اور فضلہ بابا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ان کا کمرہ اجلی کی گھٹ کے قریب تھا اور وہ عشاء کے بعد چوٹی کا ایک پکڑ ضرور لگاتے تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ حیران ہوئے اور پوچھا کہ ”خیریت تو ہے؟“

میں نے اپنے بارے میں ان سے بہت سے سوالات کیے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے یہ باور کرانا چاہا کہ کہیں میرے حقیقی والدین ہیں مگر جب میں نے ان سے کہا کہ میں حقیقت جان لی ہوں تو اقرار کر لیا کہ میں نے جو کچھ سنا درست ہے۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ فرحان کو بلا لائیں۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔
”وہ بہن کر حیران ہوئے اور بولے۔“
”بیٹی! اس عمر میں مجھے ذلیل تو نہ کرو صاحب کو معلوم ہو گیا تو مجھے۔۔۔۔۔“

وہ کی طرح نہیں مان رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں اس خاندان کی آبرو پر قربان ہو جاؤں گی مگر حرف نہیں آنے دوں گی۔ میرا فرحان سے ملنا ضروری ہے اور یہ وقت بحث کا نہیں۔ اگر وہ جانے

کے لیے تیار نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔
وہ میرا عزم دیکھ کر نرم ہو گئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ فرحان اپنے گھر میں بلکہ خوب دل پر ہوں گے۔ میں نے بابا سے کھوڑا تیار کرنے کو کہا اور اپنے کمرے میں آ کر لباس تبدیل کیا۔
پھر جب میں گیٹ کے قریب پہنچی تو بابا ابو کے گھوڑے کی لگام میرے ہاتھ میں تھمتے ہوئے بولے۔

”بیٹی! جلدی واپس آ جانا۔ گھر کے کسی فرد کو بھی علم ہو گیا تو میری عزت خراب ہو جائے گی۔“
میں نے گھوڑے کی لگام تھمتے ہوئے انہیں تسلی دی اور چوٹی سے کافی دور آ کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ پھر اسے اڑا لگائی۔

خوب دیر قے سے دو میل دور تھا اور یہاں دو کمروں پر مشتمل ایک کوارٹر تھا جس میں تایا ابو کا ایک ملازم رہتا تھا۔ فرحان گھر والوں سے ناراض ہو کر امی کوارٹر میں چلے آئے تھے۔ میں نے کوارٹر سے باہر گھوڑے کی لگام سنبھالی اور پھر گھر کو کوارٹر کی جانب بڑھی تو فرحان کوارٹر سے باہر ایک درخت تلے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری جانب بڑھنے میں حیران تھی کہ انہیں کس نے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی کہ وہ میرے انتظار میں تھے۔

انہوں نے سپاٹ لہجہ میں پوچھا۔ ”یہاں کس لیے آئی ہو؟“
”مجھے یہ امید تھی کہ آپ مجھے اس طرح رسوا کریں گے!“ میں نے بھی سپاٹ لہجہ میں کہا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو میں بولی۔
”آپ نے جو کچھ کہا وہ آپ کا فعل ہے لیکن میری ایک بات غور سے سن لیجئے فرحان کہ میں آپ سے شدید نفرت کرتی ہوں۔ اگر بزرگ آپ کی ضد کے سامنے جھک بھی گئے تو آپ اس گھر سے میری میت تو اٹھا سکتے ہیں ڈوٹی نہیں۔“
وہ کم صم سے کھڑے تھے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں اس انداز میں بات کروں گی۔

”ہم نے جس بیٹی کو اپنی ہی بیٹی کی طرح پرورش کیا، اس کے لیے آج بھی ہماری منہ پیار اور شفقت میں کوئی فرق یا کمی نہیں آئی لیکن خاندانی اصولوں کے سامنے ہم بے بس ہیں۔ یہ لوگ اپنی آن اور برادری کی ریشم بھاتے ہیں تو ان کے دل پتھر ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اپنی اولاد کو بھی ان رسوں پر قربان کر دیتے ہیں۔“

فرحان باقی ہو گیا ہے۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ اگر پروین ہمارے خاندان کا خون نہیں تو اسے اس سے غرض نہیں کہ اس کے خاندان کا خون انہیں کو اپنی نہیں رکھا۔ ہم پریشان ہیں، بھیا نے اہل فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ خاندانی اصولوں سے انحراف نہیں کریں گے۔

میں ایک عزم کے ساتھ اُٹھی اور بڑے پراعتماد

”آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس خاندان کا خون نہیں، شجر اہل ہوں۔ میرا کوئی حسب نسب نہیں۔ میں اپنے محسنوں پر جان تو ڈال سکتی ہوں لیکن ان کی آن اور روایات کو کبھی توڑ سکتی۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا ہوگا فرحان علی ایامیری موت.....“

”تجہارا آخری فیصلہ ہے؟“ انہوں نے دکھ بھرے لہجے میں میری بات کا ٹکڑا کر لیا۔
ایک لمحے کے لیے میں ڈگمگائی لیکن پھر سنبھل کر بولی۔

”یہ میرا اٹل فیصلہ ہے اور میں اسی یقین و اعتماد کے ساتھ آئی ہوں کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں گے۔“

”تو اب یہاں سے دفع ہو جاؤ! وہی ہوگا جو تم چاہتی ہو۔ ورنہ رسم و رواج میرے لیے بے معنی ہیں۔“ وہ بڑے غصیلے لہجے میں بولے۔

میں نے سگراتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے!“

میں حویلی پہنچی تو فضلو باکی جان میں جان آئی۔ میں بھی سارے راستے خدا سے یہ دعا مانگتی آئی تھی کہ خدا میری لاج رکھنا۔ میں نے جو قدم اٹھایا تھا وہ دو بھائیوں کے مابین کسی غلط فہمی کو بھی جنم دے سکتا تھا اور میں بھی بدنام ہو سکتی تھی۔ اسنے کمرے میں آکر

میں مجھے میں گر گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ مجھے حوصلہ دے اور ثابت قدم رکھے۔ مجھے وقت کا احساس نہ تھا۔ اچانک اپنی پشت پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہوئے میں نے مجھ سے سراٹھایا تو دیکھا اُمی میرے قریب بیٹھی ہیں۔

”سو جاؤ بیٹی! خدا بہتر کرے گا۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ کا سنا نہیں لیا کہ انہیں خبر نہیں ہوئی لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔

دوسرے روز اُمی نے مجھے اسنے کمرے میں بلایا اور پوچھا۔ ”تم فرحان سے ملنے کی تمہیں؟“

میں گھبرا گئی، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں ان سے کیسے مل سکتی ہوں۔“

اُمی نے میرے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔ ”جس جرات کے ساتھ تم نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اسی جرات کے ساتھ چلنا چاہو!“

میں نے سر جھکا لیا۔

وہ بولیں ”فرحان نے اپنی ضد چھوڑ دی ہے اور ماں سے کہا ہے کہ اسے ان کا ہر فیصلہ منظور ہے لیکن اسے اپنی تعلیم سے فارغ ہو لینے دیں وہ واپس لاہور چلا گیا ہے۔ لیکن.....“ وہ لمحہ بھر تو قف کے بعد گویا ہوئیں۔

”اچانک یہ تبدیلی بے معنی نہیں ہے۔ سبھی چیزیں ان ہیں۔ مگر میری کوئی حیرت نہیں کہ میں نے رات راتیں سوچیں جو بچی سے نکلے دیکھا تھا۔ تم میری آواز پر نہ رکھیں تو“ انہوں نے غصہ کر پھر کہا۔

”بیٹی! مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن تمہیں اس نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تمہیں اس نے تم سے ہمیں اس پریشانی سے نجات دلانی چاہی۔ بڑی قربانی دے کر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں اس گھر سے اسی طرح رخصت کریں گے جس طرح نسرین کو کیا تھا۔“

واقعی سب جہان تھے کہ فرحان جو ایک چنان کی طرح اسنے مطالعے پر لڑنے ہوئے تھے اور انہوں نے بزرگوں کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔ اتنی جلدی کس طرح بدل گئے! بھابھی اور نسرین اچھا کی خوش فہمی یہ تھی کہ تانی اُمی نے کسی عامل سے تعاون کر دیا ہے۔ بھیا کو فرحان پر سخت غصہ تھا۔ ابو چپ تھے۔ اُمی کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

میں لاہور واپس آئی تھی۔ دو ہفتے کے بعد میں گھر آئی تو گھر والوں کا رویہ تو وہی تھا مگر لازموں کی نگاہوں میں سوال تھے جیسے سوال کر رہے ہوں۔ کیا میں اس گھر کی بیٹی نہیں؟ بھابھی نے انہیں بتا دیا تھا بھیا سخت پرہیز تھے۔ انہوں نے مجھے بھی میرے کمرے میں گھر لیا۔

”میں سمجھا تھا کہ فرحان بزدل ہے جو کہیں ان کے گھر کو توڑنے کا عزم کر کے بھی بھاگ گیا لیکن یہ کیا دھڑا تھا! ہمارے تم نے خود اپنا حق کھو دیا! اُمی نے ہم پر بھروسہ نہ کیا ہمیں نہ آزمایا۔“ ان کی آواز ہلر رہی تھی۔

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی اور بھیا کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ اس کے سوا کوئی بھی کیا۔

وہ بیار بھرے لہجے میں بولے۔ ”محبت کے رستے اتنے نازک نہیں ہوتے پھر تم دونوں بچپن کے ساتھی ہو۔ تم نے دلوں کے رشتے کیسے توڑ دیئے۔“ اسی لمحے بھابھی کمرے میں داخل ہوئی اور بھیا سے کہا کہ انہیں اُمی بلارہی ہیں۔ بھیا کے جانے کے بعد وہ مجھ سے بولیں۔

”فرہین! میری بات ذہن میں رکھنا کہ منہ بولنے والے رشتے مستحکم نہیں ہوتے۔ تم اب عیم سے اس طرح نہ ملا کرو۔“ اُمی میرے بھیا۔ یعنی ان کے شوہر کا نام تھا۔

”بھابھی! میں نے احتجاج کیا۔“ وہ میرے بھیا ہیں۔ آپ کو کچھ پر اعتماد ہونا چاہیے! ہمارے دل آئینہ ہیں۔ پھر برسوں کا حقیقی رشتہ محلوں میں نہیں بدل سکتا۔“

”میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے پر وہ ان آگے تمہاری مرضی!“ وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔

میں نے بھیا کے لیے پر ایک کونجا مسکراہٹ آگئی۔ میں واقعی بچی تھی۔ میرے رشتے بدل گئے تھے۔ میں اب غیر محرمی۔ نسرین باجی کو اپنی پورٹ پر خدا حافظ کہنے کے بعد میں سیدھی ہوٹل آئی تھی۔ نسرین باجی نے مجھے تسلیاں دی تھیں۔ بھابھی کے روئے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ میں محتاط رہوں اور جب بھی مجھے ان کی ضرورت پڑے تو انہیں لکھ دوں۔

میں ایک ماہ تک گھر نہ گئی تو اُمی خود لاہور آ گئیں۔ وہ اپنی چھوٹی بہن خالہ بشری کے یہاں آ گئیں۔ وہ اپنا کونج کر مجھے بلایا اور جب میں خالہ بشری کے ہاں پہنچی تو اُمی سخت ناراض ہوئیں کہ

میں گھر کیوں نہ آئی؟ میں نے انہیں اپنا نہ سمجھا کیوں نہ کسی چیز کے بارے میں لکھا؟ کیا میرا ان سے کوئی بندھن نہیں رہا؟

میں نے مجبور ہو کر ان سے بھابھی کے بارے میں کہہ دیا اور محذرت چاہی کہ اُمی باپ میں نہ آسکی۔ کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے میرا کر دار متاثر ہو۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں اور پھر سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

”بیٹی! مجھے ہر بات کا احساس ہے۔ اب تم ہوٹل میں نہیں رہو گی۔ میں ہر ماہ تمہیں اخراجات بھیج دیا کرو گی۔ تم بشری کے ہاں آ جاؤ۔ ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ چھوٹی میٹرک میں ہے۔ میں اور تمہارے ابو بھی تم سے میٹنگ آ کر مل لیا کریں گے۔ جب بھی تمہارا دل چاہے تم ہمیں پیغام بھیج دینا۔ میں خود آ کر تمہیں سامنے لے جاؤں گی میں خود بھی نہیں چاہتی کہ تمہاری آبرو پر حرف آئے۔ بہو نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی۔“

”اُمی! آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنا ابو چھاپ خود۔“

”بیٹی! اُمی مضطرب لہجے میں بولیں۔ ”ہمیں ہماری نگاہوں میں اتنا نہ گراؤ۔“ ان کی آواز میں سسک اور تڑپ تھی۔

وہ مجھے تسلیاں دے کر چلی گئیں۔ وہ بھی مجبور تھیں! میں نے خود کو سمجھا یا کہ ان رشتوں کے سہارے کب تک جیوں گی؟ یہ رشتے یہ ناتے معتبر تو نہیں۔ میرا اب کوئی بھی نہیں۔ نہ کوئی گاؤں نہ کوئی رشتہ دار مجھے اپنی راہیں خود تلاش کرنا ہوں گی۔ بھابھی نے میری راہوں میں جو دیوار کھڑی کر دی تھی اسے گرانا ان لوگوں کے بس میں نہ تھا جو میرے والدین تھے میں تو ایک جہلہ محترمہ تھی۔ بھابھی جانے کیوں اچانک بدل گئی تھیں انہوں نے کچھ بھی نہ سوچا کہ بھیا کتنے مخلص محبت اور با کردار ہیں۔

بھابھی ان سے بہت قریب تھیں ان کی جیون ساتھی تھیں پھر بھی انہیں بھیا پر اعتماد نہ تھا۔ بھیا نے کتنے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا تھا کہ میں کچھ محسوس نہ کروں۔ وہ میرے بھائی ہیں۔ پھر بھابھی نے کیوں مجھے ان مشفق ہستیوں سے دور کرنا چاہا جب کہ چار برس سے وہ مجھے دیکھ رہی تھیں اور میرے کردار پر انہیں اعتماد تھا۔ میری حقیقت کھلتے ہی ان کی نظریں بدل گئیں۔

میں نے فی اے فاسل کا امتحان دیا تو بشری خالہ نے مجھے سے کہا کہ میں گاؤں جانا چاہوں تو وہ میرے ہمراہ جانے کو تیار ہیں۔ مگر میں ان سے معذرت کر لی۔ میں ملازمت کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن امی سے اجازت ضروری تھی کہ وہ آخر وہ میری ماں تھیں۔ دو روز بعد ہی بھیا اور بھابھی مجھے لینے آ گئے۔ بھیا خاتے کے میں نے گاؤں کا رخ نہ کیا۔ بھابھی نے بھی گلہ کیا تو میں حیران ہوئی۔ بھابھی نے کہا کہ میں سننے کی پیدائش پر ہی آئی تھی پھر کیوں نہ آئی؟

میں نے امتحان کی تیاری کا بہانہ کیا۔ چھ سال بعد قدرت نے بھابھی کی گود پر کی کی تھی اور میں صرف ایک روز کے لیے جوئی گئی تھی۔ وہ ناراض ہوئیں کہ مجھے سننے سے پیار نہیں اور پھر اصرار کر کے مجھے ساتھ لے گئیں۔

جوئی میں پہنچی تو امی نے بڑھ کر سینے سے لگایا۔ ابو نے دعا میں دیں اور میں سبک بڑی امی نے بھی گلے کیا کہ میں اب اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتی۔ جب ہی امتحان سے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ آئی۔ فضلو باہا بہت خوش تھے۔ وہ تو اکثر مجھ سے ملنے لاہور آتے رہتے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد امی نے مجھ سے کہا کہ میرے لیے اتنی تعلیم ہی کافی ہے۔ وہ میرے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتی ہیں۔ میرے لیے ایک اچھے گھر کے کا رشتہ آیا تھا۔ بھابھی کے بڑے بھیا کے دوست تھے۔ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔

بھابھی امی کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئی تھیں وہ لوگ بھی آئے تھے۔ بھابھی نے ان کی شرافت اور اخلاق کی بڑی تعریف کی تھی۔ امی کو بھی یہ رشتہ پسند آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ چاہتی ہیں مجھے اپنی طرح رخصت کریں۔ انہیں میری خوشیاں عزیز تھیں۔ ان کے بس میں جو کچھ تھا وہ کرنا چاہتی تھیں۔ میری رخصتی کے بعد ہی فرحان کی کہیں نسبت طے کی چنانچہ۔

میں ان سے کیا کہتی وہ لوگ اپنا فرض جو کہ ان پر عائد نہیں ہوتا تھا پورا کرنا چاہتے تھے اور پھر نرسن بھیا نے بھی فی اے تک ہی تعلیم پائی تھی میں بھی ان پر کب تک بوجھ بنی رہتی۔ اس رات کو بڑے کمرے میں سبھی بیٹھے تھے۔ امی ہی نے بات شروع کی اور ابو خاموشی سے سنتے رہے۔

امی جب اپنی رائے دے چکی تو بھیا بولے۔ ”امی! ہمیں اپنے طور پر بھی ان لوگوں کے مطالبے میں حقیقت کر لینا چاہیے تاکہ پروین کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔“

اس پر بھابھی اور امی نے کہا کہ انہیں ان لوگوں پر یقین ہے پھر یہ کہ بھابھی نے خود ان کا خاندان دیکھا تھا۔ اچھے رشتے مشکل سے ملے ہیں۔

ابو نے فیصلہ دے دیا کہ ان کا مطالبہ دے دی جائے کہ اگر شادی کا دن طے کر جائے وہ جلد از جلد اس فرض سے سبک دوش ہونا چاہتے ہیں۔ بھابھی نے دوسرے روز ہی انہیں پیغام بھجوادیا۔ ان کے گھر سے ایک خاتون اور ان کے ہمراہ ان کی ملازمہ ہی آئی تھی۔ باتیں ہوئیں اور شادی کا دن مقرر کر دیا گیا۔

اس خاندان میں یہ شاید پہلی شادی ہوئی، جس میں رسوں کا خیال نہیں کیا گیا تھا۔ بھیا خاتہ گھرا ئی نے انہیں سمجھایا کہ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ ایک ماہ کے بعد میں اس گھر سے رخصت ہو رہی تھی جس میں میرا بچپن گزرا تھا۔ جہاں میں

دوانی ہوئی تھی۔ نرسن بھیا بہت یاد آتی تھیں۔ امی نے دوائی مجھے اپنی طرح رخصت کیا تھا۔ جب میں باہر کھڑی کار میں سوار کرانی جا رہی تھی تو پیچھے سے بھابھی کی آواز سنائی دی۔

”ہم نے بن ماں باپ کی اس بچی کو بھی اپنی نرسن کی طرح ہرجے دی ہے۔“

میں مسکرا دی۔ بھابھی کا دل صاف نہ تھا۔ وہ میرا بھرم رکھ لیں تو ان کا کیا جانا انہوں نے سب مہمانوں کو بتا دیا تھا کہ میں اس خاندان کی بیٹی نہیں ہوں۔ حالانکہ یہ بات تو امی سے واضح تھی کہ میں اس خاندان کی بہو نہیں بنی تھی۔ کسی غیر خاندان میں جا رہی تھی۔ میں نے خود سے کہا۔ حوصلہ رکھو پروین۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ سسرال کی دہلیز پر تمہارا استقبال کیسا ہوتا ہے۔ یہ ابھی دیکھنا ہے کہ یہ بندھن بھابھی ہی سے بٹا جاوے۔ نہ جانے ان کے ترش میں ابھی اور کتنے گھر ہوں۔

میرے اندر بے غلط نہ تھے۔ میں جب سسرال پہنچی تو دو دنے مجھے بچوں نے ان الفاظ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

”ای آ آ تمیں..... امی آ گئیں“ میری ساس نے مجھے پیار کر کے ہونے کہا۔ ”گھر آؤ نہیں بہو۔ اب معصوم بچوں کو متا بھری گود کی ضرورت تھی اور تم بھی بن ماں باپ کی بچی ہو۔ تم انہیں ضرور پیار اور ممتا دو گی کہ کم نے خود محرومیوں کا یہ دور دیکھا ہے۔“

میں سوچ رہی تھی کہ یہ تھا بھائی کا بندھن؟ انتخاب مجھے غیریت کے احساس کے ساتھ تو رخصت کیا گیا تھا میری آغوش میں دو معصوم بچے بھی دے دیے تھے۔ انہوں نے میری سسرال والوں کو بتا دیا تھا کہ میں لے پا لگ ہوں۔ دہن کے حسین سینے تو سسرال کی دہلیز پر ہی بکھر گئے تھے اور مجھے ان رخ حقائق سے سمجھوتا کرنا تھا۔ جنہیں میں جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ میں ہر چیخ قبول کرنے کا حوصلہ لے کر آئی تھی۔ میں آنسو بہا کر یا فریدی بن کر ان زنجیروں کو

نہیں کاٹ سکتی تھی۔ جو بھابھی نے مجھے پہنائی تھی۔ مجھے ان حالات سے خواہ کرنا تھا۔ میرے والدین کو بڑھ نہی کہ بھابھی نے انہیں اندھیرے میں رکھا ہوگا۔ ان کے ترش میں بڑے تیرتے اور مجھے صرف حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا تھا۔ میں نے تو ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کوئی دکھ نہیں دیا تھا۔

پھر دو لہا میاں سے بڑی شان دار ملاقات ہوئی۔ وہ جب جلد عروسی میں شریف لائے تو آتے ہی بھیر کی تہیہ کے بولے۔ ”تو تم اپنے گھر والوں پر بوجھ تھیں۔ یا انہیں بہتر رشتہ نہیں مل رہا تھا یا یوں سمجھو کہ وہ تم سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔“

میں سر جھکے بیٹھی تھی اور ان کی باتوں پر حیران ہی تھی۔

وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے۔ ”اب تم اس گھر کی بہو بن کر آئی تھی ہو تو سنو میرے معصوم بچوں کی پرورش تعلیم تربیت اور میرے والدین کی خدمت کے فرائض میں کوئی تاہی نہیں کرنا ہوگی۔ مجھے شادی کا کوئی شوق نہ تھا کہ مجھے اپنی مرحوم بہوی سے بے پناہ محبت سے اور اس کی وفات کے بعد ہی اور لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکا۔ یہ میرے والدین کی خواہش تھی جسے میں نے پورا کر دیا۔“

ایک ایک لفظ حیر کی طرح میرے دل میں پیوست ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے یوں مخاطب تھے جیسے اپنی کسی ملازمہ کو ہدایات دے رہے ہوں۔ ”تمہیں میرے کسی فعل پر عتہ پہنچی کا حق نہیں میں تمہاری جانب سے یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ تم اپنے فرائض نبھاؤ گی۔“

میں نے نگاہ اٹھا کر ان کی جانب دیکھا وہ واقعی اپنی تصویر کی طرح تھے جو بھابھی نے مجھے دکھائی تھی۔ بارعب اور تجیدہ لیکن ان کی باتوں سے میں کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے بوٹ کی نوہ

سے ملتے ہوئے بولے۔

”امید ہے کہ تم بہتر طور پر سوچو گی۔ اب سو جاؤ!“ اور وہ گھوم کر کمرے سے نکل گئے۔

میں نے اپنی تقدیر پر افسوس بھائی، نہ ان سے کچھ
کہہ سکی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کاشب عروسی ایسی
ہوتی ہے؟ آنسوؤں پر مجھے اختیار دے رہا تو میں نے سر
تک پریکھ دیا۔ مجھے نہ تقدیر سے لگے تھا نہ اپنوں سے
شکایت تھی جب یہی مقوم تھا پھر کیا کرنی؟ کہاں
جانی راہیں تو کھوئی ہیں۔ رسول کی زنجیریں ہی تو ڈٹا
ہوئیں تو پھر اپنی بیچن کی محبت کو کھوکھلی پہنچتی
کیوں! جب یہی حقیقت تھی تو پھر اس سے انحراف
کر کے رسوائی کے سوا کیا ملا۔ اب یہ بندھن تو نبھانا
ہی تھا۔

میں نے اپنے فرائض سنیا لے لیے تھے۔ کہ اس
گھر کی پرانے نام ہو چکی۔ میں تو آیا اور کوئی ابن
کر آئی تھی۔ میں نے ہلاکت کو قبول کر لیا تھا۔ ان
بچوں کا کیا قصور تھا کہ میں انہیں ہدف انتقام بنائی۔
ڈیڑھ برس کیسے گزرا۔ میں ہی جانتی ہوں شوہر کی
بے اعتنائی۔ ساس کی طنز یہ باتیں مٹکی خواہش کے
زہریلے تھمرے سن کر کبھی میں نے زبان نہ کھولی
کہ اس سے کیا ل جاتا میں اپنے فرائض نبھاتی رہی۔
ای کے پیغام آئے لیکن میں ان سے ملنے نہ
گئی۔ میں نے تو دور رہتے ہی بھلا دیئے تھے۔ اپنی خود
دستی میں نہ بھیا بھا گیا آئے کیوں؟ میں جانتی تھی کہ
عامی نے ان سے کیا کہا ہوگا۔ اور ساس نے مجھ پر
لڑی یا پندیاں لگا دی تھیں میں محلے یا رشتے واردوں
سے کسی خاتون یا لڑکی سے علیحدگی میں کوئی بات
کر سکتی تھی۔ شوہر کا رویہ ایسا تھا جیسے گھر کی ملازمہ
کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ عشاء کے بعد ہی گھر
آتے اور صبح ناشتا کرنے کے بعد چلے جاتے۔ ان
کو بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈیڑھ سال میں ایک دو
صرف اتنا کہا کہ میں نے ان باتوں پر عمل کر کے
نئی دیا تو قبول نہ کی تھیں۔

(174)

تو میرے شوہر نے مجھ سے کہا۔ یاد تیار ہو جاؤ!
احسان فراموش نہ ہو، آخر انہوں نے تمہیں والدین کا
پیار اور شفقت دی ہے۔“

سلسلہ کے لیے مصر ہوئیں مگر
میرے شوہر نے انہیں منع کر دیا۔
جب میں قسطنطنیہ کے ساتھ بیرونی دروازے کی
جانب بڑھی تو ہمارے ساتھ ہی وہ باہر تک آئے اور
مجھ سے کہا۔

”جلدی آنے کی سہی کرنا۔ بچوں کو کون سنبھالے گا کہ تم سے مانوس ہو گئے ہیں۔“

میں جب حویلی پہنچی تو بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے ان آنسوؤں کو بہہ دیا۔ فضلہ بابا نے مجھ سے سارے راستے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔

انا۔ انا تھا کہ کمرہ تو چلو۔

کھر میں داخل ہوئے عیسیٰ میری نگاہوں پر پڑی
برآمدے میں کھڑی تھیں۔ میں بڑھ کر ان کے
ہنسنے سے لگی گئی۔ انہوں نے مجھے پہنچ لیا اور پھر مجھے
تھلے لے اندر دیوڑھی کے جانب بڑھیں۔ ہم بڑے
رے میں آئے تو یہاں مجھے ابھار بھائی جی
۔ ابھار نے اٹھ کر مجھے پیار کیا۔ مجھے ابھار جی کو
نے ہاتھ کے اشارے سے منہ کر دیا۔ میں حیران
کہ ماجرا کیا ہے؟ مجھے ابھار جی کی اطلاع ملی
اور ابھار جی نے فضل کو قابل تدرست مجھے صرف ان کے
پر کھری خریدی تھی۔

میں امی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تو بھینا نے چپٹ لہجے میں کہا۔
 ”تم نے ہمیں فیئر سمجھا پروین کہ برسوں کے بندھن توڑ دیے اور ہمیں چمکے نہ بتایا۔“
 میں چپ چپھی کہ ابو نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہمیں افسوس ہے بیٹی کہ ہم نے دہلین پر
بھروسہ کیا اور ان لوگوں کے بارے میں کوئی تحقیق نہ
کی۔ ہم نے تمہیں خوشیاں دینے کی بجائے دکھوں

مارچ 2015ء

کے جہنم میں دھکیل دیا۔“

پھر بھائیوں نے ”تم نے ایک بار بھی آنے کی رحمت گوارا نہ کی۔ کیا تم نے ہمیں اس قابل نہ سمجھا کہ ہم اس انصافی کا کوئی حل سوچ سکتے اور اب ہم نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ تم وہاں نہیں جاؤں گی“ اور.....

”نہیں بھیا نہیں“ میں نے مضطرب انداز میں کہا۔

”کوئی فیصلہ نہ کیجئے..... میں اپنے گھر میں خوش ہوں، یہی بات انہوں نے چھپائی کسی گھر ان کے دو معصوم بچے ہیں۔ بچا بھی بے تصور ہیں۔ انہیں بھی شاید دھوکے میں رکھا گیا تھا، ورنہ وہ میرا رشتہ وہاں طے نہ کراتیں۔“

مصور دولہا بھائی نے بی بی کے مریض ہیں۔
بات کی جھوٹ چاکر تم اس گھر کی بو نہیں بلکہ آیا اور
نور کو رانی ہو، بیچانے کے دلچے میں کہا۔ ”ہمیں دکھا اس
بات کا ہے کہ ہماری شریک زندگی نے تمہیں اس چہرہ
میں دھالتے ہوئے خوف خدا نہ کیا۔“

”آپ سے کس نے کہا بھیا کہ وہ نی بے ک
مریض ہیں؟ میں بھابھی کو الزام نہیں دیتی؟“
”تو تم زندگی بھر کلتے رہنے کا فیصلہ کر چکی ہو
جی اور ہمیں بھی یہ سزا بھگتنا ہوگی۔“ ابو نے دکھ بھرے
لہجے میں کہا۔

کمرے میں چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر بھابھی نے مجھ سے کہا۔

”مجھے معاف کر دو پروین! میں بچ نہیں ہوں
کہ مجھے ان باتوں کا علم نہ تھا۔ ورنہ تم سے میری کوئی
دشمنی تو نہ تھی۔ تم اب وہاں نہیں جاؤ گی۔ میں خود ان
سے.....“

”نہیں بھابھی!“ میں نے ان کی بات کاٹنے
 ہوئے کہا۔

”آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ یہی نوشتہ تقدیر ہے۔“

مارچ 2015ء

ہے۔“ ابو نے مجھے خاموش کر دیا۔

پھر اور اور بھیا کھر رہے تھے۔ اسی نے ان کو یقین دلایا کہ بات نہیں کی تھی۔ بھابی نے اسی کو یقین دلایا کہ انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگیں کہ بھیا ان سے سخت خفا ہیں اور انہوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔ حالات ایسی صورت اختیار کر گئے تھے اور میں نہیں جانتی تھی کہ میری وجہ سے اس خاندان میں الجھنیں جنم لیں۔ بھابی امی کے حقیقی بھائی کی بیٹی میں اور میری بی بی تھیں۔ بہن بھائی میں نفرت کی دیوار کھڑی ہو جاتی اور خاندان کا سکون غارت ہو جاتا۔ میں نے امی سے التجا کی کہ وہ بھیا کو سمجھا دیں جو کچھ ہوا تھا ہو گیا۔ اب میرا وہی کھر ہے اگر بات بڑھتی تو ایک جانب بھابی کے والدین سے تعلق ختم ہو جائے گا دوسری جانب بھابی کے والدین سے تعلق ختم ہو جائے گا دوسری جانب میری سسرال سے جھگڑا ہوگا۔ میں نہیں جانتی کہ ایسے حالات پیدا ہوں۔

ای نئے مجھے بتایا کہ وہ کن مسائل میں الجھ رہی ہیں، ادھر خاندان میں کوئی لڑکی ایسی نہیں جس سے فرحان کی شادی ہووے گی ان پڑھ لڑکی سے شادی کرنے کو تیار نہیں۔ نرسن کے غلط بتاتے ہیں کہ وہ کبھی سکمی نہیں میرا کچھ بھی کم نہیں اور ان حالات میں مجھے بہت اہم فیصلے کرنا ہیں اور بڑی جرات و استقلال کے ساتھ حالات کی ان تھیلوں کو سلجھانا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی کوئی بات نہ کرو کہ تمہارے ابو اور بھتیجہ بہت براہم ہیں۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ پلٹ کر میکے کا رخ نہ کرنے کے سبب میرے والدین نے اپنے طور پر تمام معلومات حاصل کی تھیں اس کے بعد ہی مجھے وہاں سے بلوایا تھا۔

پھر اچانک مجھے شوہر کی بیماری کی اطلاع ملی۔
انہیں لاہور لے آیا گیا تھا۔ میں بھیا کے ساتھ
ہسپتال پہنچی تو میرے سر اور بچے باہر لان میں بیٹھے
تھے۔ سانس کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں
ملی تھی۔ بھیا اکثر سے ملنے چلے گئے، تھوڑی دیر بعد

(175)

انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ میرے شوہر کی حالت نازک ہے۔ انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا ہے اور صرف ایک آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میری ساس کو گھر بھیج دیں۔ میں یہاں رہوں گی، بھیا خاموشی سے چلے گئے۔

تین دن رات آنکھوں میں کٹ گئے تھے۔ میری ساس بھی سخت بیمار تھیں۔ وہ واپس چلی گئیں اور میں ان کے کمرے میں رہ گئی۔ رات گئے انہیں ہوش آیا تو میں ان کے بستر کے قریب آئی۔ سسر باہر چلی گئی۔ انہوں نے میری جانب دیکھا اور مجھے پیٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے بڑی نجف آواز میں بولے۔

”میں یاد م ہوں پر دین کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا لیکن میں بے تصور ہوں میں شادی پر رضامند نہ تھا۔ یہ امی کی ضد تھی کہ وہ بچوں کے لیے مال لائیں گی۔ میں نے یہ شرط رکھی تھی کہ میں کسی بے سہارا اور بیوہ گورت سے شادی کروں گا۔ تمہاری بھابی نے جب رشتہ طے کیا تو مجھے کچھ نہ بتایا۔ امی بھی چپ رہیں۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکے اور پھر ٹھہر کر بولے۔ ”تمہیں بیاہ کر لایا تو میری کزن نے مجھے حقیقت بتادی اور مجھے دھوکا دیا۔ اسی بنا پر میں نے تم سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ تم مجھ سے نفرت کرو اور میں مناسب موقع دیکھ کر تم سے علیحدگی اختیار کروں، لیکن چند ہی دنوں میں بچے تم سے اتنے مانوس ہو گئے کہ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اور پھر تم نے بھی حالات سے غیر متوقع طور پر بھجھوتا کر لیا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہے اور پھر گویا ہوئے۔

”شادی کے دو ہفتے بعد اچانک میں لاہور آیا اور ڈاکٹر فرحان سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے میرے گھر سے مراسم تو نہ تھے لیکن ہم اکٹھے رہتے رہتے میرے سینے میں درد تھا۔ میں ان سے اسی لیے ملنے آیا تھا۔ انہوں نے جب میرا ایکسرے لیا تو مجھے کسی

اسپیشلسٹ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اور انہی کے ذریعے میں نے اپنا فعلی معائنہ کروایا اور یہ نتیجہ سامنے آئی کہ مجھے ٹی بی ہے۔“ وہ چند لمحے پھر رک کر سانس درست کر لے گئے۔ میں نے انہیں باتیں کرنے سے منع کیا۔ کمرہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے۔

”میرا مرض لاعلاج نہ تھا۔ لیکن میں نے اپنے معالج سے تعاون نہ کیا اور پہلے سے زیادہ مگر بٹ ٹوٹی شروع کر دی۔ دو ماہ قبل ڈاکٹر فرحان نے میرا پھر معائنہ کیا اور مجھے مشورہ دیا کہ میں سینٹی ٹوریم میں داخل ہو جاؤں مگر میں نے کوئی پروا نہ کی۔ اب میرا وقت قریب آ گیا ہے۔ میں نے وصیت تیار کر وادی ہے۔ تم آزاد ہو پرین، لیکن.....“ ان پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ کچھ دیر کھانسنے کے بعد وہ رک رک کر بولے۔

”میری درخواست اور التجا یہ کہ ان بچوں کو خود سے جدا نہ کرنا کہ وادی انہیں بچاؤ میں رکھ لے گی اور میرے والد نے امی سے اس مقصد کے لیے شادی کی تھی کہ وہ ان کی دولت پر قابض ہو سکیں۔ جائیداد کے مالک بنیں لیکن میری امی نے تمام جائیداد میرے نام ہی کر دی تھی۔ میں اس وقت دس سال کا تھا۔ میرے چچا کو کچھ ان مقرر کیا گیا تھا۔“ ان کا سانس اکٹھرنے لگا تھا۔ وہ ستانے کے بعد پھر گویا ہوئے۔

”تم میری نصف جائیداد کی حقدار ہو اور نصف میں نے دونوں بچوں کے نام کر دی ہے۔ امی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں نے کوئی شرط عائد نہیں کی۔ صرف تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ میرے بچے.....“ ان کا سانس اکٹھ گیا۔

وہ بے درپے خون تھوکنے لگے۔ میں تڑپ کر اٹھی، سسر کو آواز دی۔ اس نے آ کر دیکھا تو پلٹ کر ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔ وہ کافی خون تھوکنے کے بعد بے دم سے ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی سسر دو ڈاکٹروں کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ان میں

ایک فرحان تھے۔ انہوں نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مسنر خیر! آپ باہر تشریف لے جائیں۔“ میں دروازے کی جانب بڑھی۔ ایک لہجہ رکی تو میری جج نکلی گئی۔ دوسرے ڈاکٹر نے آخری کلمات ادا کر کے میرے شوہر کا جسم سفید چادر سے ڈھاپ دیا تھا۔ فرحان سر جھکا کرے سے باہر نکل گئے۔ شوہر کی وفات کے بعد ساس بھی چند روز بیمار رہ کر چل بسیں۔ ان پر دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

میرے چچا سرنے مرحوم شوہر کی وصیت کے مطابق عمل کیا تھا اور میرے سر خود ہی اپنے پرانے مکان میں چلے گئے تھے۔ چند ماہ میں وہیں رہی اور پھر چچا سسر کوڑ میں اور جائیداد کا ٹکراں مقرر کر کے بچوں کے ہمراہ لاہور آ گئی۔ امی نے فضلہ بابا کو میرے پاس ہی چھوڑ دیا تھا۔ فضلہ بابا نے ہی لاہور میں سکونت کا انتظام کیا تھا۔ انہی دنوں نسرین باجی بھی ایس آئیں۔ امی مجھے بتا گئیں کہ فرحان کے والد اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ فرحان کی شادی مجھ سے کر دی جائے اور ابو بھی یہی چاہتے ہیں۔ خاندان میں فرحان کے معیار کی کوئی لڑکی نہ مل سکی تھی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ لوگ خاندانی اصولوں کا کتنا پرچار کرتے ہیں۔ پہلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ اب صاحب جائیداد تو خاندانی اصولوں میں کلک پیدا ہو گئی تھی۔ نسرین باجی کی آمد کے بعد میں ان سے ملنے کی تو بھی پریشان تھے۔ میں حیران تھی کہ بجیا کی آمد کی خوشی کی بجائے یہ پریشانی پھیلی اور پھر بھابی نے ہی بتایا کہ نسرین بجا کو طلاق ہو گئی ہے۔ شوہر سے نہایت نہیں ہو سکا تھا اس نے طلاق نامہ ہاتھ میں دے کر وطن ہجودیا تھا۔ یہ خبر بجلی بن کر مجھ پر گری اور میں کم مسمی رہ گئی۔

اسی روز تائی امی اور تائی ابو ملنے آئے تو بڑے کمرے میں بزرگوں کا اجلاس ہوا جس میں بھابی نسرین بجا اور مجھے شریک نہیں کیا گیا تھا۔ ایک گھنٹے

تک اجلاس جاری رہا اور پھر تائی امی اور تائی ابو دایں چلے گئے تو امی نے مجھ بھابی کو بلایا اور ان سے باتیں کیں۔ مجھے کچھ علم نہ تھا بھابی چپ چپ تھے۔ دوسرے روز جب میں واپس آ رہی تھی امی نے اتنا کہا کہ فرحان کے والد نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ میں نے کوئی سوال نہ کیا اور لاہور واپس آ گئی۔ تین دن نہیں گزرے تھے کہ نسرین بجا گھر لائی ہوئی آئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ تائی ابو نے فرحان کے کے لیے انہیں منتخب کیا ہے۔ فرحان مجھے سے اکٹھ گئے ہیں۔ تائی ابو نے انہیں حاق کرنے کی دھمکی دے دی ہے اور فرحان نے گھر چھوڑ دینے کی۔ امی سخت پریشان تھیں اور تائی ابو کو سمجھانے کی سعی کر رہی تھی۔

نسرین باجی نے مجھ سے کہا کہ میں فرحان سے شادی کر لوں۔ ایک تو عمروں میں فرق ہے۔ دوسرے وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ گھر والوں نے خود ہی یہ فیصلہ کیا تھا اور اب اپنا فیصلہ بدل دیا تھا۔ انہوں نے مجھے تنبیہ کی کہ میں کوئی بات نہ کروں۔ بھیا اور ابو تائی ابو کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنا فیصلہ نہ بدلیں۔

نسرین بجا تو واپس چلی گئیں لیکن میں ابھن میں پڑ گئی۔ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے جو خود فیصلے کرتے اور خود ہی ان پر عمل نہ کرتے۔ ان کی روایات رنجیں اور اصول ایسے ہی تھے۔ فرحان کے والد کو اب خیال آیا تھا کہ خاندان کی ایک لڑکی مطلقہ ہو گئی ہے اور اس کے معیار کا کوئی لڑکا بھی قریبی رشتہ داروں میں نہیں تو بیٹے کو پرانی کا بکرا بنا دینا چاہیے۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا لیکن میرے لیے ابھن یہ تھی کہ فرحان ایک بار پھر اکٹھ گئے تھے اور اسے میری رسوائی کا امکان تھا۔

بجیا کے شوہر نے انہیں اس بنا طلاق دے دی تھی کہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اور وہ ان کے معیار کا ساتھ بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ معیار کے پتانے میری کچھ میں نہیں آ سکتے تھے۔ میں نسرین بجا

کے دکھوں کو سمیٹ لیتا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے کبھی نہیں کہ میں دخل نہ دوں مگر مجھے ایک بار پھر فرحان سے ملنا تھا۔

میں نے فرحان کو اسپتال فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ رخصت پر ہیں۔ میں فضلو بابا کے ہمراہ گاؤں پہنچی۔ اپنی حویلی میں جانے کی بجائے میں فرحان کے گھر ہی۔ وہاں ای ابو بیچا۔ فرحان کے والدین اور فرحان خود موجود تھے۔

میں نے کمرے میں قدم رکھا تو ای نے پوچھا ”خیر تہ تو ہے پروین؟“ وہ مہربان تھی۔

میں ان سے مخاطب ہوئی۔ ”معذرت چاہتی ہوں امی کہ میں آج ڈاکٹر فرحان سے کچھ کہنے آئی ہوں۔“ پھر میں نے فرحان سے کہا۔

”ڈاکٹر فرحان! میں نے جب ایک بار آپ سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آپ سے نفرت ہے تو پھر آپ کیوں مجھے رسوا کر رہے ہیں۔ میں آج آپ سے آخری بار یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے رسوا کرنے کی سعی نہ کریں۔ میں ایک بیوہ ہوں اور دو معصوم بچوں کی خاطر میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ایسی حرکت نہ کریں۔“ میں اتنا کہہ کر کمرے سے نکل آئی۔ امی نے مجھے آواز بھی دی لیکن میں ٹھہری نہیں۔ فضلو بابا کے ساتھ واپس آ گئی۔

میں نے سب کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے تھے۔ میں بڑی جرات کے ساتھ ان کی موجودگی میں فرحان سے مخاطب ہوئی تھی اور مجھے خود بھی اپنی جرات پر حیرت تھی۔ میں نے بھی ابو کے سامنے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔

اسی روز شام کو امی اور بھیا آ گئے اور امی مجھ پر سخت ناراض ہوئیں کہ میں کیوں وہاں گئی؟ وہ لوگ تو تاپا ابو کو بھانے اور کوئی فیصلہ کرنے نہ جت ہوئے تھے۔ اور تاپا ابو کو قائل کرنے کے لیے ابو نے آخر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرین بیچا کے لیے فرحان کا رشتہ منظور کرنے سے انکار کر دیں گے لیکن میں نے بتا دیا کہ میں بگاڑ دیا۔

بھیا نے مجھے بے تیز اور بے لگام کے خطابات سے نوازا حالانکہ انہوں نے پہلے بھی مجھے اس انداز میں کچھ نہیں کہا تھا۔

میں نے ان سے ایک ہی بات کہی کہ میں فرحان سے شادی نہیں کر سکتی۔ کہ یہ میری آن کا بھی سوال ہے جب میں پہلے ان کے خاندان کی بیوی نہیں بن سکتی تھی تو آج میرے خون نہیں بدل گیا۔ میں وہی پروین ہوں۔

امی میرے جواب پر گم صدمہ گئیں اور بھیا پاؤں پیٹتے ہوئے چلے گئے۔ امی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے انہیں ٹھہراتا پایا تو انہوں نے خاموش لگا ہوں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہے بغیر بھیا کے پیچھے چلی گئیں۔ بھیا اپنی کار میں بیٹھے امی ہی کے منتظر تھے۔

پھر دو روز کے بعد سرین بیچا اور بھیا بھی آئیں۔ بھالی نے بتایا کہ فرحان نے شادی کرنے ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی لڑکی سے بھی بیاہ نہیں کرنا۔ ساری زندگی خدمت میں گزار دیں گے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”کسی مزار کی عبادی کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”مذاق کی بات نہیں پروین۔ وہ سب سے تعلق توڑ آئے ہیں اور تاپا ابو خود مجھے میں ہیں۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ میں باپ بیٹے میں نہیں نہ جائے اور تاپا ابو کوئی۔“

”چھوڑ دینے بھابی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ مطمئن رہیں فرحان شادی کریں گے۔“ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

”تم اب کیا کرو گی پروین جب کہ تم نے سب کے سامنے اس سے کہہ دیا ہے کہ میں اس سے نفرت ہے اور پھر اب تم اس سے کیسے نفرت کر سکتی ہو۔ یہ بچپن کا ساتھ ہے۔ میری ماں تو تم فرحان سے شادی کر لو تاپا ابو دیکھتے رہ جائیں گے۔“ سرین باجی نے کہا۔

میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں بھی اپنا فیصلہ بدل دوں گی تو یہ غلط ہے بچیا! میں فرحان کو اپنا فیصلہ بدلے پر مجبور کر دوں گی۔“

سرین بیچا مصرعیں کہ میں ضد چھوڑ دوں۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں فرحان کی خدمت کر دوں گی۔ سرین بیچا نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ فرحان سے شادی نہیں کریں گی، خواہ انہیں بزرگوں کے سامنے انکار کرنا پڑے۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں گی۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ یہ بات نہ کہیں اور عمروں کے فرق کو سمجھا دیں۔ میں ان کے لیے کوئی ایثار نہیں کر رہی۔ میں تو ان بچوں کا مستقبل ستوارنا جانتی ہوں کہ ان کے مرحوم باپ نے مجھ سے یہ اتنا کی بھی۔ بھابی نے کوئی بات نہ کی۔ سرین باجی نے مجھے قائل نہ کر سکیں۔ بھابی کے رویے پر مجھے حیرت تھی۔

وہ رات کو بھائی خالہ کے ہاں رہیں اور دوسرے روز واپس چلے گئے۔

میں نے فون اٹھایا۔ اسپتال کے نمبر ڈائل کیے تو ایک لمحے کے لیے میں خود بھرا کر کی اگر فرحان نے بات کرنے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟ مگر میں نے ہمت کر کے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ فرحان فون پر آئے تو میں نے انہیں گھر آنے کو کہا۔

وہ بولے ”اب کیا رہ گیا ہے بیگم خیر!“ ان کے طرز پر انداز کو میں نے محسوس نہ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ ”مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ آپ چند لمحوں کے لیے تشریف لے آئیں۔“

انہوں نے کچھ کہے بغیر ریسور رکھ دیا تو میں مایوس ہو گئی۔ مگر مجھے ان کی خاموشی نے یقین دلادیا تھا کہ وہ ضرور آئیں گے اور دوسرے روز دوپہر سے قتل وہ آ گئے۔

وہ جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو میں احترازا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر سر دھجے میں

بولے۔

”اب کیا کہنا ہے بیگم خیر؟“

میں خاموش لگا ہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ بڑے ہی دھبی لکھے میں بولے۔ ”جب تمہیں مجھ سے نفرت ہے تو پھر کس لیے بلایا ہے؟“

ان کے لہجے کی کب آواز کے سوز اور دل کے انداز نے مجھے تڑپا دیا۔ لیکن میں پروین تھی۔ وہ پروین جس نے خود ہی اپنے پرکاش دینے تھے پرواز کی تمنا کھودی تھی۔ محبت کو قربان کر دیا تھا۔ جس میں بہتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ تھا۔ اس کا چرچا نہیں کیا تھا۔ میں مٹ گئی تھی لیکن محبت نہیں مٹی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تشریف تو رکھے ڈاکٹر فرحان!“ وہ بیٹھ گئے تو میں نے بھی ان کے سامنے بیٹھے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”آپ کو پروین سے محبت ہے فرحان؟“

”یہ آپ پوچھ رہی ہوں!“ وہ حیران لگا ہوں سے مجھ دیکھتے ہوئے بولے۔

”میں آپ سے رسوائی کی نہیں ایثار کی خواہاں ہوں۔ کیا آپ اپنی چاہت کے لیے کچھ ٹار کر سکتے ہیں؟“

”میں نے اپنی جائیداد سے بھی محروم ہونا گوارا کر لیا ہے اور۔“

”بس ڈاکٹر فرحان!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر یہ قربانی نہیں۔ بغاوت ہے رسوائی ہے لوگ تو بہت کچھ ٹار کر دیتے ہیں۔ میں تو آپ سے کچھ اور چاہتی ہوں۔“

انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تمہیں شاید بچوں کے مستقبل کا اندیشہ ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ۔“

”نہیں ڈاکٹر فرحان! مجھے ان کے مستقبل کی ضمانت نہیں۔ کچھ اور چاہیے جو مانگوں گی دیں گے آپ؟“

ہمارے مگر مشتاق نای لڑکے سے بہت ہزار
تھے۔ مشتاق کا کمال یہ تھا کہ اسے جو بھی مضمون لکھنے کو
کہتے۔ اس میں کبھی نہ کبھی سے ”میرا بہترین دوست“
ضرور رکھ دیتا تھا۔ کیونکہ یہ وہ واحد مضمون تھا جو اس کو
فر فر یاد تھا (اگر کہا جاتا کہ ریلوے انجین پر مضمون لکھو تو
وہ کہیں کھتے کہ میں اور میرے ماں باپ بچنے کی
میاں جانے کے لیے ریلوے انجین تھے۔ وہاں گاڑی
ٹھہری اور گاڑی میں میرا بہترین دوست زاد حسین
بیٹھا تھا۔ زاد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن
بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاد
حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔“

اگر اسے "میر استاد" مضمون لکھنے کو کہتے تو وہ کہتے
کہ ماسٹر افتخار میرے پسندیدہ استاد ہیں۔ ایک روز میں
ان کے گھر گیا۔ وہاں میرا بہترین دوست زاہد حسین بیٹھا
تھا۔ زاہد حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی
ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زاہد حسین
بہت اچھا لڑکا ہے۔

ظاہر ہے جب کرکٹ میچ یا چٹک کی باری آتی تو وہاں بھی زاہد حسین موجود ہوتا۔ تنگ آکر ماسٹر صاحب نے کہا کہ دیکھو یہ تو بھئی نہیں سکتا کہ جہ جگہ تھوڑا دوسرے زاہد حسین موجود ہو۔ آج تم ہوائی جہاز پر مضمون لکھو اور یاد رکھو کہ ہوائی جہاز میں زاہد حسین موجود نہیں ہے۔

دوسرے دن شامی نے جو حسن لکھا وہ دیکھ کر اس طرح سے تھا۔ ”میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایئر پورٹ گیا۔ وہاں جہاز کڑا تھا۔ جہاز کے دو پرے اس میں ہم بیٹھ گئے۔ جہاز میں زام حسین میں تھا پھر جہاز نے لگا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے دیکھا کہ تو زمین پر میرا بہترین دوست زام حسین جا رہا تھا۔ زام حسین میرا کلاس فیلو ہے۔ اس کے تین بہن بھائی ہیں۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں آفیسر ہے۔ زام حسین بہت اچھا لڑکا ہے۔“

ماسٹر صاحب نے مضمون پڑھ کر مولا بخش اٹھالیا اور مشتاق غریب کا جلوس نکال دیا۔

خط کہاں سے آیا ہے؟

میں نے خط کھولا تو میری نگاہیں تحریر پر جم گئیں
مخاطب میں ہی تھی۔ یہ خط فرحان لکھا تھا۔

”ہر امن زیست میں کتنے ہی پند گنگی ہو۔“
احساس کا کواڑ تمہارے ہی ہاتھ میں ہے، جسبی توشت
پر لیکریں ہیں۔ رد کی ٹینیں اُختی ہیں تو ترپ بھی
پہیں سکتے۔ ذہن الجھ جاتا ہے حالات کے ٹھاننے
سوال کرتے ہیں تو گنگ ہو جاتا ہوں۔ میرے مے پر
ایک بوجھ سا ہے۔ میری خطا یہی تھی کہ میں نے
رسوں کی زنجیریں توڑنے کی سعی کی تھی۔ تم نے مجھے
دستی آگ میں جھونک دیا تو کیا جاہت کا یہ قصا نہ تھا
کہ تم میں سے اُتھا کر تا کہ اس آگ سے دور ہو
جاؤ اپنے چہرے کو چھپا لو کہ اس آگ کی تپش سے
جھلک جائے تم مجھے اس لاد میں جلا ہوا چھوڑ
کہہ دیا۔ اس لاد میں جھونک دیا۔ تم کو تو اتنا فخر

بھی پیچھے چھوڑ کر نہیں چلی گئیں۔ میرے دامن میں تو تمہاری ہی خیمہ ہے پھر میرے فرار کا معنی چلنے پون تو نہیں رہتا، کیا ایسا رک منزل اتنی مختص نہیں کہ تم جہد بولیں قیاس مخری کے احساس اور چاہت کے زخموں سے کھرا کر گئیں؟ لوگ بول تو نہیں دیتے کہ حالات کو شکست دے دیں مگر جراثیم پھو دیں۔ مجھے تمہاری جستجو نہیں کہ میں نے تو ان درپوں کو بند کر دیا ہے جن سے تمہاری کوئی بھی

جھلک دھلائی دے کسی ہے۔ ضرورت کو ان
بچوں کو ہے جنہوں نے تمہاری کوکھ سے جنم لیا
مگر تم نے انہیں مستاجر بنی آغوش دی تھی۔ تو تمہارا
فرض تھا ایسا فرض جس پر تم نے بچپن کی محبت انہوں
چاہت، جذباتیت کے بشری تھانے اور زندگی
خوشحال بنا کر دی۔ پھر تم انہیں چھوڑ کر کیوں
کنکریں؟ شاید تم کھرا کھیں یا تمہیں خوف تھا کہ
تمہارے اندر کی عورت تمہیں احساس کے شعلوں
میں نہ دھکیل دے تمہارے کردار کے آئینے کو پاؤں
پاش نہ کر دے تمہیں فرض کا بھی احساس نہ رہا اور
نے وہ زنجیر جس بھی کا شادیں جنہیں بھی فرض سمجھ کر

چند روز بعد ہی فرحان اور سرین جیسا کہ ناکار
بڑی سادگی کے ساتھ بڑھادیا گیا۔ صرف چند قریبی
شے دار مدعو تھے میں خود اس شادی میں شرکت
کر گئی۔ مجھے اسی کا پیغام مل گیا تھا کہ فرحان نے
شرط رکھی ہے کہ پر وین سے اب ہمارا کوئی رشتہ نہیں
اور ہمارے خاندان کا کوئی فرد اس سے نہیں ملے گا۔
میں نے لاہور سے باہر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔
بچوں کی تعلیم کی بنا پر میں فی الحال انہیں ساتھ نہیں
لے جا سکتی تھی۔ میں نے گھر کا تمام انتظام فضلہ بابا
کے سپرد کر دیا تھا اور صرف انہی کو بتایا تھا کہ
کیاں جا رہی ہوں۔ بچوں سے صرف اتنی بات کہی
تھی کہ میں چند دنوں کے لیے جا رہی ہوں جلد لوٹ
آؤں گی۔ گھر کی پرانی ملازم میری ساس کی خدمت
بھی کرتی رہی تھی اس سے میں نے کہا کہ وہ بچوں کا
خاص خیال رکھے۔

میں نے اپنی منزل کا پتہ کسی کو نہیں بتایا تھا۔ میں اپنے چچا سر کے ہاں آگئی تھی۔ مجھے جہاں کام بھی سرانجام دینا تھا۔ اس گاؤں میں جہاں میرے مرحوم شوہر کی زمین تھی ایک اسکول کی بنیاد رکھنا تھی۔ کئی وفات سے قبل وہ اسکول کا نقشہ پاس کروا چکے تھے۔ صرف تیسرے کام باقی تھا۔

میں ان سے کچھ عرصہ دور رہنا چاہتی تھی جن سے میرا ہر بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ میری مصروفیت طول پکڑ گئی۔

مجھے یہاں آئے جو ماہر گدے سے چھپا کر
بچوں کی خیریت دریافت کر آئے تھے اور چھپل بابا کو
اخراجات کے لیے رقم بھی دے نہیں دیتے تھے۔ میں
ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے بارے میں انہیں نہ
بتائیں کہ اس طرح میں اپنا کام مکمل نہ کر سکوں گی۔
وہ بھی میرے دکھوں سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کسی
نہ بتایا۔ میں نے اس گھر کو بھی سنوارا تھا جس میں
مجھی میری شوہر کے والدین رہتے تھے اور وہ ایک
عرسے سے غیر آباد تھے۔ ایک روز میں اسکول سے
اپس آئی تو چچی نے مجھے ایک خط دیا جس میں ان کی

”کیا چاہیے تمہیں؟“ وہ جیسے ہار مان کر بولے۔

”آپ کی زندگی!“
”میری زندگی“ وہ حیران سے ہو گئے۔

”ہاں ڈاکٹر آپ مسیحا ہیں“ آپ سے مجھے یہی وعدہ لیتا ہے کہ آپ کسی کی زندگی بچانے کی سعی کریں گے۔“

”میرا وعدہ ہے پروین کہ میں اپنے پیسے اور وقار کے بھرم کو قائم رکھوں گا۔“ وہ پراعتماد کچے میں بولے۔

”تو پھر تاپا الو کی زندگی بچا لیجئے ورنہ وہ اپنی ضد پر جان دے دیں گے۔ آپ نسرین باجی سے شادی کر لیں۔“

میں نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔
وہ کم صم سے رہ گئے۔ انہیں یہ توقع نہ تھی کہ میں

ان سے یہ کہوں گی۔ وہ تو کچھ اور سمجھ کر آئے تھے کہ لیکن ہے میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہو ورنہ ان سے نفرت کا اظہار کرنے کے بعد رابطہ قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی وہ چند لمحے بڑے طویل تھے کمرے میں سکوت چھا گیا تھا۔

اچانک وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منہ پھیر کر
بولے۔

”صرف ایک بات بتا دو پروین! تمہیں مجھ سے نفرت تو نہیں۔“

”فرحان!“ میں تڑپ کر بولی۔ ”مجھے کسی سے نفرت نہیں۔ آپ میرا مان رکھ لیجئے۔ میں پھر بھی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی۔“

”آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیجئے میں..... میں“ میری آواز بیٹھ گئی۔
وہ کچھ کہے بغیر کمرے سے چلے گئے۔

میں نے صوفے کی پشت سے سر یک دیا۔ اسی لمحے باہر اسکول کی بس کا ہارن بجا اور پھر بچے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور میں نے آنسو پونچھ کر نہیں آغوش میں سیٹ لیا۔

نے خود ہی پہنا تھا۔ اس طرح تو سبھی جی لینے ہیں۔
مرحوم فرمائی اسی انداز سے جیسے تھے۔ یہ زندگی نہیں
فرار ہے۔ یہ فرض نہیں ڈھونگ ہے سامنے آ کر
جرات کے ساتھ جیو کہ تم میں چٹانوں سے ٹکرانے کا
حوصلہ ہے۔ لوٹ آؤ کہ دو مصمص بچے تمہاری راہوں
پر لگا ہیں بجھے تمہارے خطر ہیں۔ وہ اس یقین اور
اس میں بندہ ہیں جس جو تم انہیں دے گی ہو انہیں تو
غریب نہ دو جرات کے ساتھ کہہ دو کہ تم یہ فرض اور
بندہ نہیں بھاسکتیں۔ تمہاری وہ جرات ایثار اور
حوصلہ صرف دکھاؤ تھا اپنے چہرے سے یہ غائب نوج
دوتا کہ تمہارا یہ چہرہ وہ بچے بھی دیکھ لیں جو متا بھری
آغوش کے منتظر ہیں۔ آئینہ سامنے رکھ کر بتاؤ کہ
تمہیں کسی نے متا بھری آغوش میں دی تھی؟ بہتر
تعلیم و تربیت اور حوصلہ نہیں بٹھاتا تھا۔ جس حوصلے اور
جرات کے ساتھ تم نے حالات کو شکست دی اور پھر
جیتی بازی ہار گئیں۔ خود ہارنے والے اتنے بے
حوصلہ نہیں ہوا کرتے مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ
میں نے تمہارا بھرم رکھا تو تم بھی میرا بھرم رکھا میری
طرح جیو۔ لوٹ آؤ کہ جن زار حیات کے یہ بچوں
کھلا رہے ہیں۔ ادا اس ہیں۔ میرا نہیں تو اپنا بھرم رکھ
لو کہ آئی کئی ہیں کہ تم جیکر جرات و استقلال ہو اور یہ
ایک ماں کا یقین ہے۔

خط پڑھ کر میں تڑپ اٹھی۔ فرحان نے کس
انداز میں مجھے سمجھوڑا تھا۔ میں تو کچھ نہیں بھولی
تھی۔ مجھے اپنا فرض یاد تھا۔ میں تو بس کچھ عرصے دور
رہنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ یہ رشتے اتنے
نازک نہیں تھے کہ ٹوٹ جاتے۔ میں نے چچا سے کہہ
دیا کہ میں واپس جا رہی ہو جو کارمہ گیا ہے وہ اسے
پایہ تکمیل تک پہنچا دیں۔

میں واپس اپنے گھر آئی تو سب مجھ سے لپٹ کر
رودے۔ انہوں نے ان گنت سوال کئے میں انہیں
کیا بتائی میں بھی انسان تھی لیکن شکست و ریخت کا
تماشا نہیں دکھانا چاہتی تھی۔

فضلو بابا بتا رہے تھے۔ انہی سے فرحان نے میرا ہاتھ

لیا تھا۔ میں نے ان کی مزاح برسی کو تو مسکراتے
ہوئے بولے۔ ”وقت پر آگئی ہو بھئی۔ سانس کارشہ
نہ جانے کب ٹوٹ جائے۔“

میں نے انہیں لپٹی دی۔ میری آمد کی خبر انہیں تو
مل گئی ہوگی جن کی میں تم البدل میں گمران میں سے کوئی
نہیں آیا تھا میرے بچے۔ بچہ نہ بتایا کہ اٹکل اور آئی
اکثر آتے رہتے ہیں وہ انہیں بھی اپنے ساتھ میرا دفتر
کے لیے بھی لے جاتے تھے میں بھی کر شاید بھائی اور
بھیا آتے ہوں گے۔ لیکن جب بچہ نہ لہا کہ اٹکل ہی
بابا کا علاج کرنے آتے ہیں تو میں حیران رہ گئی مجھے کسی
خبر بھی نہ کاغذ میں ملتی تھی۔ مجھ سے تو سب کو ملے سے منع
کر دیا تھا لیکن میری عدم موجودگی میں ان بچوں کو میری
کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

شام کا وقت تھا جب فضلو بابا کی حالت خراب
ہوئی میں پریشان تھی کہ بچہ بھاگ کر اندر گیا۔ ریسور
اٹھا یا اور پھر نون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ میں فضلو بابا
کے کمرے سے باہر کھڑی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ اس نے
کے فون کیا ہوگا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا کہ کمرے
آئی تو اس نے بتایا کہ اٹکل تو نہیں ملے ان کے دوست
آ رہے ہیں۔ اٹکل ابھی بہت اچھے ہیں۔

ڈاکٹر امجد نے بابا کا معائنہ کیا اور نونہ لکھ کر دیتے
ہوئے بولے کہ بہتر ہے۔ انہیں ہسپتال میں داخل
کر دیاں مگر بابا نے انکار کر دیا وہ ڈاکٹر امجد کے جانے
کے بعد بابا نے کہا کہ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ
جاؤں۔ پچواڑی اندر چلے گئے تھے۔ میں غمگین تھی
بابا چند لمبے صحت پر لگا ہیں جمائے کچھ سوچتے
رہے اور پھر انہوں نے کہا۔

”بیٹی! تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارے
والدین کے بارے میں جانتا ہوں تو میں نے کہا تھا
کہ تمہارے والدین یہی ہیں میں نے غلط بات نہیں
کہی تھی۔ شو میرے خاندان کی بیٹی تھی۔ صاحب کو
اس سے محبت تھی لیکن خاندانی اصول اور ریشہ سدرہ
تھیں۔ صاحب ان دونوں دو بچوں کے باپ تھے وہ
شو سے دوسری شادی کے خواہاں تھے لیکن اپنے والد

کے سامنے زبان نہیں کھول سکتے تھے۔“

بابا کہہ رہے تھے اور میں خاموش بیٹھی سوچ رہی
تھی اب کس راز سے پردہ اٹھنے والا ہے؟

بابا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”صاحب
نے گھر والوں سے چوری چھپے شو سے شادی کر لی۔
گو شو کے والدین راضی نہ تھے میں نے انہیں متایا
تھا۔ پھر اس زمانے میں ایک خاندان کی بڑی حیثیت تھی
اور صاحب تو زمیندار گھرانے سے بھی تعلق رکھتے تھے
خیال تھا کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے والدین پر ظاہر
کردیں گے لیکن ایسا ممکن نہ ہوا۔ تمہاری ولادت کی خبر
ملی تو صاحب شو کے گھر پہنچے تین دن رہے اور لوٹ
آئے۔ حالات ایسے تھے کہ چوس چوس کھنے ڈیوٹی دینا پڑتی
تھی۔ صاحب نے شو کو ساتھ لانا چاہا مگر اس کے
والدین رضامند نہ ہوئے۔“

مجھ پر ہلکا بار آکھڑا ہوا کہ میں کون ہوں۔
بابا نے کہنے برسوں اس راز کو اپنے سینے میں دفن ر
کھا۔ میں بتی بیٹھی ہوئی تھی۔

بابا نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔
”پھر فسادات زور پکڑ گئے۔ ان دنوں صاحب
نے بیگم صاحب کو بھی اپنے سینے چلے جانے کو کہا تھا۔
میں نے پہلے ہی سے مجھے دینے تھے مگر بیگم صاحبہ رضامند نہ
ہوئیں۔ پھر صاحب بھی چپ ہو گئے۔ ایک روز
اچانک خبر آئی کہ شو کے گاؤں پر حملہ ہو گیا ہے۔
صاحب مجھے ساتھ لے کر اس گاؤں کی جانب روانہ
ہو گئے میرا گاؤں تو پہلے ہی جل گیا تھا اس طرح ہمیں
تم ہی ملیں۔ تم اپنے مرحوم ماموں کے بازوؤں میں
تھیں صاحب نے مجھے ہی سے منع کر دیا کہ میں اس
بات کو راز رکھوں اور کسی کو کچھ نہ بتاؤں“ بابا کی
آنکھوں میں آنسو تھے اور ان کا سانس دھونکی کی طرح
چل رہا تھا۔

میں ان کے چہرے پر لگا ہوں جمائے بیٹھی تھی۔
”اپنے باپ کی مجبور یوں کی بتا پر انہیں معاف
کر دینا یہی وہ نہیں اپنی بیٹی اپنا خون بنا کر بیگم صاحبہ
کی آغوش میں نہیں دے سکتے تھے۔ پھر وہ لاکھ کہتے

کوئی یقین نہ کرتا۔ بڑے صاحب اسی روز آئے تھے
جس روز ہم چھپیں لے کر آئے۔ تمہاری باپ نے
تمہاری پرورش اور تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ کی بیگم
صاحبہ نے بھی تمہیں اعلیٰ تربیت دی اور میں اس گھر کی
چوکیداری کے فرائض اس لیے انجام دیتا رہا کہ
تمہارے قریب رہوں۔ تم میرے خاندان کی آخری
نشانی۔“ بابا کی آواز بیٹھتی اور وہ چپ ہو گئے۔

”بابا! آپ۔۔۔ آپ نے مجھے یہ بات
آج۔۔۔ آج کیوں بتائی بابا پہلے۔۔۔ پہلے کیوں نہیں
بتائی۔۔۔“ میں ان سے لپٹ کر ہلک پڑی۔ میرے آنسو
بہہ رہے تھے۔ میں بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”اس خاندان کے بزرگ بزدل ہیں جو اپنی
بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتے لیکن رئیس بھائے کے لیے شہر
جاتے ہیں۔“

معاذ مومن کی چاب سنائی دی۔ میں نے گھوم کر
دیکھا فرحان ڈاکٹر امجد کے گھر اور دروازے میں کھڑے
تھے۔ میں آچل میں منہ چھپائے اندر چلی گئی۔

بابا کی حالت بگڑتی گئی۔ اسی اور ابھی آگئے
تھے۔ انہیں فرحان ہی نے اطلاع دی تھی۔ نرسن بچیا
روزانہ آ جاتی تھیں۔ بابا پندرہ روزہ بیمار رہ کر چل
بے۔ میرا حال تھا۔ بابا کچھ نہ بھی بتاتے تو مجھے
ان کی موت کا اتنا ہی دکھ ہوتا کہ انہوں نے مجھے
گودوں کھلایا تھا۔

بابا کی وفات پر میں نے جی کھول کر آنسو
بھائے تھے۔ ایو اور امی مجھے تسلیاں دے رہے تھے۔
بھیا سر جھکائے بیٹھے تھے اور مجھے کہیں دور سے بابا کی
آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سیف الملوک کا یہ شعر
اکثر گایا کرتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ
قریب ہی کھڑے وہی شعر گارے ہوں۔

ڈک لے اکیوں بندے اقرودے سبج نہیں

بندار دیاں

ایس حیاتی دے دکھ ڈاڈے تے مکدے نہیں

بن مویاں

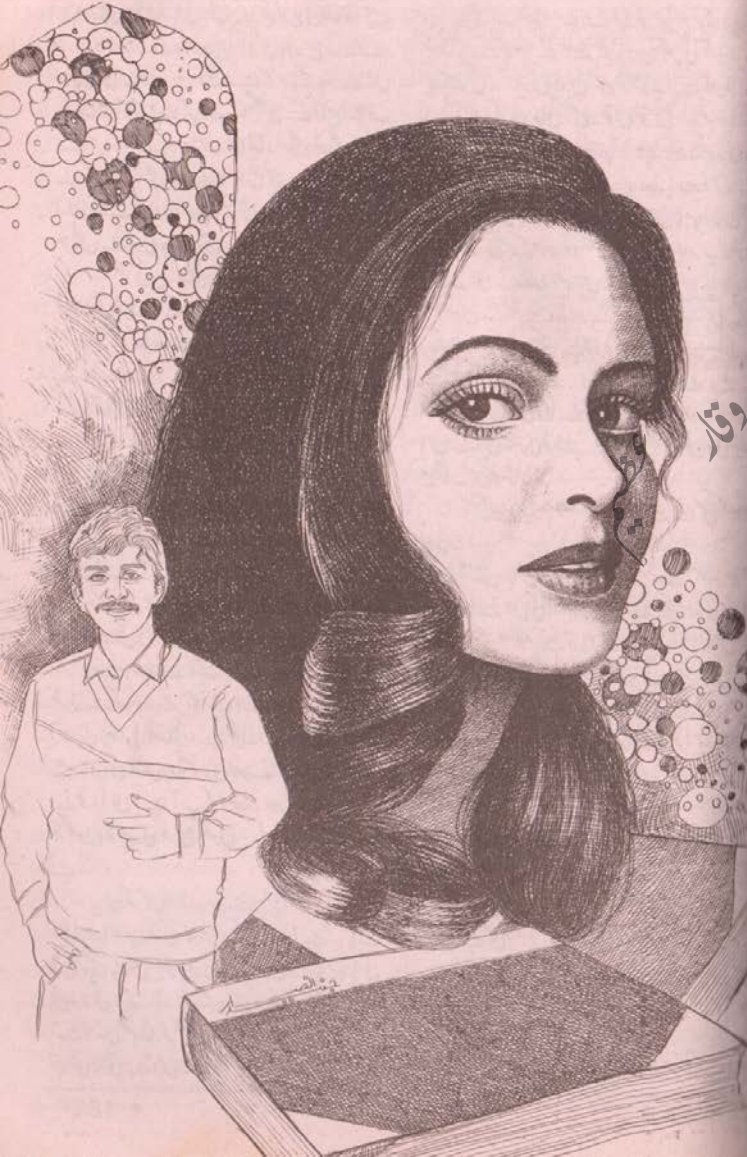
صبحا کی پلکیں ایک انجانے سے بوجھ سے بند ہو گئیں پھر اس کی بند آنکھوں کے اندر طاہر حسین کا لمبا چوڑا اور صحت مند جسم آکر کھڑا، سُرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ... لیکن تھوڑی دیر بعد یہ خوب صورت صحت مند جسم خود بخود اس کی نگاہوں میں دھندلا پڑتا گیا

اس شمارے کی ایک دلچسپ حساس و جذباتی کہانی

آج جمال کا خط دیکھ کر میڈم صبا کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔ صرف ایک سطر کا انتہائی مختصر سا خط تھا۔ جس جمال نے صرف اتنا ہی لکھا تھا۔ ”چوتیس تاریخ کو تیر گام سے بچ رہا ہوں۔“ اور آج چوتیس تاریخ تھی یعنی آج ہی کے دن جمال آ رہا تھا۔ کیا واقعی وہ آ رہا ہے؟ اس خیال کے آنے ہی میڈم صبانے دل ہی دل میں دیکھ کر محسوس کرنے کی کوشش کی آج کتنے سالوں بعد جمال کوئی کے پاس آنے اور اس سے ملنے کا خیال آیا تھا۔ مگر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ میڈم صبا ایک بار پھر سوالوں میں الجھتی چلی گئی۔ شاید یونہی ملے آ رہا ہو؟ مگر نہیں..... سوچتے سوچتے انکار میں اپنا سر ہلایا۔ وہ یونہی نہیں آ رہا ہوگا، کوئی نیا بات ہوگی لیکن کیا؟ ابھی وہ آگے سوچ نہیں نہ پائی کہ اس کی سیکریٹری کس نوشابہ اس کے کیمین میں داخل ہوئی۔ نوشابہ نے دیکھا، میڈم صبا کیمین میں بالکل تنہا کیمین کر رہی پریشانی سے وہ اس طرح اپنے سر کو جتیش دے رہی تھی جیسے دھیرے دھیرے کسی سے باتیں کر رہی ہو نوشابہ ایک لمحے تک دروازے پر دُک کر ہی میڈم صبا کو دیکھتی رہی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے اندر آ جانے کے باوجود بھی میڈم صبا اس کی آمد سے بے

خبر ہے، آج سے پہلے تو ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ جب بھی میڈم صبانے اسے اپنے کیمین میں بلایا تھا۔ تو نوشابہ نے اسے اپنا مختصر ہی پایا تھا۔ آج دن بھر کے کام کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میڈم صبا کے کیمین میں سے انٹرکام پر بات کی تھی اور پھر اسے اپنے کیمین میں آنے کے لیے کہا تھا۔ کس نوشابہ کا خیال تھا کہ یہ میڈم صبا اس کی راہ دیکھ رہی ہوگی لیکن اس وقت میڈم صبا اس کی آمد سے بے خبر کیمین کی سوچ میں غرق و کھائی دے رہی تھی اور اس کے کیمین میں ایک خط دبا ہوا تھا۔ نوشابہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میڈم صبا کی بڑی میز کے سامنے آگئی۔ کیمین میں ہوتی۔ نوشابہ کو اپنی بالکل بڑا فخر تھا اور وہ اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی، کیوں کہ نوشابہ کو معلوم تھا کہ میڈم تن تنہا ہی اپنی محبت اور لگن سے صبا ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو اس کی بہترین کارکردگی، مختلف ایوارڈوں سے نواز کر اس ادارے کی خدمت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ فی وی کرشل کے ساتھ ساتھ میڈم صبانے اخباری اشتہاروں کی دنیا میں بھی اپنی ایجنسی کو ایک نئے انداز سے متعارف کرایا تھا۔ اور اب تو اس ایجنسی کو اتنا بڑا بس ملے لگا تھا کہ میڈم

دقت



صبا کو ہر کام کے لیے حامی بھرتا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ ہر کام میں میڈم صبا کی دلچسپی کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے اپنے کاروبار کے علاوہ دنیا کی کسی اور چیز سے اسے دلچسپی ہی نہ ہو اور ہر وقت اپنے کام کے بارے میں سوچنا ہی کا کام رہ گیا ہو۔ انجمنی کے تمام اسٹاف سے اس کا سلوک دوستانہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے بھی اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور اپنے اسٹاف کے تعاون سے انجمنی روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتی جا رہی تھی۔

”کوئی پریشانی ہے میڈم؟“ اچانک مس نوشاہی کی طرف دیکھا اور حسب عادت مسکرا دی۔ ”مگر کوئی بات ضرور ہے میڈم“۔ مس نوشاہ نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کس کا لیٹر ہے آپ کے ہاتھ میں؟“

صبا نے اپنے ہاتھ میں دے ہوئے خط کی طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ اسے معلوم تھا کہ مس نوشاہ کی نگاہیں بڑی تیز ہیں اس سے کسی چیز کا چھپا رہنا بہت مشکل ہے لہذا اس نے کہہ دیا۔ ”جمال کا خط ہے۔“

”جمال؟“ نوشاہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کون جمال؟“ میڈم صبا نے ایک لمحے کے لیے نوشاہ کی طرف دیکھا اور پھر یکا یک اسے نوشاہ کی صورت دھندلی دھندلی دکھائی دینے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پلٹیں جو جمل ہی ہونے لگی ہیں لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور بندھ ہوئی ہوئی آنکھوں کو پوری طرح کھول کر بولی۔ ”میرا بیٹا ہے۔“

یہ سن کر مس نوشاہ سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میڈم صبا کا اپنا کوئی خاندان بھی ہو سکتا ہے یہ بات آج پہلی بار ہی معلوم ہو گئی تھی۔ کیوں کہ میڈم صبا کی نئی زندگی کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ سب کو یہی علم تھا کہ کلکشن کے ایک شاندار فلیٹ میں تنہا ہی رہتی ہے اس کے سوا کسی کو کبھی کبھی یہ معلوم

تھا۔

یکا یک میڈم صبا نے خط کو میز پر رکھ دیا اور نوشاہ سے کام کے سلسلے میں دن بھر کی تفصیلات پوچھنے لگی۔ جوں جوں مس نوشاہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرتی جاتی تھی۔ توں توں میڈم صبا کے چہرے کے خدو خال بدلتے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے اپنے بیٹے کا خط دیکھ کر جو جذبات اُس کے چہرے پر ابھرائے تھے اب ان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ لہذا کے بعد وہ بینک میں اس لیے دووں میٹنگ ہی بے حاد ہم ہیں۔ اس نے سوچا ان دو بینکوں کے فتنے ہوتے تو چار بیج جائیں گے یا کچھ اور دیر بھی ہو سکتی ہے لہذا کیوں نہ ایک میٹنگ کو کنسل کر دیا جائے۔ دراصل اس نے ریلوے اسٹیشن جا کر جمال کو لانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اس لیے اس نے اپنی سیکری نوشاہ سے کہا۔ ”کنسل دی سینڈ میٹنگ مس نوشاہ۔“

”کیوں میڈم؟“ نوشاہ کو حیرت کی محسوس ہوئی۔

”میں جانتی ہوں وہ میٹنگ بہت اہم ہے۔“ میڈم صبا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے پارٹی ناراض بھی ہو سکتی ہے لیکن میں کیا کروں؟ پھرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ مس نوشاہ نے ایک لمحے کے لیے میڈم صبا کی طرف دیکھا اور اپنی ڈائری پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”آج آپ کو ان کے دفتر میں بھی جانا ہے۔“

”کیا ڈائری؟“ میڈم صبا نے تفصیل پوچھی۔

ساری بات بتانے کے بعد مس نوشاہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا اسے بھی کنسل...“

”نہیں... نہیں...“ میڈم صبا نے درمیان میں اس کی بات کاٹ دی۔ ”اسے کنسل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اوکے“ نوشاہ ڈائری بند کر کے کھڑی ہو گئی

اور میڈم صبا کے کہین سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میڈم صبا ایک بار پھر بینک میں تجارتی گئی تھی اور ایک بار پھر وہ اپنی ذات میں انجمنی چلی گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کے کوئی چیز اوپر بھی جاری ہے بالکل کسی لفٹ کی طرح۔ نیچے اوپر تک... جمال نے اپنے آنے کی کوئی دیر نہیں بتائی تھی۔ اس لیے وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ آخر یہاں آ کیوں رہا ہے؟ کیوں کہ اسے برسوں میں یہاں آنے کی بات تو دور کنار اس نے تو بھی ایک خط تک لکھا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کی خیر خیریت کی اگر کوئی خبر اسے ملتی بھی تھی تو وہ اسے خود جمال یا طاہر سے نہیں ملتی تھی بلکہ ادھر ادھر سے کچھ سی سانی خبریں اسے مل جاتی تھیں۔ طاہر کے خط وغیرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جمال بھی اپنے باپ کی طرح صبا سے دور جا بیٹھا تھا۔ شروع شروع میں تو میڈم صبا کو اس دیر سے مدد لینے پر تفریطاً حال کر کے رکھ دیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس پر دھول سی جڑ گئی تھی۔ طاہر اور میڈم صبا کو ایک دوسرے سے الگ ہوئے اب پورے تیس سال گزر چکے تھے۔ اس وقت جمال صرف چھ سال کا تھا۔ طاہر تو باقاعدہ قانونی طور پر علیحدگی کا پتا تھا لیکن صبا اس کے لیے

تیار نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ”میں نے چونکہ اپنی پسند اور شادی کی تھی اس لیے علیحدہ بھی نہیں اپنی مرضی سے ہونا ہوگا۔“ اس کے بعد اس نے آگے کہا تھا۔ ”میں کبھی کسی سے کوئی فریاد نہیں کروں گی۔ میں ایسی عورت نہیں ہوں جو مجبور اور بے بس ہو جاتی ہے، مجھے تم سے کسی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے اور ہاں۔“

انجمنی آزاد ہو۔“ اس فیصلے کے بعد وہ پنڈی سے کراچی آ گئی تھی۔ کراچی میں اس کے والد کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ اور اب چونکہ وہ اکیلے ہی تھے۔ اس لیے وہ ان کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پھر دھیرے دھیرے اُس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر

دیا۔ شروع شروع میں جمال ہر برس اس سے ملنے کے لیے آتا رہا لیکن اس وقت بھی بھی صبا نے اسے زبردستی اپنے پاس روکنے کی کوشش نہیں کی تھی جب تک اس کی مرضی ہوئی تھی وہ رہتا تھا۔ اور پھر وہاں چلا جاتا تھا لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کے آنے جانے کا سلسلہ م ہوتا چلا گیا۔ اور اب تو پچھلے دس برس وہ اپنی ماں سے ملنے بھی نہیں آیا تھا شاید اپنے امیر باپ کے گھر میں اسے دنیا بھر کی باتیں حاصل تھیں۔

پچھلے کے بعد شروع ہونے والی میٹنگ سواتین بجے ختم ہوئی تھی سب کو رخصت کرنے کے بعد وہ اپنے کہین سے باہر نکلی اور نوشاہ سے کہا۔ ”میں جمال کو لینے اسٹیشن جا رہی ہوں اور پانچ بجے کے بعد گھر پر ہی رہوں گی۔ کوئی ضروری کام ہو تو فون کر سکتی ہو۔“

پھر وہ لفٹ کے ذریعے نیچے اتری اور کار پارکنگ سے اپنی سفید ٹویٹا نکال کر روانہ ہو گئی۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک کے رش میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے وہ سکون سے کار ڈرائیو کرتی ہوئی اسٹیشن پہنچ گئی۔ ٹرین کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اسے پلیٹ فارم پر آئے ہوئے بہ مشکل پانچ منٹ ہوئے تھے کہ ٹرین کی ٹوٹو ٹاٹ سنا کی دی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ فرسٹ کلاس کے ڈھول میں سے اترتے ہوئے مسافروں کو دیکھنے لگی۔ یکا یک ایک سوال نے اسے چونکا دیا۔ کیا وہ جمال کو پہچان سکتی گی؟

لیکن اسے جمال کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی نیچے اترنے والے مسافروں جمال الگ تھمک نظر آ رہا تھا۔ اپنے باپ طاہر حسین سے اس کی شکل صورت اور قد کاٹھ بہت ملتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پچیس سال پہلے کا طاہر اس کے سامنے چلا آ رہا ہو۔ مگر جمال کے چہرے ایک دبلی پتلی خوب صورت سی لڑکی بھی کی طرح تھی۔ نیچے اتر رہی تھی۔ جمال نے دھیمے لہجے کچھ کہا تھا۔ اور دال میں بائیں دیکھنے لگا۔

مگر صبا جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی پھر جب جمال کی نظر اس پر پڑی تو وہ فوراً ہی اس کی جانب لپکا۔ اور اپنی ماں سے لپٹ گیا صبا اسے سینے سے لگائے کھڑی کر اس کی نظر پیچھے کھڑی لڑکی پر پڑی۔ ابھی وہ اسے دیکھ رہی تھی کہ جمال نے اس کے کندھے پر سے اپنا سر ہٹا دیا۔ ”یہ“
نوشین ہے۔“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ سی تھی۔ اس نے لڑکی کا تعارف کرانے کے بعد اپنی ماں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے۔ لڑکی نے دھیرے سے ایک قدم اٹھایا اور سر جھکا کر اسے آداب کیا۔
”خوش رہو۔ جیتی رہو۔“ کہہ کر صبا کی طرف دیکھا۔

”مئی آپ کو میرا خط ملا تھا نا؟“ جمال نے گھبراہٹ ہوئی آواز میں پوچھا۔
”اگر تمہارا خط نہ ملتا ہوتا تو اس وقت میں انیشین پر کیوں ہوتی؟“ صبا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہارے خیال سے کیا میں پنجاب سے آنے والی ہر گاڑی کو دیکھنے آئی ہوں؟“

جمال اپنی مئی کے اس جواب پر ذرا بھیچھپ گیا لیکن اپنی اس جھنجھپ کو چھپانے کے لئے وہ زبردستی ہنسنے لگا۔ نوشین کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ مگر وہ کچھ بھکیا ہٹ سی محسوس کر رہی تھی اس لیے اس کے آچل کا کونا اس کی انگلیوں میں لپٹا جا رہا تھا۔

”چلو“ تھوڑی دیر بعد صبا نے کہا۔ ”نوشین بھی ہمارے ساتھ ہی آرہی ہے نا؟“
”ہاں“ جمال ایک لمحے تک اپنی مئی کو گھور کر دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ ”ہم لوگ تو آپ ہی سے ملنے آئے ہیں مئی۔“
”لیکن تم نے خط میں نوشین کا کوئی ذکر تو نہیں کیا تھا۔“

صبا نے مسکرا کر مگر ذرا خطرہ لے لیں کہا۔ ”اس لئے مجھے اس کے بارے میں کیا معلوم ہوتا؟“

جمال نے کچھ نہیں کہا پھر وہ تینوں انیشین کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ صبا کی کار سڑک پر اپنی مخصوص رفتار دوڑ رہی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نوشین کی نگاہیں بار بار انیشین گریڈ پر بیٹھی ہوئی میڈم کو گھورنے لگی تھیں۔ میڈم صبا کی عمر اب ذہل رہی تھی۔ لیکن اس کے تو رنگ میں ابھی تک گرمی کی آج محسوس ہوئی تھی۔ سنہرے فریم والے خنٹے کے اندر سے چھانکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں ابھی تک دلوں کو خوف زدہ کر دینے والی چمک باقی تھی اور ان آنکھوں سے آگے کچھ بھی نہ دیکھا نہیں جاسکتا۔ شاید میڈم صبا کی آنکھوں کے پیچھے ایک اونچی دیوار چائل ہے۔ جمال بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اس طرح سنا اور دبا ہوا سا بیٹھا تھا کہ جیسے کسی انجمن نے اسے گھیر رکھا ہو۔

میڈم صبا کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ کیا فلیٹ کے گیٹ میں داخل ہو کر اس نے گاڑی روک دی۔ نیچے اتر کر جمال نے کار کی ڈکی میں سے اپنا سامان نکالا۔ چاہا تو صبا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”تم رستے دو۔۔۔۔۔ یہ رحمان بابا کرے گا۔“
کال تیلی آواز سن کر رحمان بابا نے دروازہ کھول دیا۔ میڈم صبا کے پیچھے وہ ہمانوں کو دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی۔ ”گاڑی میں ہے سامان نکال کر اندر لے آؤ بابا۔“

صبا نے اس سے کہا اور اندر داخل ہو گئی۔ نوشین اس وقت پیچھے مڑ کر سمندر کی شور مچاتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی جو وہاں سے صرف ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھیں۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ یکا یک صبا نے پلٹ کر نوشین سے پوچھا۔
”کچھ نہیں“ نوشین چونک کر بولی۔ ”یوں ہی دیکھ رہی تھی۔“

”یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ تم دیکھ سکتی ہو۔“ صبا نے مسکراتے ہوئے کہا اور جمال اپنی مئی کی آواز

میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی مئی نے اس پر کوئی طنز کیا ہے یا انھوں نے یونہی بات کہہ دی ہے؟ لیکن اسے اپنی مئی کے چہرے پر کوئی خاص بات نظر نہیں آئی مگر وہ نوشین کو مسکراتے دیکھ کر یہ سوچنے لگا تھا کہ چونکہ اس کی مئی کی طرح نوشین کو بھی نفسیات سے دلچسپی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ مئی کی بات کا مطلب سمجھتی ہو اور اس لئے مسکرا دی ہو۔ اس خیال سے جمال کو ذرا راحت سی محسوس ہوئی اور اس کے دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اسے اس بات کی فکر تو تھی ہی کہ مئی ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہیں؟ کیوں کردہ پچھلے دس برس سے اپنی مئی سے ملنے نہیں آئے؟ ابھی آج جب وہ آئے تو تنہا نہیں ہے اس کے ساتھ نوشین بھی ہے۔ لیکن صبا کے چہرے کے تاثرات سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے نوشین کا آنا ان کے لئے کوئی چٹکا دینے والی بات نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں اس بات کا علم ہوا اور وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح جس بول رہی تھی انھوں نے تو جمال سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ تم اتنے سالوں تک کیوں نہیں آئے تھے؟ اور اب اچانک کیوں آئے ہو؟ یہ لڑکی کون ہے؟ کیوں تمہارے ساتھ آئی ہے؟ جہاں تک کہ انھوں نے تو جمال سے کوئی خیر خیر نہ بھی نہیں پوچھی تھی۔

جمال سوچ رہا تھا کہ مئی آخر اس سے کچھ پوچھتی کیوں نہیں ہیں؟ کیوں کہ اسے تو اپنی مئی سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔ وہ تو اپنی مئی سے بہت کچھ کہنے آیا تھا لیکن گھر میں آنے کے بعد صبا تو اس طرح اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھی۔ جیسے نوشین اور جمال اس کے مہمان نہ ہوں بلکہ وہ تو ہمیشہ سے ہی اس گھر میں رہتے آئے ہوں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے رحمان بابا کو کھانے کے بارے میں بدایات دیں اور پھر کہا۔ ”مجھے تو ایک ڈنر پارٹی میں جانا ہے میں اسے کیسل بھی نہیں کر سکتی

تھی۔ اس لئے تھوڑی دیر بعد میں تو چلی جاؤں گی۔“
پھر تقریباً ساڑھے سات بجے میڈم صبا تیار ہو کر چلی گئی اس کے بعد جمال کے چہرے پر اداسی اور ناامیدی کے گہرے سائے لہرائے گئے اور وہ ایک صوفے پر کم سما بیٹھا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نوشین نکلا اور کچن سے تبدیل کر کے اس کے پاس آئی۔ ”مئی چلی گئیں؟“ اس نے جمال سے پوچھا۔

”ہاں“ جمال نے ایک گہرا سانس لے کر کہا اور نوشین کی طرف دیکھنے لگا۔ نوشین بھی اس کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی ”انھوں نے میرے بارے میں کچھ پوچھا تھا کیا؟ کیا کہا تم نے؟“

جمال نے کوئی جواب نہیں دیا اور پچپ چاپ بیٹھا اپنی انگلی کے ناخن کو گھورتا رہا۔ پھر اچانک اس نے نوشین سے پوچھا۔ ”کیسی لگیں تمہیں میری مئی؟“
”ایک بندہ کی طرح۔۔۔۔۔“ نوشین کے پاس جواب تیار ہی تھا۔

”کیا مطلب؟“ جمال چونک پڑا۔
”مطلب یہ کہ اندر ایک بہت بڑا خزانہ بھی لے کر بیٹھی ہیں تمہاری مئی۔“ نوشین نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”اور بس کا ڈھکنا بڑی مضبوطی سے بند ہے جس میں بڑے بڑے تالے بھی لگے ہوئے ہیں۔“

”یہ کیا مذاق کر رہی ہو تم؟“ جمال نے ذرا ناراض لہجے میں کہا۔

”یہ مذاق نہیں ہے جمال۔“ نوشین اس سمجھیر آواز میں بولی۔ ”میں تو تم سے ایک کڑوا سچ کہہ رہی ہوں۔ ایک تلخ حقیقت۔۔۔۔۔ پھر اس سے پہلے ان کی گفتگو آگے بڑھتی رحمان بابا نے آکر انھیں کھانا کھا لینے کے لیے کہا۔ بخیر اور دونوں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کھانے کی میز پر آ گئے۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی رات کے تقریباً دس بجے کے بعد میڈم صبا گھر واپس آئی اور اس نے

آتے ہی جمال سے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے کھانا کھالیا؟“

”ہاں جی۔“

”اچھا“ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اپنا لباس تبدیل کر کے وہ اپنے کمرے سے باہر آگئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر گہرا سکون تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہنے بغیر اپنی عادت کے مطابق دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور وزانہ کی طرح کیاؤنڈ میں ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگی۔ نوٹیشن بھی باہر آکر کیاؤنڈ کے ذریعے پر پیٹھ گئی اور جمال کیاؤنڈ کی ریٹنگ سے لٹکے ہوئے جھولے پر آکر پیٹھ گیا۔ رحمان بابا اپنے کام سے فارغ ہو کر یہ پوچھنے باہر آ گیا کہ مہمان کا بستر کہاں لگا یا جائے گا؟

اس کا سوال سن کر میڈم صبا نے کہا۔ ”یہ تم جمال سے پوچھ لو۔“ یہ سن کر جمال ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور لپک کر اپنی مٹی کے پاس پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر نوٹیشن بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اپنی مٹی کے قریب پہنچ کر جمال تک گیا۔

”جی“ اس کی آواز کا پتہ نہ رہی تھی۔

”کیا بات ہے جمال؟“ میڈم صبا نے رک کر پوچھا۔ اس درمیان رحمان بابا اندر جا چکا تھا۔

”آخر آپ مجھ سے کچھ پوچھتی کیوں نہیں ہیں؟“ جمال نے کہا۔

”کیا پوچھوں؟“

”کیا مجھ سے پوچھنے کے لیے آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟“ جمال نے پوچھا تو صبا نے مسکرا کر اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

”کیا واقعی کوئی بات ہے؟“

”آپ تو مجھ پر ناراض ہو رہی ہیں جی“ جمال نے منہ پھیر کر کہا۔

”ناراض؟“ صبا نے ایک ہلکی سی ہنستے ہوئے کہا۔

”بھلا یہ کون سا لفظ ہے؟“

”یہ ناراضگی شاید اس لیے ہے کہ میں کافی عرصے بعد آیا ہوں۔۔۔ ہاں کئی سال بعد اپنی جی کے پاس آیا ہوں۔ اور وہ بھی ایک لڑکی کو لے کر آیا ہوں میں۔۔۔ جمال جذباتی لہجے میں بولا۔

”تو؟“ صبا نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میں اس لڑکی کو دیکھ ہی نہیں پارہی ہوں۔“

”نہیں آپ دیکھ تو رہی ہیں۔ لیکن جانتی کچھ بھی نہیں ہیں آپ“ جمال بولا۔

”مگر مجھے جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیوں جانتا چاہیے مجھے؟“ صبا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

جمال سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اس کی خاموشی دیکھ کر نوٹیشن ان کے نزدیک آگئی اور صبا کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”پہلے جی۔۔۔ اندر چلتے ہم اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔“

میڈم صبا نے ایک لمحے کے لیے کھڑک پر نوٹیشن کی طرف دیکھا پھر دیر سے بولی۔ ”ناراض“

”ناراض؟“ رحمان بابا نے دوسرے کمرے میں پھنس کر لگا دیے تھے۔ انہی میں سے ایک بستر پر صبا آکر بیٹھ گئی اور اس نے نکیہ افشار کی اپنی گود میں رکھ کر جمال کی طرف دیکھا جو اپنے دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔

”ذرا آرام سے بیٹھو بیٹھے“ جمال نے بول کر کہا اور ایک نکیہ اس کی جانب آجھا دیا۔ نوٹیشن بالکل اس کے برابر میں تقریباً اس کے لگے کر بیٹھ گئی۔

”اب کہو۔۔۔“ صبا نے جمال سے کہا۔

جمال کچھ بھی بول نہیں سکا اس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بات کہے اور کہاں سے شروع کی جائے لیکن اس سے پہلے کہ کچھ کہتا اس کی ساعت سے اس کی جی کی آواز آ گئی۔

”دیکھو تمہیں جو کہتا ہے صاف صاف کہہ ڈالو تفصیل میں جانے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔“ اس کی یہ بات سن کر نوٹیشن کو لپٹی آگئی۔ نوٹیشن کو بیٹھنے دیکھ کر صبا خود بھی ہنس پڑی اور ہنستے ہوئے نوٹیشن سے بولی۔ ”ذرا دیکھو کتنا معصوم نظر آ رہا ہے یہ۔“

”لیکن ٹرین میں تو بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے۔ نوٹیشن نے کہا۔ ”کہہ رہے تھے جی سے یہ کہوں گا۔ اور وہ کہوں گا۔ مگر اس وقت تو کسی گتہ کار کی طرح سر جھکا کر بیٹھتے ہیں“

”گتہ کار کی طرح نہیں نوٹیشن بلکہ کسی بچے کی طرح“ اپنی جی کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھ کر اس کے قریب سرک آیا۔ صبا نے نوٹیشن کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور جمال سے پوچھا ”یہ تمہاری بیوی ہے؟“

”تمہاری شادی ہونے والی ہے جی۔۔۔ آئندہ میں۔۔۔“ جمال نے کہا۔

”تو مجھے دھن دھن لائے ہو؟“ صبا نے دیر سے پوچھا لیکن جمال نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کے اور زیادہ قریب کھٹک آیا اور پھر اس نے گود میں اپنے دونوں ہاتھ لے کر گھمیر لہجے میں بولی۔ ”نہیں جی۔ میں تو آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“

”کہاں؟“ صبا نے چونک کر پوچھا۔

”وہیں جی۔۔۔ جہاں آپ کا گھر ہے۔“ جمال کی آواز کا پتہ نہ رہی تھی۔ ”میں آپ کو اسی گھر میں واپس لے جانے آیا ہوں۔“

”میرا گھر تو یہی ہے۔“ صبا نے کمرے کی چاروں دیواروں کی طرف نظر ڈالنے ہوئے سر دھچکے میں کہا۔ ”یہی دیواریں میری ساتھی ہیں۔ میرا ڈھکے ہی انھوں نے دیکھا ہے اور کدھر بھی۔ یہی میرا گھر ہے۔“

”نہیں جی یہ آپ کا نہیں ہے۔“ جمال جلدی سے بولا۔ ”آپ کا گھر تو وہیں ہے۔ اور آپ کو وہیں ہانا ہوگا۔“

”اب کوئی دوسری بات کر دو جمال۔“ صبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہاری پرہیزی مکمل ہوگئی؟“

”ہاں جی میں ٹیکسٹائل انجینئر بن گیا ہوں۔“ جمال نے جواب دیا۔

”دیر گزشتہ۔۔۔ اب اپنے باپ کی کل کوٹھیک سے چلاؤ۔“ اتنا کہہ کر صبا نے نوٹیشن کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ ”اور تم کیا کر رہی ہو نوٹیشن؟“

”میں بی ایس سی فائنل میں ہوں جی۔“ نوٹیشن نے بتایا۔

”تو فائل میں آتے ہی جمال کی محبت میں گرفتار ہو گئیں؟“ صبا نے ہنس کر پوچھا تو نوٹیشن نے شرما کر اپنا سر جھکا لیا اور اس بجائے جمال نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”نہیں جی ہماری شادی ہماری محبت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ رشتہ ڈیڈی نے اور نوٹیشن کے والدین نے بن لے لیا ہے اور پچھلے مہینے ہماری محبت بھی ہوگئی ہے۔“

”اوہ۔۔۔“ صبا نے ایک گہرا سانس لیا۔

”ہاں جی۔۔۔ میں آپ کو فون بھی کرنے والا تھا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا؟“ صبا نے بڑے سکون سے جواب دیا اس کے چہرے پر یاس کی آواز میں کوئی کڑواہٹ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا جیسے ساری بات خیر و خوبی سے ختم ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد جمال نے پھر کہا۔

”اب یہاں سے اپنا سب کچھ سیٹ لیں جی۔ ہم آپ کو واپس لے کر جائیں گے۔“

اتنا کہہ کر جمال ایک جلی کے لیے بھر گیا اور نوٹیشن کی جانب دیکھ کر بولا۔ ”یہ نوٹیشن کی بھی خواہش ہے کہ وہ آپ کی موجودگی میں ہمارے گھر آئے اور ڈیڈی کی بھی۔“

جمال انہی کہہ پایا تھا کہ صبا نے اچانک اس کے چہرے پر سے اپنی نگاہیں ہٹائیں اور وہ سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی لیکن جمال نے اپنی ادھوری

درہ کا سفر

شاہین اقبال

”مجھے زون جیسی لڑکی سے شادی کرنی ہوتی تو میں اپنی ممی کی پسند سے شادی نہ کرلوں؟ ویسے بھی یار، یہ امیر گھرانوں کی ماڈرن لڑکیاں کچھ میرے حلق سے نہیں اُترتیں۔ ہر کوئی تو ان کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔“

اس شمارے کی ایک حساس، سچی کہانی

کے لیے میں نے واپس جانا مناسب سمجھا۔ ”کیا بات ہے فرح! اکیلی کیوں آ رہی ہو؟“ علی نے پوچھا۔ ”وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا ارادہ مجھے نہیں لگتا۔“ میں نے بات بتائی اور چائے بنانے کے لیے کچن میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں چائے لے کر زون کے کمرے کی طرف آگئی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور بہیم تصور سے اس کی پوچھاٹ دیکھنے لگی۔ اس نے چونک

کے لیے میں نے واپس جانا مناسب سمجھا۔ ”کیا بات ہے فرح! اکیلی کیوں آ رہی ہو؟“ علی نے پوچھا۔ ”وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا ارادہ مجھے نہیں لگتا۔“ میں نے بات بتائی اور چائے بنانے کے لیے کچن میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں چائے لے کر زون کے کمرے کی طرف آگئی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور بہیم تصور سے اس کی پوچھاٹ دیکھنے لگی۔ اس نے چونک

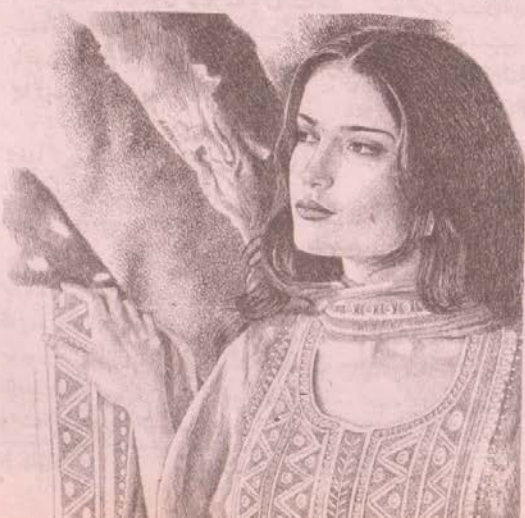
اس کے گلے میں ڈال دیا اس وقت اس کی آنکھوں میں دو آنسو آکر رزک گئے تھے۔ نوشین کے گلے میں ہار پہنانے کے بعد اس نے اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیا اور پھر بے حد جذباتی کچھ میں بولی۔ ”آج تم میری نظر میں بھی میرے بیٹے کی بیوی اور میری بیوی بن گئی ہو... میری دعا میں ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ ہیں تم جہاں بھی رہو، ہمیشہ ہنستے مہکاتے رہو۔ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی نا رُک لمحہ نہ آنے پائے“ جس میں کوئی غلط فہم کرنے سے تمہیں غم پھر پچھتا تا پڑے۔“

”تو کیا ممی آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گی؟“ جمال نے اٹھ کر صبا سے پوچھا۔ ”نہیں بیٹے۔ اب میں وہاں کبھی بھی نہیں آؤں گی۔“ صبا نے دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے گھمبیر آواز میں کہا۔ ”تمہارے ڈیڑی کو اگر میری ضرورت ہو تو ان سے کہہ دینا کہ تمہاری شادی کے بعد وہ کئی چھ ماہ کے بغیر یہاں واپس آئے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میرے کمرے کے دروازے ان کے کمرے اور تمہارے لیے ہمیشہ سے کھلے ہیں اور آئندہ بھی کھلے رہیں گے... کبھی بھی اگر تم لوگوں کا کئی چاہے تو تم لوگ بھی آتے رہنا... لیکن... لیکن... میں اور نہیں رہوں گی۔“ یہ کہتے ہی ایک لمحے کے لیے میڈم صبا کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ آنکھیں کھل گئیں لیکن انھوں نے اس گلے اور بند ہونے کے درمیان جیسے بہت جلد چپکا تھا نوشین کو یوں لگ رہا تھا جیسے میڈم صبا کے سامنے کھڑی تھی شاید گزرتے ہوئے برسوں کی طرف اور شاید اب وہ کمپاؤنڈ کی ریلنگ پر لگے ہوئے جھولے میں جا کر بیٹھ جائیں گی اور آئندہ کئی برسوں تک وہیں بیٹھ کر کسی کا انتظار کریں گی لیکن پھر بھی اپنے چہرے اور اپنی باتوں سے وہ یہی ظاہر کرتی رہیں گی کہ ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور نہ ہی انھیں کسی کا انتظار ہے۔

بات پوری کرتے ہوئے آگے کہا۔ ”وہ ماہ قبل ڈیڑی پر فوج کا شدید حملہ ہوا تھا“ جس کے نتیجے میں اس وقت وہ ہسپتال پر ہیں۔ انھوں نے بھی کہا ہے کہ اپنی کمرہ کو ساتھ لے آتا۔“

یہ سن کر صبا کی پلکیں ایک آنجانے سے بوجھ سے بند ہو گئیں پھر اس کی بند آنکھوں کے اندر ظاہر حسین کا لبا چوڑا اور صحت مند جسم آکر کھڑا منظر رخ و سفید رنگ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ... لیکن تھوڑی دیر بعد یہ خوب صورت صحت مند جسم خود بخود اس کی نگاہوں میں دھندلا پڑتا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک فوج زدہ ایانچ جسم میں تبدیل ہو گیا۔ ڈبیلے پٹے کال پچکی ہوئی آنکھیں اندر کو دھکی ہوئیں۔ پتلے پھر نے سے محض درجہ کم کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں اور زور سے بند ہو گئیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے کانوں میں شہنائی کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ڈھولک کی آواز پر شادی کے گیت گائی ہوئی لڑکیوں کی آوازیں وہ دیر تک سنتی رہی۔ پھر اس نے دیکھا دروازے پر ایک بہت بڑا بگلا تھا۔ جس کے دروازے سے جمال کے ساتھ ساتھ نوشین داخل بن کر اندر داخل ہو رہی تھی... لیکن صبا نے اپنے آپ کو وہاں اس جگہ میں نہیں دیکھا۔

اس لیے دھیرے دھیرے اپنی بند پلکیوں کو کھول دیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جمال نوشین کو دیکھنے لگی۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک انتظار تھا شاید وہ بے چینی سے صبا کے جواب کے منتظر تھے، یکا یک صبا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پھر تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اپنے کمرے میں اس نے اپنی الماری کھولی اور اس کے اندر سے زیورات کا ایک چھوٹا سا بکس نکال لیا۔ میں ایک وزنی سوئے کا بار تھا جسے لے کر وہ پھر اس کمرے میں آگئی اور نوشین کے قریب آکر بولی۔ ”ٹھوپی ٹھوپی“ نوشین شرما تے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی صبا نے سوئے کا وہ ہار



کراؤ صاف کئے، کیسٹ آف کر کے دوسرا لگا یا اور جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ”ہیلو سویٹ گرل!“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اوہ تو آپ ہیں۔“ اس نے کہا۔
میں نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”علی تمہیں بلا رہے تھے تاکہ تمہیں عابدہ پر دین کا ویڈیو کیسٹ دکھائیں جو تمہارے لیے لے کر آئے ہیں مگر تم شام کی چائے پر بھی بیٹھے نہیں آئیں۔“

میں نے چائے کی پیالی اس کی جانب بڑھائی۔ ”دراصل تم دونوں کی تنہائی میں غل نہیں ہوتا چاہتی تھی ویسے علی بھی بھائی دونوں بعد مگر واپس آئے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔“ اس نے کہا اور بے تحاشا ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ہنسنے کے ساتھ پانی بہنا شروع ہو گیا۔ ”زون! اُسے کھول کیوں نہیں جانتیں!“

میں نے غلو صی دل کے ساتھ مشورہ دیا۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ ”میں تو اسے کھول چکی ہوں لیکن ہر بار طرے جانے کا درد میری راہ روک لیتا ہے یوں وہ پھر ایک نئے سرے سے یاد آنے لگتا ہے۔“ اس نے بے بسی سے جواب دیا تو میں اس کا ہاتھ تھامے خاموش رہ گئی کہ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تھکے تھکے دھوس سے گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اس کے چہرے پر دھند سی چھا گئی۔

احتشام ایک بہت ہی پیاری لڑکی کے ساتھ بیٹھا اُس کریم کھانے میں مصروف تھا۔ وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ میں اس کے قریب آ گئی۔ ”زون! تم ٹھیک ہوتا۔“

”ہاں میں صبح ہوں۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور گاڑی اشارت کر دی۔ مگر آگے وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی اور میں جلتی کر تھی ہوئی بڑی ممانی کے ساتھ کام میں لگ گئی۔ میں علی کی مکتبہ ہونے کے علاوہ زون کی سگی چھوٹی زاوی جوا کھوئی ہونے کے باعث اپنی چھٹیاں ہمیشہ لاہور کے بجائے حیدر آباد

میں گزرا کرتی تھی پچھلے سال کی تو بات ہے! میں حیدر آباد کی تو زون بہت خوش دکھائی دی۔ ”خیر تو ہے، کیا کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے؟“ میں نے فیس کر پوچھا۔

”ہاں، محبت کا خزانہ۔“ اس نے چونک کر جواب دیا۔

”گھر سے؟“ میں اُچھل ہی تو پڑی تھی۔
”احتشام ہے نام اس کا۔“ وہ مسکرائی۔

”مگر یہ ذات شریف ہیں کون؟“ میں نے سوال کیا۔

”وہ پیپا کے دوست کا بیٹا ہے۔ ڈاکٹر بننے والا ہے اور بہت ہی اچھا ہے۔“ زون نے تمام تر شدتوں کے ساتھ کہا تو میں ہنسنے لگی۔

”اچھا بھی دیکھیں گے کہ کتنا اچھا ہے وہ؟“ وہ تجھے اٹھا کر مجھے مارنے لگی۔ ”ارے بھی پیار کیا ہے تو شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“ مجھے اور ہنسی آ گئی۔ ”ہاں خود بھی تو سچی مکتبہ کی کھلاڑی ہیں ویسے آج کل علی بھائی سے بہت راز و نیاز ہو رہے ہیں، خیر تو ہے۔۔۔۔۔؟“

”کیا اسے کھر میں دل نہیں لگ رہا ہے؟“ اس نے مجھ پر چوٹ کی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو پریشان کرتے رہے۔

شام گہری ہوئی جا رہی تھی احتشام بھی نہیں آیا تھا، زون بے قرار پھر رہی تھی۔

”سکون سے بیٹھ جاؤ، ایسے پکڑ لگائے کہ کیا مل جائے گا۔“

میں نے چیخڑا تو وہ مجھے مارنے کو کہی۔ تب ہی گیٹ کھلا اور اس کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے برآمد ہونے والا شخص بے حد وجہ تھا۔ میں نے گھوم کر زون کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر قوس قزح کے سارے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

”احتشام! یہ فرح ہے، کل ہی لاہور سے آئی ہے۔“ زون نے تعارف کیا۔
”میں۔۔۔۔۔“

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ علی نے بات کاٹ لی۔

”آپ احتشام ہیں، میڈیکل کا فاسٹل ایئر ہے، باتیں بہت اچھی کرتے ہیں اور بذات خود بھی بہت امپریس کر دینے والی شخصیت رکھتے ہیں۔“ اس کے بولنے پر احتشام بڑی طرح فیس دیا۔

”تو کوئی غائبانہ تعارف ہو چکا ہے۔“
”جو میں سمجھنے ایک ہی موضوع پر سنا جائے تو لازمی بات ہے تعارف یا دو تو ہوئی جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”بہت خوب!“ اس نے مسکرا کر زون کی جانب دیکھا جو کھسکی ہوئی جا رہی تھی۔
احتشام کے آتے ہی بڑی ممانی یعنی زون کی ای اور علی بھی بالکل ان میں آ گئے۔ یوں گفتگو کا دائرہ کافی منہذب ہو گیا۔

احتشام کے جانے کے بعد ہم دونوں کمرے میں چلے آئے۔

یہاں آتے ہی اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔
”ارے کوئی ہے جو مجھے بجائے۔“ علی نے دروازہ کھول کر مجھے اپنی پناہ میں لیتے ہوئے پوچھا تو میں شرمندہ ہی کھڑی رہ گئی۔

”علی بھائی! اسے لے جائیں یہاں سے ورنہ آج یہ میرے ہاتھوں سے ضائع ہو جائے گی۔“ زون نے چیخ کر کہا۔

”ارے ایسا ظلم مت کرنا ایک میری کلوتی مکتبہ ہے اسے بھی مار دو گی تو تمہارا بھائی کیا کرے گا!“ علی نے سخرے پن سے کہا اور میرا ہاتھ تمام کر باہر چلا آیا۔

”علی! یہ کیا تیزی ہے۔ زون کیا سوچ رہی ہوگی۔“ میں نے جھلا کر اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔
”کچھ نہیں سوچے گی وہ!“ علی نے اور مضبوطی سے میرا ہاتھ تمام لیا میں خشتہ اس س لیے کر رہی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ کافی دیر گزارنے کے

بعد میں اس سے اجازت لیے کر واپس زون کے کمرے کی طرف آ گئی۔ آہستگی سے دروازہ کھولا اور بے پاؤں چلتی بیڈ کے قریب آ گئی۔ میرا خیال تھا وہ سو رہی ہوگی لیکن بیڈ خالی دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ جلدی سے میں دروازہ کھول کر ٹیڑھ پر آئی تو زون وہاں کھڑی مجھے دکھائی دے گئی۔

”تم سوئی نہیں ابھی تک؟“ میں نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا تو وہ مری طرح سے چونک گئی۔

”خیریت!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”پتا نہیں فرح مجھے کیا ہو گیا ہے، شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔ ہر لمحہ کھوے جانے کا، کھڑائے جانے کا خوف سوار ہوتا ہے۔ فرح! اگر اس نے مجھے قبول نہ کیا تو میں کیا کروں گی؟“ زون کے لہجے میں اداسیاں بول رہی تھیں۔

”ارے کیوں ٹھکرائے گا میری زون کو، اتنی پیاری لڑکی اسے کہیں اور ملے گی؟ اور پھر تم کوئی معمولی چیز تو نہیں، مشہور ڈراما نگار اور آرٹسٹ ہو یہ حوالہ کوئی کم ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی اور کمرے میں لے آئی۔

”خدا کرے فرح ایسا ہی ہو جیسا تم کہہ رہی ہو۔“ اس نے بے چینی سے کہا۔

”بیکار وہوں میں اپنا آپ مت الجھاؤ۔“ میں نے کہا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر میں دونوں سو چکے تھے۔

کچھ دنوں بعد میں بھی واپس لوٹ گئی میرے اہم ایس سی کے امتحان ہونے والے تھے۔ زون خط لکھتی تو زیادہ تر ذکر احتشام ہی کا ہوتا اس کی محبت جنوں کی حدوں کو چھو رہی تھی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ویسے ہی مجھے خوف سوار ہوتا جاتا تو وہ دیوانی لڑکی پتا نہیں کیا کرتی تھی۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔
میں حیدر آباد جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی

کھلی کا ٹیلی فون آیا کہ زون شدید بیمار ہے، میں پہلی فلائیٹ سے کراچی آ جاؤں جہاں امیر پورٹ پر وہ مجھے لینے آجائے گا۔ میں تو یہ سنتے ہی حواس باختہ ہو گئی۔ حیدر آباد جتنے تک روٹی رہی اور جب میں نے زون کو دیکھا تو تڑپ کے رو گئی۔ یہ میری زون تو نہ تھی کہ زور، پہلی رگت لے لے لے وہ تھی ویران دکھائی دے رہی تھی۔ ”یہ کیا حال بتا لیا تم نے؟“ میں روٹی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

”مختبوں میں جو لوگ ہار جاتے ہیں، ٹٹ جاتے ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے۔“ وہ اتنا سا جملہ کہہ کر ہی طرح سے ہانپ گئی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟“ میں نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سامنے کیا۔

”مجھ کو کہہ رہی تو ہوں فرخ کہ میں اپنی زندگی ہار چکی ہوں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”لیکن کیوں؟“

”مجھے یقین نہ تھا کہ آدمی کی نگاہ صنف بدن پر تھی۔“ وہ عجیب خواب ناک انداز میں بولی۔ میرے تو جیسے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔

”یہ کیا پاپیولوس میں بات کر رہی ہو، صاف بات کیوں نہیں کرتیں؟“

وہ بے تحاشہ رو اٹھی، میں نے بھی اسے چپ نہیں کرایا، خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد اس نے آنسو صاف کئے اور کہنے لگی۔ ”میں سمجھتی تھی کہ احتشام مجھ سے محبت کرتا ہے، میری عزت کرتا ہے، لیکن وہ تو انسان کے ہمیں میں ایک درندہ تھا جیسے میں اس کے ساتھ گھومنے چلی جاتی ہوں بالکل اسی طرح کسی اور کے ساتھ بھی جاسکتی ہوں جیسے وہ میرا تھ تھا۔ لیکن یہ ایسے ہی کوئی بھی میرا تھ تھا۔ پکڑ سکتا ہے۔ وہ مجھے اپنی محبت بلکہ ایک لڑکی سمجھتا تھا۔ اس کی ذہنیت کے بارے میں نعمان صدیقی نے بار بار بتایا لیکن میں ہر بار مسخرے سے ہنس آگے بڑھ جایا کرتی تھی۔ لیکن اس دن مجھے بچانے والا بھی وہی تھا۔ میں احتشام کے ساتھ بیٹھی

تھی کہ وہ میرے پاس آ گیا، اس وقت احتشام کی کام سے اندر چلا گیا۔

”زون! تم کل احتشام کے ساتھ نہیں مت جانا۔“ اس نے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ میں نے پوچھا تو اس نے جواب میں ایک کیسٹ میرے ہاتھ میں تھما دی اور خود واپس اپنی جگہ پر چلا گیا۔ میں ابھی گھر واپس آئی، اور آتے ہی میں نے کیسٹ پر پکاڑ کر میں کیسٹ لگایا کہ سنو اس میں کیا ہے کہ احتشام کی آواز ابھری۔

”مجھے زون جیسی لڑکی سے شادی کرنی ہوتی تو میں اپنی مٹی کی پسند سے شادی نہ کروں؟ ویسے بھی بار، یہ امیر گھرانوں کی ماڈرن لڑکیاں کچھ میرے حلق سے نہیں اترتیں۔ ہر کوئی تو ان کا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ روپے کے نام پر گھلے میں مظل جموں ہا ہوتا ہے اور شرم و حیا کا نام لیا جاتا ہے۔“

”لیکن باز ہم تو سمجھ رہے تھے کہ تم زون سے محبت کرنے لگے ہو؟“ یہ اس کے پچھلے دوست کی آواز تھی۔

”محبت اور زون سے! نہیں، مجھی، محبت ان جیسی لڑکیوں سے نہیں ہوتی بلکہ وہ تو اور ہی ہوتی ہیں جن کو دیکھتے ہی دل محبت کی بیج پڑھنے لگتا ہے۔“

احتشام کی آواز میں مسخر تھا۔ ”تو پھر کل کا پروگرام سیٹ ہے؟“ اس کے دوست نے پوچھا۔

”ہاں کل میں زون سے مل کر اپنے آپ کی گاؤں جاؤں گا، پھر.....“ آگے جو کچھ تھا وہ سب میرے لیے انتہائی ناقابل برداشت تھا۔

میں سکتے کے عالم میں تھی کہ نعمان کا ٹیلی فون آ گیا۔ ”مجھے اُمید ہے آپ نے وہ سب سن لیا ہوگا؟“

اس نے کہا ”ہاں..... میں سن چکی ہوں۔“

میں نے یہ مشکل کہا اور اپنے سامنے رہی نیند کی گولیاں گنتا شروع کر دیں۔

”دیکھیں زون! آدمی کسی کے بڑا کہہ دینا ہے بڑا نہیں ہو جاتا۔ آپ ایک اچھی لڑکی ہیں۔ اسے

بھول کر اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کر لیں۔ بہت سے لوگ آپ کو ملیں گے جو آپ سے محبت بھی کریں گے۔ آپ سن رہی ہیں نا؟“ اس نے پوچھا تو میں نیند سے بوجھل آنکھیں کھولنے لگی ”زون! کیا ہوا ہے آپ کو..... جواب کیوں نہیں دے رہی ہیں۔“ وہ چلایا مگر میں اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔

پھر ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو ہاسپٹل میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ”زون! کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“ علی بھائی پریشان کھڑے تھے۔

”کچھ نہیں بھائی!“ میں تھابت سے بولی۔

”وہ تو خدا کا شکر ہے بیٹا جو عالیہ آگئی، اسے شاید تم سے کوئی کام تھا۔ وہ تمہارے کمرے میں آئی تو تم بے سندھ پڑی تھیں تب گھر اکہم تمہیں ہاسپٹل لے آئے۔“ علی نے مجھے پیار کرتے ہوئے تفصیل بتائی تو میں نے گروت بدل لی۔

تھوڑی دیر میں جب چلے گئے۔ میرے پاس کسی کو بھی رہنے دا تھا بلکہ وہ میرے پاس بیٹھی تھی کہ نعمان اندر چلا آیا۔ ”کیا حکایت کی آپ نے؟“ اس نے مجھے گھورا۔

”بس آج مجھے معلوم ہو گیا کہ ٹوٹے ہیں تو لوگ نیند کی گولیاں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سو میں نے بھی مکمل ٹیبل اختیار کیا۔“ میں نے دیر سے سے کہا۔

”مجھے آپ کی آواز سن کر اندازہ ہو گیا تھا اس لیے میں نے عالیہ کو فون کر کے ساری صورت حال سمجھائی، یوں عالیہ آپ کو لے کر ہاسپٹل آئی ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔“ نعمان نے فکرمندی سے مجھے دیکھا۔

”کیا ہوتا مر جاتی میں اور بس!“ میں بے دلی سے بولی۔ ”اچھا بس زیادہ بکواس مت کرو اس لیے تم نے میڈیکل لائن اختیار نہیں کی کہ تمہارا بیٹا ڈرامائی انداز جو ختم ہو جاتا، عالیہ نے میری بات کا پیو میری دوست ہونے کے علاوہ احتشام اور نعمان کے ساتھ ہی ہاؤس جاب بھی کر رہی تھی اور یوں میں موت سے

بھی ٹھکرادی گئی، تب سے میرے اندر..... میں نے اُنک ہے اور نہ آگے بڑھنے کی تمنا، بس میں..... چاہتی ہوں۔“ زون نے اپنی بات مکمل کرتے۔ ”میری جانب دیکھا تو میں اپنے آنسو نہ روک سکی۔“

”زون! آؤ اسنے ڈکھ چھل گئی اور مجھے نرکت نہ ہوئی۔“ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ وہ خوف زدہ چڑیا کی مانند میرے بازوؤں میں بچھی ہوئی تھی۔ وہ روتے ہوئے میری گود میں سر رکھے سوچتی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے بندر لٹایا اور کل اوڑھا کے باہر جانے لگی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے ریسپورڈ اٹھایا تو دوسری جانب نعمان صدیقی تھا۔ ”مجھے زون سے بات کرنا ہے۔“

”وہ سوچ لے۔“ جواب دیا۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں فرخ ہوں..... شاید آپ مجھے نہ جانتے ہوں لیکن میں آپ کو جانتی ہوں آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”جی میں سمجھا لیں.....“ وہ الجھ رہا تھا۔

”نعمان آپ نے میری پھول پھٹی زون کو اس درندے کی سمیٹ چڑھنے سے بچالیا، احسان مانوں وہ کم ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”احسان نے کہیں پلیز کہ اس میں میری غرض بھی شامل تھی۔“ اس نے کہا۔

”غرض کسی؟“ میں نے پوچھا۔

”احتشام دراصل میرا دوست ہی نہیں بلکہ بہت ہی پیارا کزن بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی معصوم کی افسوس آ جاوے اور یوں وہ قیامت تک کے لیے اس کی بددعاؤں کی زد میں آ جائے۔ سو میں نے زون کے ساتھ اسے بھی بچایا ہے۔“

نعمان نے جواب دیا تو میں گھر اسالیں کے گھر گئی اور خدا حافظ کہہ کے ٹیلی فون بند کر دیا۔

پھر میں نے دن رات ایک کر کے اسے اس قابل کیا کہ وہ اٹھ کر ہمارے درمیان آ جاتی، رات گئے تک کھنے میں مصروف رہتی یا ڈراما وغیرہ دیکھنے

چلی جایا کرتی۔

احتشام نے اس دوران بہت ٹیلی فون کیے بار بار وہ گھر میں آیا لیکن زون ایک بار بھی اس سے مخاطب نہ ہوئی بلکہ نفرت سے اسے دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہوئی۔ وہ مجھ سے پوچھتا۔ ”کفر فرج!“ یہ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟“ تو میں اسے دیکھ کے رہ جاتی۔ دل تو چاہتا کہ اس کا منہ نہ توچ ڈالوں، مگر زون کی قسم مجھے بے بس کر دیتی۔ اس نے کہا تھا کہ احتشام کو یہ احساس مت ہونے دینا کہ مجھے اس کی ذلالت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ جب وہ جان جائے گا تو اس کی آنکھوں میں رنج مندی کا احساس نمایاں ہو جائے گا جو میں برداشت نہ کر پاؤں گی سو میں پپ رہتی۔ آخر تنگ ہار کر اس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔

مجھے یہاں آئے ہوئے کافی عرصہ ہو چلا تھا تب ہی گھر میں میری شادی کا شوشا اٹھ کھڑا ہوا، یوں میں واپس لاہور آئی جہاں سے ٹھیک چھ ماہ کے بعد مسر علی بن کر حیدر آباد چلی آئی۔

میری شادی میں زون نے بھرپور حصہ لیا لیکن اس کی کیفیت مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا کہ اس کی ہسی کے ساتھ جو پائی آنکھوں سے پرہا ہے وہ پانی نہیں درحقیقت آنسو ہیں۔ جیسے وہ بیدردی سے لپا رہی ہے۔ تب سے اب تک وہ بالکل نارمل نہ ہو پائی تھی۔ میں سوچوں سے گھبرا کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔

علی کے دوست کی تھی، میں نے زون کو بھی زبردستی اپنے ساتھ کھینٹ لیا۔ ”آخر یہ تم دونوں مجھے کیوں کہاں میں بڑی ثابت کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے جل کر میرے ایک ہاتھ مارا۔

”اس لیے بہنا کہ تمہیں احساس دلائیں کہ زندگی اس روپ میں بے حد حسین ہے۔ تم بھی اپنی زندگی کو حسین بنا لو۔“ میں نے جواب دیا۔

”فرج تم بھی اچانکے ہو مجھے کھلیفہ دے رہی ہو؟“ اس نے شاکی نگاہوں سے میری جانب دیکھا تو میں نظریں بڑا کر علی کی جانب بڑھ گئی۔

شادی میں سب نے زون کو ہاتھوں ہاتھ لیا

جس کی وجہ اس کا اسٹیج ڈراما تھا جس میں اس کی اداکاری اور اسکرپٹ تھا وہ لوگوں میں گہری آلو گراف دینے میں مصروف تھی کہ میری نگاہ احتشام پر پڑ گئی جو سب سے ملتا ملتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر زون کی جانب دیکھا جس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ”ہیلو زون! کیسی ہو؟“ وہ اس کے قریب آ گیا۔ سب لوگ ان طرف متوجہ تھے۔

”ٹھیک ہوں!“ زون نے خشک ہوتے یوں پر زبان پھیری۔

”پہری ٹھیک تر سے ملیں؟“ اس نے پوچھا تو زون نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”بہت خوب صورت ہے وہ!“ احتشام نے کہا اور ایک لڑکی کو زون کے پاس لے آیا۔ ”ان سے ملو شاید یہ اسے مشہور ڈراما نگار اور آرٹسٹ زون شاہ!“ اس نے تعارف کرایا۔

لڑکی بلاشبہ بے حد حسین و نازک تھی۔ مجھے آپ سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ دیر سے مسکرائی۔

زون اس سے باتیں کرتی تھی لیکن اس کا بدن لرز رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو چکی والی ہے۔ میں راستہ بتاتی اس کے پاس آنے لگی کہ مجھ سے پہلے ہی کوئی شخص اس کا ہاتھ تمام کر جوہم سے نکال لے گیا۔

میں حیران سی ان دونوں کے پیچھے چلی آئی۔ جو باہر پارکنگ ایرے کی جانب گھرے تھے۔ ”آپ کی تعریف؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نعمان صدیقی کہتے ہیں۔“ وہ میری طرف مڑا۔ اُونچا لمبا دلچسپ سا شخص مجھے پہلی نگاہ میں بہت اچھا لگا۔

پھر میں زون کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ”کیا ضرورت تھی اس فضول شخص سے بات کرنے کی، بہانا بنا کر نہیں مٹ سکتی تھیں؟“ میں نے اسے ڈانٹا۔

”کیا بہانہ کر رہی؟“ اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا تو میں چپ ہو گئی۔

”ہاں اب بتائیں“ نعمان نے مخاطب کیا

”اچھا خیر، ویسے آپ کا شکر ہے جو آپ نے اسے وہاں سے ہٹایا ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں یہ بے ہوش نہ ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

”آپ نے ہر بار شکر یہ ادا کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے؟“ نعمان نے کہا۔

”اور آپ نے ہر بار زون کو بچانے کا ارادہ کیا ہوا ہے؟“ میں نے اسے گھورا۔

”بہتر ہوگا ہم دونوں پر موضوع بدل ڈالیں۔“ اس نے شاید زون کی آنکھوں میں چمکنے آنسو دیکھ لے تھے تب ہی بات کا رخ بدلنے لگا۔

”سنیں آپ زون کو گھر ڈراپ کریں گے؟“ میں نے دور سے علی کو آتے دیکھا تو جلدی سے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن فرح!..... میں ٹھیک ہوں۔“ زون نے کھمسا کر کہا۔

”کیا اس بلکے اور اور جلدی سے گھر چلی جاؤ۔ میں تمہیں مزید اسے درمیان بڑی نہیں بنا سکتی۔ آخر تم میرے او ر علی کے درمیان براجمان رہنا چاہتی ہو؟“ میں نے ممنوعی غصے سے کہا۔

”تو یوں کہوں تا سچ علی کی بیگم اپنے صاحب کے ساتھ تیار ہونا چاہتی ہیں۔“ زون کہی۔

”ارے بھئی کون کس کے ساتھ رہ رہا ہے؟“ علی نے کہا۔ ”بھائی! یہ آپ کی بیگم صاحب چاہ رہی ہیں کہ میں گھر چلی جاؤں۔“ زون نے کہا۔

”اچھا یہ گستاخی ہماری بہن کی شان میں!“ علی میری جانب گھومے۔

”جانے دس نا علی یہاں رہ کر یہ پور ہو رہی ہے اور پھر یہ کرے گی بھی کیا؟ میں تو آپ کے ساتھ ہوں گی۔“ میں نے کہا تو علی میری کیفیت دیکھ کر جان گئے کہ میں کیا چاہ رہی ہوں۔ ویسے بھی وہ احتشام کو دیکھ چکے تھے۔ انہیں سچ معلوم نہ تو تھا لیکن یہ ضرور سمجھ گئے تھے کہ زون کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ احتشام ہے سو انھوں نے زون کو جانے کی اجازت دے دی۔

میران ذہن جست مارچ 2015

”تم اندر جاؤ میں زون کو چھوڑ کر آتا ہوں۔“ انھوں نے کہا۔

”زون کو یہ گھر ڈراپ کر دیں گے۔“ میں نے نعمان کی جانب اشارہ کیا تو علی نے میری جانب سو الیہ انداز میں دیکھا۔ ”ارے آپ بھول گئے، یہ ڈاکٹر نعمان ہیں جنھوں نے زون کا ٹریٹ منٹ کیا تھا۔“ میں نے یاد دلائی کر لی۔

”اوہ سوری ڈاکٹر! میں بالکل ہی بھول گیا تھا۔“ علی نے گرجوٹی سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ دونوں گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ میں اور علی کھڑے اُنہیں دیکھتے رہے۔

جب گاڑی لگا ہوں سے اوجھل ہوئی تو میں علی کی جانب بڑھی۔ ”علی یہ ڈاکٹر اچھا ہے نا! کاش زون بھی اسے پسند کرے۔“ میں نے کہا۔

”پتا نہیں اس سر پچری لڑکی کو کب عقل آئے گی۔“ علی نے ٹھنڈا سا سانس لیا اور میرا ہاتھ تھامے ہوئے اندر ہال میں آ گئے۔

گھر واپس آئی تو زون اپنے کمرے میں تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”خیرت تو ہے؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”فرح اوہ گھر رہا تھا کہ میں وہ باب بند کردوں اور کسی کا ہاتھ تھام لوں۔“ زون بولی۔

”تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟“ میں نے موقع مناسب جان کے کہا۔

”لیکن فرح! میں اپنے آپ کو کیسے مطمئن کروں۔ میں جو پھولوں سے ٹھیکوں سے محبت کرنے والی افسانوی سی لڑکی ہوں، کیسے اس بات پر آمادہ ہو جاؤں کہ سامنے والا جو بھی ہے اس سے تھوٹ بولتی رہوں۔ کہتی رہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے جبکہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔

”دیکھو زون! ضروری نہیں ہے کہ جو دل پر پہلی بار دستک دے ہمیں اس محبت بھی ہو جائے حالانکہ ایسا محسوس ضرور ہوتا ہے جیسے ہمیں محبت ہوگی ہے

میران ذہن جست مارچ 2015

لیکن جب وہ شخص دور ہو جائے ہمیں نڈل سکے اور نہ ملنے کے باوجود ہم زندہ رہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہم نے محبت نہیں بلکہ ایک وقتی جذبے کے تحت اپنی ہار مانی تھی۔ اری پاگل! محبت تو آبِ حیات ہے جو دلوں کے درمیان بہتی ہے اور اپنا آپ خود بخود ملتی ہے مجھے یقین ہے کہ ایسی محبت تمہارا راستہ ضرور سنے گی جب تم اپنے دل سے مجبور ہو کر اس کا اقرار کرو گی، اس کی چابی کو مان جاؤ گی اور جان! محبت ہر ایک کا نصیب بھی نہیں ہوتی اور جب کسی کا نصیب بنتی تو وہ شخص خوش قسمت ہوتا ہے۔ میں نے بے حد پیار سے اس کے کمرے ہوئے بال سینتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
”ہوتا کیا ہے، وہی مصیبت شادی کب کر رہی ہیں۔۔۔۔۔ میں پوچھتی ہوں آخر ان لوگوں کو تکلف کیا ہے میرے شادی نہ کرنے سے؟ میری زندگی ہے پیسے چاہوں گزراؤں!۔۔۔۔۔“ وہ نرمی طرح سے جھلا اگی۔
”بھئی یہ دنیا ہے اور جب ہم دنیا میں رہتے ہیں تو لوگوں کے سوالوں کا ہمیں جواب دینا ہے۔“ میں نے حثایت سے کہا۔

”اور لوگوں کو تو پھوڑیں وہ ہمارے پروڈیوسر صاحب بھی اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ میں ان کا کنٹرولنگ وپن ٹیکہ کر آتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔
”اچھا نہیں کیا زون تم نے اس طرح سے تم دنیا کی زبان کو خاموش نہیں کر سکتیں۔“ میں نے تلافی سے کہا۔

”اچھا ہو یا نہیں کچھ نہیں جانتی۔“ اس نے جھجھکی اور اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔
اس پروڈیوسر کے ٹیلی فون آئے، معافی مانگی لیکن زون اپنی ضد پر قائم رہی کہ مجھے نہیں کرنا۔ سب نے سمجھا لیکن اس نے کسی کی ہتھیاری سوتھک ہار کے خاموش ہو گئے۔

اور پھر اسی دنوں ایک عجیب بات ہوئی کہ زون کو مانگتے نعمان کے کمرے والے چلے آئے۔ وہ خود بھی ساتھ آیا تھا۔ نعمان کی امی نے اپنی شائستگی سے بات کی کہ بڑی ممانی تو ان پر خدا ہو گئیں اور انہوں نے فصلہ کر لیا اس بار وہ زون کی ہرگز بھی نہیں مامین کی زون کو معلوم ہوا تو وہ پہلی پڑ گئی اور نعمان کی بہنوں سے معذرت کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ نعمان نے بے چینی سے میری جانب دیکھا تو میں سر جھکا کے رہ گئی۔ فرصت ہوتے ہوئے وہ میرے قریب چلا آیا۔

”فرخ! میں ایک معمولی سا انسان ہوں لیکن

محبت کی دولت سے مالا مال ہوں اور آپ یقین کریں میں زون کو بہت خوش رکھوں گا، آپ اسے بس راضی کریں۔“ اس نے کہا تو میں اسے دیکھ کے رہ گئی۔
”میں۔۔۔۔۔ میں اس محبت کرتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ وہ خود اذیتی کی کیفیت سے باہر نکل آئے۔ آخر وہ کسی اور کی سزا مجھے کیوں دینا چاہتی ہے۔ اس سے کہیے گا کہ نعمان اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں پر جمع کرنا چاہتا ہے۔“ نعمان نے جذبا تی لہجے میں کہا اور وہاں مڑ گیا۔ میں تجھے کھٹکے قدمو ل سے چلتی گھر کی جانب آ گئی۔

میں خود زندگی اس کو موڑ رہی تھی پھر زون پر تو یہ کیفیت گزر رہی تھی نہ جانے وہ کیا محسوس کر رہی ہوگی؟ میں سوچتی رہی! ابھی ری لیکن خود میں بہت نہ پاسکی کر رہی تھی کہ اسے سامنے چلی جانی۔
ساری رات وہ سوچتی رہی۔ اس کے کمرے سے تیز آواز میں ڈیک بچے کی آوازیں آتی رہیں مگر اپنے کمرے میں بیٹھی آٹھ گالے وقت کے لیے خود کو تیار کرتی رہی۔

دوسرے دن میرے اٹھنے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ دوپہر کو بھی اس کی واہی تھی۔ بچے نے ٹیلی فون آ گیا کہ وہ ڈرائیو کی سہرسل میں مصروف ہے اس لیے شام تک آنے کی اور جب وہ آئی تو میں غلی کے ساتھ اُن کے یونٹ کی گریڈ پارٹی میں جا چکی تھی، یوں ہم دونوں کا سامنا نہیں ہو سکا۔

رات گئے میں وہاں آئی تو اس کے کمرے میں خاموشی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ سوچتی ہے۔ تیسرے دن نعمان کا ٹیلی فون آیا۔ ”آپ نے زون سے بات کی؟“ اس نے بتائی ہے پوچھا۔
”مجھے کوئی مناسب وقت نہیں ملا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے پھر میں خود آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔
میں کھرا ہٹ کے عالم میں باہر جا کھڑی

ہوئی۔ ذرا ہی دیر میں وہ آ گیا۔ ”نعمان! وہ دیر پس ہے زیادہ پریشان مت کرنا۔“ میں نے منت کی۔
”میں بھی بہت پریشان ہوں! اس نے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو میں چپ ہو گئی اور اسے لیے زون کے کمرے کے سامنے آ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ لکھنے میں مصروف تھی۔

”زون!“ میں نے اسے آواز دی۔
”کیا ہے؟“ اس نے سر اٹھائے بغیر تیزی سے لکھتے ہوئے کہا۔
”یہ۔۔۔۔۔ نعمان تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس کے ہاتھوں سے پتھن جھوٹ گیا اور بوکھلا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”میں کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔“ اس کی آواز کانچائی۔ کالے کپڑوں میں بیٹوں وہ بے حد اداس دکھائی دے رہی تھی۔

”لیکن زون! میں اپنی بات کہے بغیر یہاں سے جاؤں گا نہیں۔“ نعمان قدم بڑھا کے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا میں نے موقع غنیمت جانا اور کمرے سے باہر نکل آئی اور دروازے سے لگ کر اندر کا منظر دیکھنے لگی۔ ”زون جب میں نے جھپٹیں بجا با تو میرے ذہن میں سوائے ہمدردی کے اور کچھ نہ تھا لیکن پھر ٹیکٹن راشدی کی شادی میں جھپٹیں روتا ہوا دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ پاسکا اور جھپٹیں دہاں سے نکال کر جب میں نے تم سے کہا کہ یہ میٹر بنکر کے کسی اور کا ہاتھ تمام لو تو اس سے میرے دل نے کہا کہ کسی اور کا کیوں، میں خود آ رہا تھا کیوں نہیں تمام لیتا۔ اس وقت مجھے اعزاء ہوا کہ مجھے تم سے ہمدردی نہیں بلکہ محبت ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ خدا ازون! مجھے کسی اور کے حصے کی نفرت نہ دو۔“ اس نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

”کاش کہ نعمان تم میرے لیے اجنبی ہوتے اور میں تمہاری بات مان لیتی لیکن نعمان! تم تو اس شخص کے کزن ہو، دوست ہو اس کی ٹیکٹیں سے پوری طرح واقف ہو، یہ بھی جانتے ہو کہ اس نے کس بڑی

دوست آن باشکے انور خواجہ

عبدال کے پورے جسم میں جھرجھری
دوڑگنی لیکن اس نے بھابی کی ڈانٹ
ذہن سے نکال دی اور زینو کے متعلق
سوچتا ہوا آہستہ آہستہ اپنی کوٹھری
کی طرف چلا گیا۔ اگر مجھے موقع مل
جائے تو میں زینو کو مشین والی
کرسیوں کی سیر کرائوں۔

اردو ادب سے انتخاب..... ایک حساس تحریر

یہاں سے اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔
زمین اب بھی اس سے خاصی دور تھی۔ مگر وہ
چلا لگا لگا تو اس کے ہاتھ پاؤں ڈھکی ہونے کا
خطرہ تھا۔ وہ ایک جست لگا کے ایک مضبوط شاخ
پر آگیا۔ یہاں سے اس نے ایک لمبی چھلانگ
لگائی اور عبدال کے پاس پہنچ گیا۔
عبدال پک ڈنڈی پر ایک چوڑی چٹان کا
سہارا لیے بیٹھا تھا۔ بندر نے آدھی کھائی ہوئی

دیودار کے بلند بالا درخت کی چوٹی پر
ایک تازہ بندر بیٹھا تھا۔ اس نے جنگلی
ناشا پکڑنے کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹا اور اسے الٹ
لیٹ کے دیکھنے لگا پھر وہ اسے دانٹوں میں دبا کے
اچھل کے چلی شاخ پر آیا۔ یہاں اس نے قریب
کی ایک جنگلی شاخ پر کھڑا کیا۔ یہ اندازہ لگایا کہ یہ
شاخ اس کا وزن سہار سکے گی یا نہیں پھر وہ اس
کے ساتھ جمبول کر ایک موٹی شاخ پر ٹک گیا۔

”نعمان! مجھے تم سے محبت ہے۔“ اس کے لب
کاٹنے تو نعمان کے ہاتھ سے ڈرپ چھوٹ گئی۔
”مجھے بھی تم سے بہت محبت ہے زون مگر یہ کیا
کر ڈالا تم نے..... تم مجھ سے دور ہو رہی ہو اور میں
تمہیں روک بھی نہیں پارہا۔“
نعمان کی آنکھوں سے آنسو گر کر زون کے
چہرے پر پھیل گئے۔

”میں تم سے دور نہیں بلکہ تمہارے دل میں
زندہ رہوں گی نعمان کہ محبت کبھی نہیں مرنی زندہ رہتی
ہے اپنے محبوب کی صورت میں۔ تمہارا تو مجھ پر
احسان ہے کہ تم نے مجھے کبھی محبت کے ذائقے سے
آشنا کروایا۔ گزشتہ مانی لو.....“ اس کی آواز
محدوم ہو گئی۔ چپکتی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

کمرالوں سے بھر گیا۔ ملے عورتوں سے ہونے بڑی
ممانی اور ماموں کو لے کر باہر چلے گئے۔ میں نے
اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو گڑا کر شاید کوئی آنسو میرے
اندر کی جگہ کو کم کر سکے لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں آہستہ
قدموں سے اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔
پلٹے سانسے ہی زون کا بند تھا جس کے سر ہائے نعمان
بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اور زون کے ہاتھ نے اس کا ہاتھ اچھی تک تھاما ہوا تھا
میرا دل کراہ اٹھا اور میرے اندر سے آنسوؤں کا
طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ نہ جانے کب تک یہ لڑکے معصوم
لڑکیوں کے دلوں سے کھینچے رہیں گے؟

طیلس جبران کہتا ہے کہ مارے والے کو بھائی
کی سزا ہوتی ہے لیکن میرا بس طے تو ان لوگوں کو سولی
پر چڑھا دوں جو لوگ دل توڑتے ہیں اور دنیا کی کوئی
عدالت انہیں مجرم نہیں مانتی، ایسا ہی ایک مجرم اشتہام
بھی تو تھا جس نے پھولوں کی نازک دونوں کواں بری
طرح سے روند کر وہ اپنی زندگی ہی ہار گئی اور ساتھ
میں ایک شخص کو محبت کا کرب عطا کر گئی جو کوئی غیر نہیں
اس کا پتا محبوب تھا اس کی محبت تھا اور شاید یہی محبت
جو ہر لمحے ہر وقت نہ جانے کتنے رنگ بدلتی ہے۔

.....

سے صلاح مشوروں میں معروف تھا رات بھر نہ
سونے کے باعث وہ ندری طرح تھکا ہوا ہونے کے
باوجود اپنے آپ کو سنبالے کبھی علی کو سمجھاتا تو کبھی
بڑی ممانی کے بیٹے آنسو روکنے کی کوشش کرتا۔ رات
ہونے والی تھی، ہم سب کو بڑے آمدے میں بیٹھے ہوئے
پتا نہیں کتنے کھنکھنے کڑے تھے لیکن کوئی احساس نہ
تھا بس ایک ٹک سب اس شیشے کی دیوار کو دیکھ رہے
تھے جس کے پار ہم سب کی زندگی موت کی کنگش میں
جلا جاتی۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ایک دم پچھل
سی ہوئی نعمان تیزی سے اندر بھاگتا کہ زون کو ہوش آ رہا تھا
یہ خبر سنتے ہی ہم سب پر امید ہو گئے دروازہ کھلا
ڈا، کٹر عالیہ نے باہر جھانک لیں اٹھ کھڑی ہوئی۔
”زون کو ہوش آگیا؟“ میں نے پوچھا۔

”فرح! تم جا کر اس سے مل لو لیکن یہ یاد رکھنا
کہ شمع بجھنے سے پہلے ایک بار پوری آب تاب کے
ساتھ روشن ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر عالیہ کے یہ الفاظ مجھے
ہوش کر گئے۔

”جاؤ جلدی اس کے پاس وقت نہیں ہے۔“ عا
لیہ نے مجھے اندر دھکیلا۔

میں لڑکھائی ہوئی اندر آئی۔ نعمان اس کے
نزدیک ہی کھڑا ڈرپ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی
آنکھوں میں مجھے دیکھ کر چمک آگئی۔ ”فرح! تم نے صبح
کہا تھا محبت اور پسند میں بہت فرق ہوتا ہے اور اب
میں نے یہ فرق جان لیا ہے، میری محبت تو نعمان تھا جب
ہی تو میں اس کو اپنی خاطر زلت نہ دے سکی۔ میں نے
سوچا تھا کہ اگر یہ مجھ سے نفرت کرنے لگے تو میرا دل بند
ہو گیا ہے۔ نعمان کی فرقت کے تصور نے ہی اس حال پر
پہنچا دیا۔ اگر حقیقت میں ایسا ہوتا تو پتا نہیں کیا کرتی۔“
وہ یہی طرح سے ہانپ رہی تھی۔

”تم بولو نہیں زون!“ میں نے اسے خاموش
کرنا چاہا۔

”کتنے دو مجھے!“ اس نے کہا اور بہ مشکل تمام
اپنے ہاتھ پر رکے نعمان کے ہاتھ کو تھام لیا جو بے قراری
سے ڈرپ کے لئے سوئی لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔



چڑھ دیا اور شہوت کے بڑے بڑے درخت اگے ہوئے تھے۔

درختوں کے دامن میں طرح طرح کے جنگلی پودے تھے اور طرح طرح کی چھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ چھاڑیاں بے حد گھناہیں۔ ان کی وجہ سے کھائی کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ سورج کی کرنیں چھاڑیوں تک مشکل سے پہنچ پاتی تھیں۔ سارے جنگل پر ایک سایہ دار خضہ چھائی رہتی تھی۔ سورج دور چھاڑیوں کی چوٹی کے پیچھے اتر رہا تھا۔

فضا بندروں کی چیخوں اور پرندوں کے چھپوں سے گونج رہی تھی۔ نیچے کھائی کی گہرائی سے دھند کا گاڑھا کثیف دودھیا دھواں آہستہ آہستہ اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عبدل کو پیک ڈیڑھ کی زمین کی کئی عجیب سی صورتیں کہیں چلو تھر کے سوئی دار پتوں کا فرش اچھا ہوا تھا۔ اس پر سے پاؤں اکثر پھسل چلا تھا۔ اس لیے عبدل ہرجا کر دم بھر رہا تھا۔

مونا بندر اس کے آگے پیچھے اچھلتا کودتا ہوا چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد عبدل نے دیکھا کہ پودوں اور چڑھ کے درختوں پر بیٹھے ہوئے بندر انہیں دیکھ کر نیچے اترنے لگے۔ مہر نے بندر نے انہیں گھور کر دیکھا تو کسی نے عبدل کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس سے ڈرنا سلسلے پر درختوں اور منڈیروں پر اچھلتے کودتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

کوئی بندر پیچھے رہ جاتا تو کوئی دوسرے درخت پر چلا جاتا یا کوئی پھٹکی شاخ پکڑ کے جھوٹا ہوا عبدل سے آگے نکل جاتا۔ کوئی شہر بندر چڑھ کے درخت سے چڑھ کا بیڑیوں شکل کا سبز چٹل گھٹکا تو ڈر کر اس کی طرف پھینکتا۔ کبھی عبدل گھٹکا پکڑ لیتا۔ کبھی وہ اس کے ہاتھ سے کسی پتھر پر گر کے پھٹ جاتا اور اس میں سے گندہیر دا بہنے لگتا۔ عبدل بندروں کی جلیو جلیو خوش خوشی ترانی

بٹنگ ہاتھ بڑھا کے عبدل کو پیش کی۔ عبدل نے مسکرا کے بٹنگ لے لی اور جہاں بندر کے دانت نہیں لگے تھے وہاں سے ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹا۔ بانی بٹنگ بندر کو واپس کر دی۔

بندر نے بٹنگ لے کر اپنے سر کو ادھر ادھر جنبش دی جیسے عبدل سے پوچھ رہا ہو۔ ”بس اور نہیں کھاتے؟“ عبدل اس کی طرف دیکھ کے دوبارہ مسکرایا۔ بندر نے جواب میں اپنے دانت نکال دیے پھر اپنے تیز دانت بٹنگ کے گودے میں گاڑ دیے اور پھر کچرا اسے کھانے لگا۔ بٹنگ کھا کے وہ اپنے دونوں ہاتھ اور دونوں بیروں پر عبدل کے آگے پیچھے ٹھٹھنے لگا۔ اس نے اپنی بھوری دم اٹھائی ہوئی تھی۔

ٹھٹھٹھنے والے وہ عبدل کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے اپنی کمر عبدل کے ساتھ لگا دی۔ عبدل پیار سے اس کی کمر سہلانے لگا۔ بندر کا جسم بہت مضبوط ہر ریشہ اور ہر پٹھا کسا ہوا تھا۔ اس کے سارے جسم پر بھورے بھورے بال تھے لیکن سرخ سرخ کلبوں پر بال نہیں تھے۔

”بڑا اچھا بیٹا ہے لیکن ذرا لالچی ہے۔ بھلا جنگلی بٹنگ کھانے کی کیا ضرورت تھی۔“ عبدل نے اس کی کمر تھپتھپا کے کہا۔

بندر نے بڑے خرے سے پلٹ کے اسے دیکھا اور اس طرف آنکھیں منکنا لگا جیسے جملے کا مفہوم سمجھ گیا ہو۔ عبدل نے اسے ایک زور کا دھپ رسید کیا۔

”چلو بیٹا! گھر چلیں۔“

عبدل نے ترم کی لکڑی کا بھورا ڈنڈا اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ ڈنڈے پر کانٹے اچھرے ہوئے تھے۔ اس کی ضرب بہت کاری ہوئی تھی۔ وہ گیدڑوں اور جنگلی کتوں کو پیسنے کے کام آتا تھا۔ بندر عبدل کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ دونوں ایک ڈیڑھ سے ترائی کی طرف چڑھنے لگے۔ ان کے بائیں طرف کئی سو فٹ گہری کھائی تھی۔ کھائی میں

کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اچانک کھائی کے پار اس کی نظر بائیں لائن والی جتنی سڑک پر پڑی۔ یہ سڑک ڈونگا گلی اور خالص پور کو ملاتی تھی۔ وہ ٹھنک کے کھڑا ہو گیا۔ اس کا بھائی زمان خان اپنی بیوی کے ساتھ جا رہا تھا۔ زمان خان سواری کھدر کی شلوار تھیں اور لمبا سا پنڈا گرم کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اس کے پاؤں میں ریڑ کے تلوں کے جوتے تھے۔ سر پر اونچا زری کا کلاہ تھا۔ کلاہ کے گرد مشہدی لکڑی بندھی تھی اور اس کا شملہ مور کے پروں کی طرح اس کی پیشانی پر پھیلا ہوا تھا۔ زمان کپڑے کیسے ہی پہنے کلاہ اور لکڑی کے سلسلے میں خاص اہتمام کرتا تھا۔ کلاہ ہمیشہ زری کا ہوتا اور کسی کسی چھتیکڑے کی ہوتی۔ اسے وہ تنھیا گلی کے دھوپوں کے کف لکھا کے لاتا تھا۔

عبدل کی بھانجی ان کے بھائی کی طرح لمبی اور مضبوط بدن کی شہرت تھی۔ وہ چھنٹ کے کل دار کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بدن کے گرد ایک کالی موتی چادر لپی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی شاید سودا سلف لینے کے لیے ڈونگا گلی پہنچے تھے۔ وہ نہایت تیز چل رہے تھے تاکہ اندیرا ہونے سے قبل اپنے گھر پہنچ جائیں۔ ان کا کھر خالص پور کے پاس تھا۔

عبدل سخت بے تاب ہو گیا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے بھائی کو آواز دے اور دوڑ کر اس سے لپٹ جائے لیکن پھر اسے اپنے بھائی کے مظالم یاد آ گئے۔ اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جھلی سی بن گئی۔ اسے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں اور ان کی طرف سے پیٹھ موڑ کر اوپر بڑھنے لگا۔

مونا بندر عبدل کو غمگین دیکھ کر پریشان ہو گیا مگر جب عبدل پلٹے لگا تو وہ بھی خوشی سے اچھلتا

ہوا اس کے آگے دوڑنے لگا پھر عبدل رکا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ بندر درختوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ بندر شاخوں کے ساتھ آہستہ آہستہ جھولنے لگے اور کچھ منڈیروں پر تک گئے پھر انہوں نے عبدل کو دوبارہ حرکت کرتے دیکھا تو خوشی سے چلانے لگے۔ وہ ایک ڈنڈی سے چڑھ کر ایک مثاٹ ٹما قلعے پر آ گئے۔ یہاں درخت ذرا کم تھے۔ قلعہ جہاں جھم ہوتا تھا، وہاں چٹان کی ایک دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر پہاڑ کا دوسرا حصہ شروع ہو جاتا تھا۔

دیوار کے قریب چڑھ کے تین اونچے اونچے درخت نیم دائرے کی شکل میں اگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان مٹی کی ایک جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ جھونپڑی کی پچھلی دیوار کا کام چٹان دے رہی تھی۔ تینوں درختوں کی شاخیں جھونپڑی کی چھت پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ رستے بندھے ہوئے تھے۔ وہ رستے کئی درختوں سے گزرتے ہوئے جنگل میں چلے گئے تھے۔ عبدل کو آتے دیکھ کے کئی بندر رسوں کے ساتھ لٹک کے جھونپڑی کی چھت پر اتر گئے۔ وہاں سے چھلانگیں لگا کے انہوں نے عبدل کو گھیر لیا۔ مونٹے بندر نے کئی بندروں کو دھپ مار کر بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ دوسری طرف نکل جاتے اور خوشی سے ناچنے کودنے لگتے۔

عبدل نے ہستے ہوئے مختلف بندروں کو دھپ مارے اور کسی کا کان مروڑا کسی سے ہاتھ ملا یا۔ اچھا خاصا تماشا ہو گیا۔ مونٹا بندر تک آ کے ایک طرف بیٹھ گیا اور یہ سارا تماشا ناپسندیدگی سے دیکھنے لگا۔

عبدل نے جھونپڑی کی زنجیر کھولی اور اندر سے ٹین کا ایک ڈبلا کے میدان میں الٹ دیا۔ ڈبے میں جنگلی ناشپاتیاں تھیں۔ آناٹا بندروں نے جھپٹ کر ناشپاتیاں اٹھالیں اور چلاتے ہوئے درختوں پر چڑھ گئے۔ مونٹے بندر نے

ناشپاٹیوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔

عبدل کو معلوم تھا کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے بندروں سے برتر سمجھتا ہے۔ اس نے جمپو پڑی میں جا کر دوسیب نکالے اور ایک بڑا سیب بندرو کو دیا۔ بندر سیب دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ اس نے مسکرا کے سیب کے نرم نرم گودے میں دانت کاڑ دیے۔ دوسرا سیب عبدل نے ایک پتھر پر بیٹھ کے چاقو سے کاٹا اور اس کی پچائیں منہ میں رکھنے لگا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ بندر بھی مسکری کر مندی سے اسے دیکھتا پھر سیب کھانے لگا۔

اندر اہو نے لگا اور خنکی بڑھ گئی۔ عبدل نے جمپو پڑی میں داخل ہو کر دلی کی لکڑی تلاش کی۔ لکڑی کا ایک سراموٹا تھا اور دوسرا پتلا۔ عبدل نے ماچس سے اسے جلائی اور اس کا پتلا حصہ دیوار کے ایک سوراخ میں سمیٹو دیا۔ جمپو پڑی روشن ہوئی۔ دلی کی مشعل چیز کا درخت چیر کر اس کے تنے کے درمیان سے نکالی جاتی ہے۔ اس کا رنگ گوشت کی طرح سرخ ہوتا ہے اور گوشت ہی کی طرح اس میں سفید ریں ہوتی ہیں۔ چیزہ کے تنے میں ایک بلی رگ ہوتی ہے۔ وہ رگ گندا پیروز ابھاتی ہے۔ سوکھ جاتی ہے تو اس سے مشعلیں بنتی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد موٹا بندر بھی اندر آ گیا۔ یہ ایک مستطیل نما جمپو پڑی تھی سو دروازے کے دائیں طرف ایک کونے میں ایک بڑی سی چارپائی چھپی ہوئی تھی۔ چارپائی پر ایک پرانی تو شکھی اور ایک لحاف بڑا ہوا تھا۔ چارپائی کے اوپر لکڑی کی ایک چھت بنی ہوئی تھی۔

پاشنی کی طرف سے ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ چھت پر چیزہ اور دیوار کے گول گول تنے ترتیب سے اوپر نیچے رکھے تھے۔ دوسری طرف چیزہ کے سوکھے ٹھنکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک طرف ایک کارس بنا ہوا تھا۔ کارس پر شیشے کی بہت سی چھوٹی بڑی بوتلیں رکھی تھیں۔ دروازے

کے بائیں طرف مٹی کا ایک چولہا تھا۔ چولے پر لکڑیاں رکھی تھیں۔

عبدل نے لکڑیاں سیدھی کیں۔ ان کے درمیان دلی کی لکڑی رکھی اور اسے ماچس سے جلا یا۔ دلی کی لکڑی بربر کی آواز سے ملتی اور اس میں سے گندا پیروز اٹکل کر جلنے لگا۔ عبدل نے چولے کے پیچھے دیوار میں خنسا ہوا ایک کپڑا نکالا۔ دیوار میں ایک بڑا سا سوراخ نمودار ہوا۔ دھواں سوراخ سے باہر جانے لگا۔

عبدل نے چولے پر تورا رکھا۔ بکئی کی روٹی پکائی اور گرم کر کے لگے۔ یہ روٹی اس نے صبح پکائی تھی۔ روٹی گرم کر کے اس نے تورا اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور روٹی مٹی کی ایک رکابی میں بیچ پر رکھ دی۔ بیچ کے ایک کونے پر بندر بیٹھا تھا۔ عبدل نے پوئل سے مٹی کے دو پیالوں میں شہد نکال کے ایک پیالہ بندر کے سامنے رکھا۔ دوسرا اپنے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں تھے تو ذکر کھانے لگے۔ بندر نے روٹی ختم کر لی تھی۔ عبدل نے اس کی طرف اور روٹی بڑھائی۔ بندر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”بے ا“ عبدل نے کہا۔ ”شاید تو نے آج سیبوں کے کسی باغ میں ڈاکڑا لالا ہے۔“

بندر کی سمجھ میں کچھ آئی یا نہ آئی ہو بہر حال اس نے اثبات میں سر ہلا کر دانت نکال دیے۔ عبدل بولا۔ ”آدی تم لاچی ہو۔ سو لے پٹا! اگر دست شروع ہو گئے تو کئی دن تک صرف گھاس کھانی پڑے گی۔ کچھ اور نہیں کھانے دوں گا۔ باندھ دوں گا، بھوکا رکھوں گا۔ تم جیسے رہو گے مگر مجھے پروا نہیں ہوگی۔“

کھانے کے بعد عبدل نے دروازے کے پیچھے رکھے ہوئے شے سے آب خورے میں پانی نکال کر پیا اور مزید پانی نکال کر برتن باہر لے جا کے دھوئے۔ اس کے بعد چارپائی پر آ کے لیٹ گیا۔ فرش پر چیزہ کے سوئی دار چلو تر کا فرش

بجھا ہوا تھا۔ اس فرش کی وجہ سے کمرہ خاصا گرم تھا۔ بندر بیچ سے اٹھ کے عبدل کی چارپائی کے پاس چلو تر کے فرش پر لیٹ گیا۔

عبدل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ میں وحند کی ایک وحندلی تہہ چھانی ہوئی تھی۔ وہ وحند رفتہ رفتہ چھٹی گئی اور اس میں سے ظالم چہرے نمودار ہونے لگے۔ موت سے پہلے اس کی ماں نے رو رو کر اس کے بڑے بھائی زمان خان سے التجا کی تھی کہ ”زمانے! عبدل کا بہت خیال رکھنا۔ تم اور شرفا سے ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دینا۔ وہ سادہ اور نا بوجھ لڑکا ہے۔ اسے مارنا بیٹنا نہیں، ورنہ مجھے قبر میں بھی چین نہیں آئے گا۔ تادان آدی ہے اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو درگزر کر دینا۔“

میں ماں کی آنکھیں بند ہوتے ہی عبدل کو ایسا محسوس ہوا جیسے لڑکی دنیا اس کے خلاف ہوئی ہو۔ بھائی شرفا تو اسی کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ وہ روزانہ اسی کے بھائی کو اس کے خلاف بھڑکانے اور اس پر عجیب عجیب الزام لگانے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس نے کیا قصور کیا ہے۔ بھائی روزانہ اسے پھینکنا اور سخت ست کرتا تھا۔ ”پاکل! حق آدی! قسمت نے ہمارے لیے کسی مصیبت بھیج دی ہے۔“

پہلے زمان اسے صرف ڈانٹتا تھا پھر رفتہ رفتہ اس نے اسے مارنا بیٹنا شروع کر دیا۔ بھائی روز لگائی بھجائی کرتی اور عبدل روز اس سے بیٹا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ سارے کام کرتا ہے، بیچارہ بھٹکتا ہے، دن بھر بھڑیں، بکریاں چراتا ہے، شام کو انہیں چارہ ڈالتا ہے اور ان کا دودھ ددھتا ہے پھر بھی بھائی کی نظر میں وہ کام چور ہے۔

اس کے بھائی کے پاس تھوڑی سی زمین تھی۔ وہ اس نے دوسرے لوگوں کی طرح پہاڑ سے چھٹی تھی۔ پہاڑوں پر جہاں جنگل نہیں تھے وہاں لوگوں نے کھود کر اوپر سے نیچے تک چھوئے

چھوئے کھیت بنا لیے تھے۔ وہ کھیت دور سے ایک زینے کی طرح لگتے تھے۔ چند برسوں سے لوگوں نے اپنے کھیتوں کے گرد سیب، بادام، اخروٹ، خربانی اور ناشپاٹیوں کے درخت لگا لیے تھے۔ اس طرح ان کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا لیکن ان کا کمایا ہوا سارا ذخیرہ سردی میں ختم ہو جاتا تھا۔ سردی کی وجہ سے پہاڑی زمین پر شکل سے دو فصلیں ہوتی تھیں۔ گندم کی فصل کوئی خاص اچھی نہیں ہوتی تھی لیکن کئی بہت خوش ذائقہ اور موٹی ہوتی تھی۔

عبدل کے خاندان کا گزرا بھی بہت دقت سے ہوتا تھا۔ اس کی بھائی ہمیشہ آمدنی بڑھانے کے نئے طریقے سوچتی رہتی تھی۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک رستے دار جنگل میں گھوم پھر کر شہدیں کرتا ہے اور ایبٹ آباد جا کے اسے فروخت کر دیتا ہے اس سے مستول آمدنی ہوجاتی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو اکسیا کہ وہ عبدل کو اس کام پر لگا دے۔ زمان خان نے عبدل کو حکم دیا کہ وہ جنگل میں شہد کے چھتے تلاش کرے اور انہیں اتار کر لائے، عبدل جنگل میں نکل گیا۔ دو تین دن تو اسے شہد کا کوئی چھتا نظر نہیں آیا۔ جب نظر آیا تو وہ درخت پر چڑھا مگر چڑھتی ہی بے شمار ٹھیکوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے ڈیک مارے کہ وہ سوچ کر کپا ہو گیا اور کئی روز تک بستر سے حرکت نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ بھائی نے مارا الگ۔

ایک دن اس کی بھائی کو معلوم ہوا کہ خالص پور کا نام بدل کر ایوبیہ رکھ دیا گیا ہے اور وہاں پہاڑ کی چوٹی پر ایک تار کے ذریعے کرسیاں لے جانے کی مشین لگائی گئی ہے، روزانہ اسے شمار سیاح آتے ہیں، گاؤں کے لڑکے جنگلی پھل اور اسز امیری ذخیرہ بیچ کر خوب روپے کماتے ہیں۔ بھائی نے عبدل کو بھی اس کام پر لگانے کی تجویز پیش کی۔ زمان خان پہلے تو راضی نہیں ہوا لیکن

جب بھائی نے بہت اصرار کیا تو مان گیا۔ دوسرے دن بھائی نے عبدال کو صاف سترے کپڑے پہنائے، ایک نوکری میں ناشپائیاں، سبب اور دوسری میں اسٹرابیری کے پتوں کی چھوٹی چھوٹی نوکریاں بنا کر رکھ دیں اور عبدال کو ہدایت کی کہ ”دیکھ۔ ناشپائیاں روپے سیر، سیب تین روپے سیر اور اسٹرابیری کی نوکریاں آٹھ آنے کی ایک نوکری۔ سمجھ گیا؟“

عبدال مشین والی جگہ پہنچا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔ نیچے سڑک کے کنارے بہت چمکیلی خوب صورت گاڑیاں کھڑی تھیں، رنگ برنگے کپڑوں والی عورتیں بچوں کے ساتھ کارپوں سے نکل کر اوپر کی عمارت کی طرف بڑھ رہی تھیں، ان کے ہمراہ بہترین لباس والے موٹے تازے مرد تھے۔ عبدال نے محسوس کیا کہ وہ سب بہت ہشاش بشاش تھے۔ سڑک کے اوپر ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ میدان میں پتھر کی ایک عمارت کے سامنے لوہے کا بڑا سا چکر ایک آہنی ستون میں پھنسا ہوا چل رہا تھا، ستون سینٹ کے ایک پختہ فرش میں جڑا ہوا پھنسا ہوا چل رہا تھا، ستون سینٹ کے ایک پختہ فرش میں جڑا ہوا تھا، چکر کے گرد ایک آہنی رسا ایک طرف سے پہاڑی پر مختلف ستونوں سے گزرتا ہوا چڑھتا اور دوسری طرف سے نیچے آتا تھا۔ اوپر جانے والے رستے کی کرسیوں پر لوگ ایک طرف بیٹھے اور دوسری طرف سے اترتے تھے۔

عبدال جیسے بہت سے پہاڑی لڑکے اور مرد نوکریوں میں سب ناشپائیاں، اسٹرابیری اور اسٹرابیری بھرے ہوئے سڑک کے کنارے بیٹھے تھے۔ عورتیں اور بچے ان سے خریداری کر رہے تھے۔ عبدال بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی نوکریاں ایک چٹان کے نکلے ہوئے سرے پر رکھ دیں۔ اس کی چیزیں بھی بیکنے لگیں صرف دو گھنٹوں میں سارا سامان بیک گیا۔

دوسرے لڑکے اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

اس نے پیسے جب میں ڈالے اور دوسرے لوگوں کی طرح زینے چڑھ کر ایک قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اپنی باری آنے پر اس نے دو روپے کا ٹکٹ لیا اور ایک کارندے کی مدد سے اوپر جانے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے کرسی پر بیٹھنے میں اوروں کی طرح دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ اس نے دوسرے لوگوں کو غور سے دیکھ کر کرسی پر بیٹھنے کا طریقہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ اب وہ کرسی میں بیٹھا ہوا لحد پر لحد اوپر جا رہا تھا۔ نیچے زمین اور ٹیکریاں حرکت کرتی جا رہی تھیں۔

اس کی نظر پلاسٹک کے ڈسکن کے نیچے لگے ہوئے لوہے کے ڈبے پر پڑی، اس نے اس پر پاؤں رکھ دیے اور مضبوطی سے جم کر بیٹھ گیا۔ وہ چوٹیاں سر کر رہا تھا۔ اس کا دل خوشی سے پھیلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا اسے چھوئی تو وہ یہ محسوس کرتا تو کیا کوئی نرم و نازم ہاتھ اس کا جیمہ ہلاتا رہا ہے۔ چڑھ اور پودار کے بلند درخت اسے اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے جھوم رہے تھے۔ آسمان گہرا نیلا تھا، بادلوں کے سفید برائے کلوے ہوا کے دوش پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ نیچے دھوپ میں گہری وادیاں کے سبز سبز درخت بہت اونچے لپک رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور جنگلی پھولوں کی خوشبو سی ہوئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لوہے کے ڈبے کے پاس پاس نصب تھے۔ رستے کے ساتھ لگے ہوئے پیسے کرسی سمیت کھمبوں کے اوپر لوہے کی پتری سے گزرتے تو گر گر کی آواز پیدا ہوتی۔

کرسی تھر تھرتی اور عبدال کے دل میں جھرجھری سی پیدا ہوتی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس اوپر نیچے ہوئی ہوئی جھرجھری میں خوف کے باوجود لذت کی ایک لہر ہے۔ چوٹی پر پہنچنے کے اس نے دوسروں کو دیکھتے ہوئے پلاسٹک کا ڈھلکا اٹھایا اور چھلانگ لگا دی۔

کرسیوں کی زد سے بچ کر وہ بہت خوش ہوا۔

وہاں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ لوگ دریاں اور چادر میں بچھائے بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے، کچھ خوش چہلوں میں مصروف تھے۔ نیچے خوشی سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ مغربی اور مشرقی کناروں پر دور دراز نصب تھیں۔ لوگ دور دراز سے ایک طرف ہری پور کی وادی کا دوسری طرف دریاے جہلم کا نظارہ کر رہے تھے۔ عبدال نے بھی چار آنے دے کے یہ منظر دیکھا۔

وہاں اور جنگل کتنے نزدیک آگئے تھے اور دریاے جہلم کا چمک دار پانی گہری کھائی میں بہتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ عبدال ایک چوڑی گڈنڈی سے ہوتا ہوا دوسری چوٹی کی طرف گیا۔ وہاں ایک مستطیل سا میدان تھا۔ جھاڑیاں کاٹ کر چھوٹے چھوٹے چوبیسویں گنبد بنائے گئے تھے۔ کیا ریوں میں لپک برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پاس ہی لوہے کے ڈبے کے کھڑے کر کے بچوں کے لیے جموں لگا دیے گئے تھے مگر جموںوں پر بچوں کے بجائے نوجوان اور خوش لباس لڑکیاں جموں رہی تھیں۔ ایک لڑکی جموں لے کے تختے پر بیٹھی تھی۔ دوسری لڑکی تختے کے دونوں طرف پاؤں رکھ کر رسا پکڑے کھڑی تھی اور خوشی سے چلا رہی تھی۔

عبدال چند لمحوں تک دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ آگے ایک جگہ لکڑی کے کھانچوں میں بوتلیں رکھی تھیں۔ عبدال نے ایک بوتل لی۔ اس سے ایک بوتل کی قیمت دو روپے وصول کی گئی۔ اب اس نے واپسی کا ارادہ کیا اور جس طرح کرسی کے ذریعے اوپر آیا تھا، اسی طرح نیچے اتر گیا۔ وہ بے حد خوش تھا۔

وہ گھر پہنچا تو شام ہو رہی تھی۔ اس کی بھائی دوڑ کر اس کی طرف آئی۔ ”عبدال! سارا مال بیک گیا؟“ عبدال نے اثبات میں سر ہلایا۔ بھائی نے پوچھا۔ ”پیسے کہاں ہیں؟“ عبدال

نے اپنی جیب سے ایک روپے والے چند نوٹ اور کچھ چھوٹے بڑے سکے نکال کے بھائی کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ بھائی کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ ”اتنے سے پیسے؟ بانی کیا ہوئے؟“

”اتنے ہی ملے ہیں۔“ عبدال جانتا تھا کہ جج بولنا کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ”حرام خورا“ بھائی بھڑکی۔ ”باقی پیسے تم نے اڑا لیے ہوں گے۔ میں خوب جانتی ہوں تمہیں۔“ وہ بری طرح چپختے لگی۔

اس کے چپختے سے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔ وہ چیخنے کی گل دار تھیں اور شلوار پہنے ہوئے تھی، اس کے گورے گورے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی تھی، اس کے ہونٹ اسٹرابیری کی طرح سرخ تھے اور آنکھیں سیاہ تھیں، بال شہری لڑکیوں کے بالوں کی طرح دو چوٹیوں میں بٹے ہوئے تھے، ان کے ساتھ سنہرے پھندے بنے ہوئے تھے، چوٹیاں اس کے شانوں سے ہوتی ہوئی اس کے سینے پر جموں رہی تھیں۔

عبدال نے نکلیوں سے اسے دیکھا۔ ارے! یہ تو زینو ہے لیکن اس نے تو دو چوٹیاں گوندھ کے اپنے آپ کو بالکل بدل لیا ہے۔ زینو اس کی بھائی کی چھوٹی بہن کی لیکن بھائی سے قطعی مختلف تھی۔ بھائی کی درشت آواز نے عبدال کی توجہ ہٹا دی۔ ”غصہ کرو۔ بھائی کو آنے دو۔ پھر مڑا چھوٹا ہوں۔“ وہ ہاؤں پختی ہوئی چلی گئی۔

عبدال کے پورے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی لیکن اس نے بھائی کی ڈانٹ ذہن سے نکال دی اور زینو کے متعلق سوچنا ہوا آہستہ آہستہ اپنی کونھری کی طرف چلا گیا۔ اگر مجھے موقع مل جائے تو میں زینو کو مشین والی کرسیوں کی سیر کراؤں۔ زینو متحرک کرسیوں پر بیٹھ کر کتنی خوش ہوگی۔ ہم دونوں وہاں کھوٹیں گے تو کتنا مزہ آئے گا۔ ہر لڑکی زینو کو رشک سے دیکھے گی۔ وہ شہری لڑکیوں سے ہزاروں درجے خوب صورت ہے، بھلا ان

کے پاس ایسا رنگ روپ ایسی صحت کہاں؟ سوچتے سوچتے اچانک اس نے اپنے بھائی کی غضب ناک آواز سنی۔ ”حرام زادے! احمق! باقی یہ کہاں ہیں؟“

دوسرے ہی لمحے بیدل کی لچیلی چمڑی فضا میں بلند ہوئی اور عبدال کے جسم پر تاب توڑ ضربیں بڑنے لگیں۔ وہ بلبلانے لگا لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی چیخ کا رزنیو سننے پلٹتے وقت اسے زینو کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ زینو کی آنکھوں میں ہمدردی کی چمک تھی اور چہرے پر غم کے آثار۔ اس نے بے چارگی سے عبدال کی طرف دیکھ کے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور سسکی ہوئی ایک طرف نکل گئی۔

عبدال کو درد کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس کے بھائی نے اسے اس قدر ظالمانہ انداز میں پہلے بھی نہیں پیٹا تھا۔ آج تو اس پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ مارتے مارتے چمڑی ٹوٹ گئی تھی تو اس نے تھر کا ڈنڈا اٹھالیا تھا۔ تھر کی لوہے کی مانند سخت لکڑی پر ابھرے ہوئے کانٹوں نے عبدال کی جلد جگہ جگہ سے لیریز دی تھی۔ زینو کی ہمدرد آنکھیں آنسوؤں سے لبریز اس کے تصور میں ابھریں تو اس کی تکلیف کچھ کم ہوئی۔ اس پر بے تحاشا ڈنڈے برس رہے تھے اور اس کی بھابی چلا رہی تھی۔ ”اس کا علاج یہی ہے۔ یہ باتوں سے سیدھا نہیں ہوگا۔“

زماں خان اسے مارتے مارتے تھک گیا تو یکایک رونے لگا اور ڈیڑھ ایک چمک کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ عبدال نہ جانے کئی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ درد کی شدت سے تکلیف کا احساس مٹ گیا تھا۔ اس کا جسم نہ ہو چکا تھا۔ پھر وہ چار پائی پر گر پڑا اور اس پر سے ہوئی طاری ہونے لگی۔ بہت دیر بعد اسے کچھ ہوش آیا۔ اس نے دیکھا کہ کوٹھری میں ہلی بکلی روٹی ہو رہی ہے اور کوئی اس کی پھٹی ہوئی جلد پر اپنے نرم نرم ہاتھوں سے مرہم لگا رہا

ہے۔ نرم نرم ہاتھوں کے لمس نے اس کی تکلیف کم کر دی اور اسے بیٹھا بیٹھا درد محسوس ہونے لگا۔ پھر ان طامع ہاتھوں نے اس کے چوڑے مضبوط شانے اپنی گرفت میں لے لیے گرفت بتدریج سخت ہوئی مگر جیسے کوئی جذبات سے مغلوب ہو کر ہمدردی کا اظہار کر رہا ہو۔ وہ ہاتھ اس کے شانوں میں ایسے پیوست ہو گئے تھے جیسے اس کے جسم کا حصہ بن جانے کی کوشش کر رہے ہوں اور جیسے اپنی انفرادیت فاکر کے ہمیشہ کے لیے اس کے وجود میں تحلیل ہو جانا چاہتے ہوں۔ عبدال نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کس کے ہاتھ ہیں اور یہ گرمی کس کے بدن سے پھوٹ رہی ہے۔ آنکھیں کھولنے میں اسے یہ خوف تھا کہ زینو کہیں شرما کے بھاگ نہ جائے۔ ماں کی موت کے بعد عبدال نے آج پہلی دفعہ محبت کا ایسا شدید اظہار دیکھا تھا لیکن اس محبت میں اور ماں کی محبت میں اسے ایک واضح فرق بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سرشار ہو گیا۔ سرشاری میں اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم ہولے ہولے بہت احتیاط سے سہلا جا رہا ہے۔ وہ لمبے مخروطی ہاتھ دیر تک اس کے جسم کے ذرہ ذرہ خلیہ خلیہ سہلاتے رہے۔ درد کی بدروشنی دے پاؤں فرار ہو گئیں۔ لذت و سرور کے بادلوں نے عبدال کو اپنے دوش پر اٹھالیا اور لذت و سرور کے عالم میں قرن باقرن لار گئے۔ لائین کی مدھم مدھم روشنی میں ساری فضا دھواں دھواں اور خوبابہ دھمی۔ عبدال بھی خوب کی آغوش میں پہنچ گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ

زینو کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ ہے۔ زینو کے کتے ہوئے انجیر کی طرح سرخ ہوٹ خنیدہ ہو گئے تھے۔ کالی کالی مٹی آنکھوں میں ایک عجیب چمک آگئی تھی۔ دودھ کے پیالے سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ نیز بادام اور شہد اور بنشے کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ زینو نے بہت آہستگی کے ساتھ پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ عبدال

نے ایک گھونٹ بھر کے زینو کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی کالی آنکھوں سے محبت کی پھوار گر رہی تھی۔ اس کی دل دار نظر کی شبنم قطرہ قطرہ عبدال کے زخموں پر چھارہ ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ کاش میں روز سننے دھمکھاؤں۔ دودھ نے اس پر شراب جیسا نشہ طاری کر دیا۔ وہ مدھوش ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ چاگا تو اس کے درد بھی جاگ اٹھے کیونکہ زینو جا بجا تھی۔ عبدال کے وجود کا صحت مند حصہ اس سے جدا ہو گیا تھا۔

دوسری صبح زینو نے پگلس اٹھائے بغیر عبدال کے سامنے ناشتہ رکھا۔ عبدال کی بھابی نے دیکھا۔ وہ تیر کی طرح اس کے قریب پہنچی۔ پہلے اس نے اپنی چھوٹی بہن زینو کے رخسار پر ایک زنائے کا چھتر رچھ کر دیا۔ پھر عبدال کے سامنے سے ناشتہ اٹھا کے دو چمک دیا۔ عبدال اسی وقت اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے مدھوش سے کوٹھری پر لٹکے ہوئے ملیشیا کے کپڑے پہنے اپنا لمبا کوٹ اور کبل لیا، تھلا اٹھایا، کلباڑی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

مشرق کی طرف کشمیر کے عظیم المیہ فلک بوس پہاڑ ایک سائے کی طرح نظر آرہے تھے۔ ان کے پاس سے روشنی کی سونی جیسی باریک باریک لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ نہایت خنڈی لیکن عطربیز ہوا چل رہی تھی ایوبیہ سے کچھ دور ایک چٹان کے دامن میں ایک چشمہ تھا۔ وہاں پہنچ کے عبدال نے منہ دھویا پانی پیا اور چھوٹے سے تالاب میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کی کالی داڑھی لمبی ہو گئی تھی کالے بال بھی خاصے بڑھ گئے تھے۔ چہرے پر زخموں کے نشان تھے اور آنکھوں کے نیچے سیاہ جلتے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ بال پکتے تھے۔ اسے یاد آیا کہ رات زینو نے اس کے بالوں میں سرسوں کا تیل بھی لگایا تھا۔ اس نے انگلیوں سے اپنے بال سیدھے کیے اور آگے روانہ ہو گیا۔ ٹھوڑی دور چلتے کے بعد

اسے سنا ابھری کا ایک تختہ نظر آیا۔ اس نے بہت سے گچھے تو ڈرا ایک درمال میں رکھ لیے اور انہیں بھاٹکتا ہوا چلا گیا۔ ایوبیہ سے نکل کر وہ پاپ لائن کی جکی سڑک پر پہنچ گیا۔ راستے میں اسے کھائی کے کنارے ایک چوٹی چمڈھڑی پر ناشپاتی کا ایک درخت نظر آیا۔ ناشپاتیاں پک کر پھلی ہوئی تھیں۔ شاخیں ان کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے رس بھرے گودے کے تصور سے عبدال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ ترانی میں اتر کے ناشپاتی کے درخت کے پاس پہنچا۔ اچانک اس پر ناشپاتیوں کی بارش ہونے لگی ساتھ ہی بندروں کا چنچا چلانا سنا دیا۔ عبدال نے جلدی جلدی مٹی ہوئی ناشپاتیاں اٹھ کر کے خصلے میں ڈال دیں اور ایک چٹان پر بیٹھ کے انہیں کھانے لگا۔ اس نے دیکھا کہ درخت پر صرف دو بندر اور دو بندر بیاں ہیں لیکن شورا تاتا ہو رہا تھا جیسے بندروں کا کوئی ہجوم موجود ہو۔ بندر ناشپاتیوں کی شاخیں بری طرح ہلارہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درخت پر ایک بھی ناشپاتی باقی نہیں رہے گی ساری گر جائیں گی۔ اسے بہت غصہ آیا کہ بندر کس بے دردی سے پھل خالص کر رہے ہیں۔ ایک بہت شوخ بندر یا کوئی شاخ جھلا کے پھل کرائی پھر دوسری شاخ پر چلی جاتی اور اسے جھلا جھلا کے پھل گرانے لگتی۔ عبدال نے ایک ٹوکھلا پھرا اٹھایا اور تاک کر بندر یا کو مارا۔ پھر لگتے ہی بندر نے چیخ کر سارا جھل سر پر اٹھالیا۔ بندروں نے عبدال کو ناشپاتیاں مارنی شروع کر دیں۔ اس افتاد پر عبدال نے ایک دوسرے بندر کا نشانہ لے کے پھر مارا۔ بندو کا خاصی چوٹ آئی۔ وہ چیخنے لگا اور اچھل کر دوسرے درخت پر چڑھ گیا۔ ایک اور موٹا سا بندر درخت سے اتر کر ایک منڈیر پر بیٹھ گیا اور عبدال کو گھورنے لگا۔ عبدال نے سوچا کہ پھر مار کے اسے بھاگ دے لیکن اس بندر کے تیور عجیب تھے۔ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں معلوم ہوتا

تھا۔ عبدل نے ایک ناشاپاتی دانتوں سے کاٹی اور اس کی طرف پھینک دی۔ بندر نے ناشاپاتی پکڑ کے سوکھی پھر اسے دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگا۔ عبدل نے ایک دوسری پکی ہوئی ناشاپاتی اس کی طرف پھینکی۔ دوسری ناشاپاتی اس نے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کے پکی ناشاپاتی پھینک دی اور عبدل کی طرف شک کی نظروں کے بجائے دوستانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ عبدل کو اس کی یہ ادا بہت بھائی۔ اس نے تھیلے سے ایک اور ناشاپاتی نکال کے پھینکی۔ بندر نے ہوا میں اچھل کے ناشاپاتی پکڑ لی۔

عبدل نے اپنے تھیلے سے کئی کی ایک میٹھی روٹی نکالی۔ یہ زیتونے پکا کے رات کو اس کے تھیلے میں رکھ دی تھی۔ روٹی دیکھ کر اسے زیتونی محبت بھری آنکھیں یاد آئیں۔ وہ اٹک بار ہو گیا۔ شاید وہ آنکھیں میں دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا حالانکہ سردی بستر راتوں میں مجھے اس کے گرم وگداز بدن کی نفی ضرورت پڑے گی۔

وہ خیالات میں ڈوب گیا مگر جلد ہی بندر کی غراہٹ نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس نے بندر کی طرف دیکھا۔ بندر اسے اسارے کر رہا تھا۔ عبدل مسکرایا۔ بندر نے بھی دانت نکال دیے۔ عبدل نے روٹی کا آدھا ٹکڑا اس کی طرف پھینکا۔ اس نے اچھل کر ٹکڑا دیوچ لیا اور سوکھ کے الٹ پلٹ کے دیکھا پھر سارا ٹکڑا منہ میں بھر لیا اور تیزی سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے منڈیرے سے اتر کے ایک فلا بازی کھائی۔ عبدل ہنسا۔

بندر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عبدل نے روٹی کا دوسرا ٹکڑا اس کی طرف پھینکا۔ بندر نے ٹکڑا فوراً منہ میں بھر لیا اور خوشی سے ایک نعرہ بلند کیا پھر مسلسل فلا بازی ایا کھانے لگا۔ بندر بہت موٹا تازہ تھا۔ عبدل کو اس کی فلا بازی ایا کھانا بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ جب اس کا بھاری جسم زمین سے ٹکرا تو

دھم دھم کی آواز آتی۔ عبدل خوب ہنسا۔ بندر فلا بازی ختم کر کے اس کی طرف دیکھا لگا۔ عبدل نے ہاتھ کے اشارے سے بندر کو کہا کہ اب اس کے پاس روٹی نہیں ہے۔ بندر نے اس کی نقل اتاری۔ عبدل نے سر ہلایا۔ بندر نے بھی سر ہلایا اور پھر اس کا سر ہلایا گیا۔ عبدل زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے تھیلے سے ایک پکی ہوئی ناشاپاتی نکال کے بندر کی طرف پھینکی۔ بندر نے ناشاپاتی پکڑ کے دیکھی پھر اسے کھانی میں پھینک دیا۔ عبدل نے سوچا کہ یہ شاید ناشاپاتی کے بجائے روٹی چاہتا ہے مگر میرے پاس اب روٹی نہیں ہے لہذا چلتا چاہیے۔

عبدل نے تھیلہ شانے سے لگایا اور روانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کھانی عبور کر کے سامنے والی ترانی سے گزر کے تھیلے والی سڑک پر پہنچ جائے۔ چلتے چلتے اس نے دیکھا کہ اوپر والی منڈیرے پر موٹا بندر بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ عبدل کو کھانی بہت پیچھے جا کر چلنے لگی پڑی۔ کھانی کی دیوار بے حد عمودی تھی اور اس میں بنی ہوئی قدرتی پکڑنیاں پکی پکی تھیں۔ ان پر نہایت احتیاط سے چلتا تھا۔

زمین کے چپے چپے پر گھاس تھی اور جگہ جگہ جنگلی پودے اگے ہوئے تھے۔ کھانی کے کناروں پر چڑھ اور دیوار کے گھبانہ پر تخت تھے۔ سورج کی کرنیں نیچے نہیں آتی تھیں۔ ہر طرف ایک ٹھنڈی چھاؤں چھائی ہوئی تھی۔ دھند کے سفید مرغولے بھی اٹھنے لگے تھے۔ عبدل کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ بادلوں میں گھر گیا ہو مگر وہ بلندی کی طرف بڑھا تو دھند کے بادل نیچے گر گئے۔

کھانی چڑھ کے وہ زمین کے ایک مثلث نما قطعہ پر آ گیا۔ یہاں درخت کم تھے لیکن لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ جہاں قطعہ ختم ہوتا تھا وہاں ایک لمبی چٹان تھی۔ اس کے پاس چڑھ کے بڑے تے والے تین درخت دائرے کی شکل میں

اگے ہوئے تھے۔ درختوں کے بالکل نیچے ایک جھوپڑی تھی۔ جھوپڑی کے دروازے نہیں تھے۔ وہاں پہنچتے ہی زور کی بارش شروع ہو گئی۔

عبدل نے دوڑ کر جھوپڑی میں پناہ لی۔ بہت معمولی جھوپڑی تھی۔ مٹی کی دیوار پر لکڑی کے لمبے لمبے ٹکڑے رکھ کے ان پر گھاس پھوس اور شاخیں ڈال دی گئی تھیں اور اوپر مٹی ڈال کے جھوپڑی بنائی گئی تھی۔ عبدل نے دیکھا کہ موٹا بندر بھی اندر آ گیا ہے۔ بندر شرافت سے ایک کونے میں بیٹھ کے عبدل کی طرف دیکھنے لگا شاید وہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے اندر آنے سے یہ انسان کہیں ناراض تو نہیں ہوا؟ عبدل نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ بندر نے بھی دانت کھول دیے۔

”کیا حال ہے دوست! اچھے تو ہو؟“ عبدل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ بندر نے ایک منٹ توقف کیا پھر احتیاط سے اس کی طرف بڑھا۔ ”ڈرو نہیں؟ قریب آؤ! آ جاؤ۔ میں تمہارا دوست ہوں۔“

عبدل نے بڑھ کر اس کی کمر تھپتائی۔ بندر نے اپنا چہرہ اٹھا کر اسے دوستانہ انداز میں دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے اسے اب بھی عبدل کی طرف سے شک ہو۔ اس کی جبلت نے اسے انسانوں سے خائف رہنے کا سبق دیا تھا۔ وہ یہ سبق اتنی جلدی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اب بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔

جھوپڑی رفتہ رفتہ ٹپکنے لگی۔ صرف ایک گوشہ ایسا تھا جہاں پانی نہیں ٹپک رہا تھا۔ وہیں عبدل اور بندر ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے بیٹھے رہے۔ پھر اندر جرا چھا گیا۔ بارش ہوتی رہی۔ عبدل ٹھنڈوں پر سر رکھ کے اوتھک گیا۔ موسلا دھار بارش کی آواز اسے لوری دینے لگی پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ہر طرف بیکراں سکوت تھا۔

بارش بند ہو گئی تھی۔ دروازے سے اسے چمکتا ہوا نل گول آسمان نظر آیا۔

وہ باہر نکلا۔ فضا میں عجیب خشکی تھی۔ وہ جسم کو تکلیف دینے کے بجائے راحت بخش رہی تھی۔ فضا دھل کر صاف و شفاف ہو گئی تھی۔ آسمان پر لاکھوں ستارے چم چم کر رہے تھے۔ عبدل دیر تک فضا کی سحر انگیزی کا کاف اٹھاتا رہا پھر اسے سردی لگی اور ایک جبر جبر آئی۔ اس نے چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں اور چلو تھر کے پتے اکٹھے کیے اور جھوپڑی کے فرش پر رکھ کے تھیلے سے ماچس نکالی اور آگ لگائی۔ چلو تھر تڑپنے لگا۔ چند لمحوں میں ٹہنیاں نے بھی آگ پکڑ لی گری پھیلنے لگی۔

عبدل نے اپنے پکڑے کھائے پھر بہت سا چلو تھر اکٹھا کر کے اس پر کھل بچھایا اور بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے اٹھ کر تھیلے سے دو ناشاپاتیاں نکالیں۔ ایک خود لی دوسری بندر کو دی۔ بندر نے ناشاپاتی سوکھ کے زمین پر رکھ دی۔ عبدل نے کہا۔ ”دوست! آج رات تو ناشاپاتی ہی کھانی پڑے گی۔ مجبوری ہے۔“

ناشاپاتی کھا کے عبدل لیٹ گیا۔ بندر آگ سے دور بیٹھا ہوا اوتھکے لگا۔ نہ جانے کس وقت عبدل کو نیند نے آدبوجا۔ پھر چڑیوں کے چھپوں سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ باہر نکلا۔ میدان میں کئی بندر فلا بازی ایا کھا رہے تھے۔ موٹا بندر ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ بندروں نے عبدل کو دیکھا تو شور مچاتے ہوئے درختوں پر چڑھ گئے۔ صرف موٹا بندر رہ گیا۔

عبدل نے دیکھا کہ قطعے کے ایک کونے میں مٹی کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ وہ وہاں گیا۔ اس نے ٹکڑے کا ڈھکن اٹھایا۔ ٹکڑے کا پانی خاصا میلا تھا۔ اس نے چلو میں پانی لے کے منہ پر چھیننے مارے پھر یس کا دامن اٹھا کے اسے الٹا کر کے منہ پونچھا۔ موٹا بندر اس کے پاس آیا۔ وہ عبدل کی شلوار پھینچ کر اسے پیچھے کھانی کی طرف لے جانے

لگا۔ پہلے تو عدیل سمجھا نہیں پھر بندر کے پیچھے چل دیا۔ بندر اچھلتا کودتا آگے جا رہا تھا۔ ایک چٹان کے پاس پہنچ کے وہ رک گیا۔

عدیل نے آگے ہو کے دیکھا۔ چٹان کے نیچے ایک چشمرہ تھا۔ جسے آگے ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔ تالاب کے کنارے کئی بندر بیٹھے۔ وہ عدیل کو دیکھ کر چیخے ہوئے جلدی جلدی درختوں پر چڑھ گئے۔ عدیل نے ہاتھ باز دوسرے اچھی طرح دھویا۔ کئی جگہ سے بھا ہوا خون بہہ نکلا۔ پھر اس نے پاؤں دھوئے اور جیب سے دندا سے کاٹھا نکال کر دانت صاف کرنے لگا۔ دندا سے اس کے ہونٹ اور مسوڑھے لال کر دیے اور سفید دانت چمکنے لگے۔ اس نے چلو سے پانی لے کے ہونٹ وغیرہ صاف کیے اور واپس جھوپڑی کی طرف آیا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ سورج کی کرنیں سمجھان درختوں سے چمن چمن کر زمین پر مشکل سے پہنچ رہی تھیں۔ جھوپڑی کے سامنے والے قطعے پر درخت کھٹے تھے اس لیے وہاں دھوپ صاف چمک رہی تھی۔ عدیل دھوپ میں ایک پتھر پہ بیٹھ گیا اور اپنی آئینہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر سے ناشائیاں نکال کے لے آیا۔ موٹا بندر اس کے قریب آیا پتھر پر بیٹھا ہوا اپنی جلد کھجرا ہوا تھا۔ عدیل نے دو ناشائیاں اس کی طرف بڑھا کیں۔ بندر نے ناشائیاں جیب چاپ لے لیں۔ عدیل نے محسوس کیا کہ اس کے پیٹ میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ شاید اناج نہ کھانے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر کہیں سے شہد مل جائے تو اس کی طبیعت فوراً بحال ہو جائے گی۔

اس نے جھوپڑی کا جائزہ لیا۔ یہ جھوپڑی شاید نکلہاروں نے بارش سے پناہ لینے کے لیے بنائی تھی۔ یہاں کسی کے مستقل قیام کے آثار نہیں تھے۔ عدیل کو خیال آیا کہ وہ یہیں رہنے لگے تو

بہت بہتر ہو۔ رہنے کے لیے اس سے اچھی جگہ نہیں مل سکتی مگر یہاں رہنے کے لیے اسے کچھ برتنوں کی ضرورت پڑے گی اور سب سے پہلے جھوپڑی میں ایک دروازہ ہونا چاہیے تاکہ وہ جنگلی درندوں سے محفوظ ہے۔ اس نے جھوپڑی کی زمین پر چلو خرچ کر کے دواچ کا فرش بچھایا۔ اس کام میں موٹے بندر نے بھی اس کی مدد کی۔ اس کے قلابے میں اتنی گھاس نہیں آتی تھی جتنی عدیل اٹھا کر لاتا تھا پھر بھی بندر مسلسل اس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ دوپہر کے وقت عدیل کو بھوک لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے مزید ناشائیاں کھائیں تو اس کے پیٹ میں درد ہو جائے گا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا کھائے؟

اچانک اس کی نظر اسڑاہیر کی کیڑوں پر پڑی۔ اس نے اسڑاہیر یاں جن جن کر کھائی شروع کیں اور بندر کو بھی دیں۔ اس طرح بھوک کچھ کم ہوئی۔ عدیل نے اندر آ کے مبل لیا۔ ناشائیاں شانے سے لگایا۔ کھڑی ہاتھ میں قی اور کھانے میں نکل گیا۔

شہتوت کے ایک درخت کی چوٹی پر اسے کچھ کھیاں مجبھنائی نظر آئیں۔ اس نے سوچا کہ کھویوں سے بچاؤ کے بغیر وہ شہد کا پھتا تارے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ایک پتھر پر اسے ہو چکا تھا۔ وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی صدی کے اندر اسے ایک سخت سی چیز محسوس ہوئی۔

اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو اسے یاد آیا کہ ایک دن زینو اس کی صدی کی پچھنی ہوئی تھی۔ یہی تھی۔ صدی سیٹے سیٹے اس نے کہا تھا۔ ”عدیل اتم تو سیدھے آدی ہو کسی دن نہ جانے کہاں نکل جاؤ۔ پتہ ہے تم کہیں چلے گئے تو ہمیں روپوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں نے تمہاری صدی میں کچھ نوٹ سی دیے ہیں۔ جب ضرورت پڑے نکال لینا۔“

زینو میرا کتنا خیال رکھتی تھی۔ ایک میں ہوں

کہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا آیا لیکن اس نے ایک سڑا ہوا بھری۔ آدی جو چیز اپنا نہ سکے اس کی خواہش کیوں کر ہے؟ اس نے دھا کا ادھیز کر کے ہوئے روپے نکال لیے۔ دس دس کے پانچ نوٹ تھے۔ اتنے سارے روپے دیکھ کے وہ بہت خوش ہوا اور تنہا گلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ موٹا بندر بھی منڈیریں پگڑیاں درخت اور جھاڑیاں بھلاتا رہا۔ عدیل آبادی کے نزدیک پہنچا تو اس نے موٹے بندر کو ایک اونچے درخت پر چڑھا دیا اور اسے اشاروں سے سمجھایا کہ اس کی واپسی تک وہ یہیں ٹھہرے۔

”میں ابھی آتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ شہر چلو مے کو کوئی تمہیں پکڑ نہ لے۔“ یہ کہہ کے عدیل جانے لگا۔ بندر اسے جاتے ہوئے دیکھ کر درخت سے اتر نکلا۔ عدیل نے اسے پھر اشاروں سے سمجھایا۔ بندر درخت پر رک گیا۔ تنہا گلی پہنچ کے عدیل نے گریبانے کی دکان سے آنا بیٹھتی تھی ”تو“ منی کے برتن اور چھٹائی ڈبے خریدے۔ یہ سب چیزیں اس نے قوچی میں رکھیں اور پوری کندھے پر اٹھا کے بندر کے پاس آ گیا۔ بندر اسے دیکھ کے خوشی سے ناچنے لگا۔ عدیل بھی خوش ہوا۔ دونوں تیزی سے جھوپڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جھوپڑی پہنچ کے عدیل نے برتن نکال کر ایک طرف رکھے اور آدوسری طرف رکھ دیا۔ پھر باہر جا کے کھڑی سے ایک درخت کی شاخیں کاٹیں۔ تینیں لگا کے انہیں جوڑا اور ایک دروازہ سا بنایا پھر اس نے وہ دروازہ دو قبضوں کے ذریعے چوکت میں نصب کر دیا اور دروازے کے ساتھ ایک زنجیر لگائی۔ بندر اس کے قریب بیٹھا ہوا یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ دروازہ نصب کر کے عدیل ایک ڈبے میں جیسے سے پانی لایا۔ منی کے ایک لگن میں آٹا گوندھا پھر پتھر جوڑ کے ایک چولہا بنایا۔ چولے میں لکڑیاں رکھ کے

آب جلائی اور چولے پر تورا رکھ کے دو روٹیاں پکائیں۔

ایک روٹی اس نے خود لی اور دوسری بندر کو دی۔ بندر نے آدھی روٹی کھائی۔ آدھی پھینک دی۔ عدیل نے بندر کی جھینگی ہوئی آدھی روٹی اٹھا کے حفاظت سے رکھ دی کہ دوسرے وقت کام آئے گی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ وہ مبل بچھا کے لیٹ گیا۔

دوسرے دن صبح عدیل نے کھڑائی لی اور چڑھ کا کوئی گرا ہوا تلاش کرنے کے لیے جنگل میں نکل گیا۔ بندر بھی اس کے ساتھ تھا۔ کچھ دور جا کے ایک تالاب گیا۔ عدیل نے اسے چر کر اس کے درمیان سے دلی کی لکڑی نکالی۔ چڑھ کا یہ حصہ گندا ہیر وزا بناتا ہے۔ یہ لکڑی درخت کے ستنے سے چند رگوں کے ذریعے وابستہ ہوتی ہے۔ بندر نے بھی کچھ لکڑیاں اٹھا کے اپنے کندھے پر رکھ لیں اور عجیب مستحکم خیر انداز میں چلنے لگا۔ عدیل بہت ہنسا۔

واپسی سے پہلے اس نے گندے ہیر وزے سے بھرے ہوئے کئی کے پیالے ٹین کے ڈبے میں اٹھ لیے۔ اسے معلوم تھا کہ مکھ جنگلات والے چڑھ کا تافز راسا پھیل کر اس میں ایک بیج ٹھوٹک کے لٹکا دیتے ہیں۔ چڑھ سے آہستہ آہستہ رس نکل کر ایک پیالے میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ وہ سارا رس اکٹھا کر کے ڈبوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ گندے ہیر وزے سے کوئی بہت قیمتی تیل تیار ہوتا ہے۔ راستے میں اسے شہتوت کا وہ درخت بھی نظر آیا جس پر شہد کا بہت بڑا چھتا تھا۔ اس کے گرد کھویوں کا ایک جم پھیر طواف کر رہا تھا۔ شہد کی مٹی مٹی مٹی مٹی خوشبو درخت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ عدیل نے سوچا کہ وہ یہ چھتا لے ضرور اتار لے گا۔

ایک کھائی کے کنارے اسے کئی اناروں کا ایک درخت نظر آیا۔ پھلوں کی کثرت سے درخت

جھکا ہوا تھا۔ جو انار بہت لال ہو گئے تھے وہ پھٹ گئے تھے اور ان کے سرخ سرخ دانے نظر آ رہے تھے۔ عبدل نے شاخیں پتی کر کے بہت سے پلے ہوئے انار اپنے تھیلے میں ڈال لیے۔ بندر درخت پر چڑھ کے زور زور سے شاخیں ہلانے لگا۔ اناروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ”مت کرو۔“ عبدل نے غصے سے بندر کی طرف دیکھا۔ بندر نے شاخیں ہلانا بند کر دیا اور اسے کھورنے لگا۔ ”نیچے آؤ۔“ عبدل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ہلایا۔ ”چلو! کٹھنے کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے انار نینے شروع کیے۔ بندر بھی آہستہ آہستہ اس کی تقلید کرنے لگا۔

عبدل نے دیکھا کہ اخروٹ کے درخت کی کئی شاخیں انار کے درخت میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اخروٹ کا درخت خاصا اونچا تھا اور اس میں ہر سے ہر سے اخروٹ لگے ہوئے تھے۔ ”اس درخت پر چڑھ جاؤ۔“ عبدل نے اشارے سے بندر کو اخروٹ کا درخت بتایا۔ بندر اوپر چڑھ گیا۔ عبدل نے ایک پتھر مار کے اخروٹ گرائے۔ بندر کچھ گیا اور تیزی سے شاخیں ہلانے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اخروٹوں کا ڈھیر لگ گیا۔ عبدل نے بندر کو اشارہ کیا کہ ”اتر آؤ۔“ بندر اتر آیا۔ عبدل نے اخروٹ تھیلے میں ڈالے۔ بندر بھی زمین سے اخروٹ اٹھا اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔ تھیلہ پورا بھر گیا۔ عبدل نے ایک کندھے سے تھیلہ لگایا اور دوسرے کندھے پر دی کی لکڑی اٹھائی اور کھانڈی ہاتھ میں لے لی پھر جھوپڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

جھوپڑی میں پہنچ کر عبدل نے اس نے اخروٹ اور انار تھیلے سے نکال کر کچھ پر رکھ دیے تاکہ وہ سوکھ جائیں پھر وہ سوچنے لگا کہ کہیں سے پودینہ مل جائے تو پختی بن سکتی ہے۔ معاً اسے یاد آیا کہ جھنڈے کے کنارے اس نے سبز پودوں کا ایک خوبصورت دیکھا تھا۔ وہ یقیناً پودینہ ہوگا کیونکہ پودینہ پانی

کے قریب اگتا ہے۔ وہ جھنڈے پر گیا۔ سبز قلعہ پودینے کے چھوٹے چھوٹے پودوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے بہت سی پتیاں توڑ کر رومال میں باندھ لیں اور واپس آ کر انہیں لکڑی میں کوٹ کے ان میں اخروٹ کی گری اور نمک مرچ وغیرہ ملائے۔ پختی بن گئی۔ اس نے پختی انگلی سے چھٹی تو اسے زینو کا خیال آ گیا۔ زینو اس کے لیے پودینے کی پختی خاص طور پر بنائی تھی۔ زینو کا یاد کرتے کرتے اس نے نظر اٹھائی تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ بندر نے پودینے کے بہت سے پودے جڑوں سمیت اٹھا رکھے تھے۔ اس نے سارے پودے عبدل کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیے۔ عبدل کو بہت لطف آیا۔

دوسرے دن وہ علی الصباح جھنڈے کی طرف گیا۔ آج وہ بہت مطمئن تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابتدا ہی سے جنگل میں رہ رہا ہے اور جنگل کی فضا اس کی زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ معطر خشک ہوا کے جھوکے اسے لگا لگا رہے تھے۔ گھنڈڑی کے اوپر اور نیچے خورد و پھوس کی چنگڑیوں میں ختم کی پوندیں موتیوں کی طرح لگتی رہی ہیں۔ سبزہ اوس سے بھج کر اور زیادہ سبز ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ آنکھوں کو طراوت بخشنے رہا تھا۔ عبدل نے جھنڈے کے تالاب میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کی کالی داڑھی اس کے گالوں کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مچھلی بڑھ کر ہونٹوں میں آگئی تھیں۔ اس کا رنگ پہلے سے کہیں زیادہ سرخ ہو گیا تھا۔ چہرے سے زخموں اور خراشوں کے نشان کم ہو گئے تھے۔ وہ اپنے جسم میں ایک نئی زندگی اور تازگی محسوس کر رہا تھا کیونکہ اسے بھائی کے کوسنوں اور بھائی کے ڈھڑوں سے نجات مل چکی تھی۔ اب وہ آزاد تھا۔ اس کا جسم اس کا تھا اور اس کی روح اس کی تھی لیکن زینو کی یاد نے البتہ اسے کرب میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ زینو کا سراپا ہر وقت اس کی آنکھوں میں پھرتا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ رات سے موٹا بندر کہیں غائب ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ وہ بے چین ہو کر سوچنے لگا کہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ اسے جس سے لگاؤ ہو جائے، اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کی فوراً محسوس ہوتی ہے جیسے اس کا کوئی حصہ کم ہو گیا ہو۔ گھنڈڑی چڑھتے وقت اس نے دیکھا کہ موٹا بندر اچھلتا کودتا اس کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے ایک بندر یا بھی شرمائی لپاتی ہوئی آ رہی تھی۔ بندر عبدل کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ عبدل نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”دوست! مجھ سے اچھا تو تو ہے کہ اپنی زینو کو لے آیا۔“

بندر یا خوف سے عبدل کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن چوٹے بندر نے عبدل کے ساتھ ساتھ چلتا شروع کیا تو وہ شور مچا چا کے اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگی۔ ”یہ کون ہے بھئی؟ دوست ہے؟“ عبدل نے بندر سے پوچھا۔

بندر نے بندر یا کی طرف ایک نظر دیکھا پھر عبدل کی طرف دیکھ کر دانت نکال دیے۔ عبدل نے کہا۔ ”چلو اچھے! تجھے ایک ساتھی مل گئی۔“ عبدل نے بندر یا کو پتہ چلتا تھا۔ وہ اس سے اپنا بدن چمکانے لگی لیکن بندر نے اسے دھکیل کے عبدل کے قریب کر دیا۔ وہ مطمئن ہو کر بے خوف نظروں سے عبدل کو دیکھنے لگی اور چلتے چلتے اپنا بدن اس کی ٹانگوں کے ساتھ رگڑنے لگی۔ بندر نے غصے سے برا نہیں مانا بلکہ بندر یا کو ستائش اور ممنونیت کے انداز میں دیکھنے لگا۔

جھوپڑی میں پہنچ کر عبدل نے گڑ اور مٹی کا آٹا ملا کر مٹھی روٹیاں پکائیں۔ ایک روٹی اس نے خود لی اور دوسری آدمی توڑ کر بندر کو دی آدمی بندر یا کو۔ پھر وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر بندر اور بندر یا کا تماشا دیکھنے لگا۔ بندر اور بندر یا بچوں کی طرح

ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ بار بار ایک درخت سے دوسرے درخت پر اچھلتے کودتے رہے۔ بندر یا بھی ناراض ہو جاتی تو بندر فوراً اسے سنا لیتا۔ بھی بندر ناراض ہو جاتا تو بندر یا اس کی مٹھیں کرتی۔ عبدل ان کی اٹھیلیاں دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور سوچنے لگا کہ ان کی زندگی انسانوں کی زندگی سے کتنی اچھی ہے۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی غم۔

بندر اور بندر یا کا شور سن کر دوسرے بندر بھی وہاں جمع ہو گئے اور درختوں پر اچھلتے کودنے لگے۔ جنگل میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جب موٹا بندر اپنی بندر یا کے ساتھ تھک کر عبدل کے پاس آ بیٹھا تو بانی بندر منتشر ہو گئے۔

عبدل نے سوچا کہ اب جل کے شہوت کے درخت سے چھتا اٹار لینا چاہیے ورنہ کوئی اور اٹار لے گا اب کمبھوں نے چھتا پوری طرح شہد سے بھر دیا ہوگا۔ چھتے میں سردی کے موسم کا پورا ذخیرہ موجود ہوگا۔ وہ جھوپڑی سے ایک بوری نکال کے لایا۔ اسے اس نے اوپر سے پہنا اور آنکھوں کے پاس چاقو سے دوسرا رخ کر کے اٹار لیا پھر رسیاں چاقو ہاتھوں پر باندھنے کے لیے کپڑا، یہ سب چیزیں تھیلے میں رکھیں اور روانہ ہو گیا۔ بندر بھی اپنی بندر یا کو لے کر اس کے پیچھے چلتے چلتے لگا۔ شہوت کے درخت کے پاس پہنچ کر عبدل نے فضا میں شہد کی اشتہا انگیز خوش بو محسوس کی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ درخت کی چوٹی کے گرد ہزاروں کھانیاں جھنڈا رہی تھیں۔ اس نے تھیلے سے بوری نکال کر کھینچی، ہاتھوں پر کپڑا لپیٹا، تھیلہ کندھ سے لگایا اور درخت پر چڑھنے لگا۔

بندر اور بندر یا نے بھی درخت کا رخ کیا اور کمبھوں میں آگے بڑھ گئے۔ پھر اس سے پہلے کہ عبدل چھتے کے قریب پہنچتا، بندر اور بندر یا نے کمبھوں کو چھٹیڈ لپٹا لپٹا عبدل جیسے ہی چھتے کے ذرا قریب گیا۔ ہزاروں کمبھوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ عبدل

نے کوئی پروا نہیں کی۔ بوری کی وجہ سے وہ قطعی محفوظ تھا۔ اس نے جلدی جلدی جیسے کی جڑوں پر چاقو سے وار کیے۔ چمٹا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے اسے رسی سے باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ جیسے کے ساتھ ساتھ کھیاں بھی نیچے پھیل گئیں۔ عدیل نے زمین پر پھٹنے کے جیسے کے گرد چلو مقرر جمع کر کے آگ لگا دی۔ یکیاں دھوئیں اور آگ سے خوف کھاکے بھاگ گئیں۔

عدیل چمٹا لے کر خوشی مگر واپس آ گیا۔ اس نے چمٹا توڑ کے شہد ایک ڈبے میں بھرا اور خالی چمٹا ہر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا تو بہت سے بندر جیسے کے ٹکڑے چاٹ رہے تھے۔ عدیل کو دیکھ کر وہ چیخنے چلانے لگے۔

اس کے بعد عدیل نے جنگل کے بہت سے درختوں سے جیسے اتارے اور شہد کے ڈبے تقصیا گلی لے جانے کر یا نے والے کو بچ دیے۔ کر یا نے والے نے اس سے کہا کہ وہ ہیشہ کے پھول بھی خشک کر کے لائے اور اخروٹ بھی لائے۔ عدیل نے یہی کیا۔ اس طرح وہ یہ چیزیں بچ کر کھانے پینے کا سامان لاتا رہا۔ اگرچہ اسے یہ سمجھنے ملتے تھے لیکن وہ خوش تھا۔ خوشی کی اس لہر میں کسی بھی اسے زینو کا خیال آ جاتا تو اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی۔

آخر گرمی کا موسم ختم ہونے لگا۔ عدیل نے سوچا کہ سردی کے طویل موسم کے لیے کچھ اناج اور دوسرا سامان جمع کر لیتا چاہیے۔ اس نے لحاف، قو شک اور چابی وغیرہ کی خریداری کی۔ نیز آٹے اور دالوں وغیرہ کا ذخیرہ کر لیا۔ اسے ایک دکان پر لے لے کر پرانے رے نظر آئے، وہ انہیں بھی خرید کر لے آیا۔ اس نے رے درختوں کے ساتھ باندھ کر اپنی جھوپڑی کی چھت پر لٹکا دیے تاکہ بندر جنگل سے آسانی کے ساتھ اس کی جھوپڑی تک آ سکیں۔ بندر پہلے دن لٹکتے ہوئے رے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور دن بھر ان

کے ساتھ جھولتے رہے۔ جنگل میں بندروں کا شور مچ رہا۔ عدیل انہیں دیکھ کر بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسی بھرپور خوشی پہلے ہی محسوس نہیں کی تھی۔ بس ایک چیز کی کمی تھی۔ اگر زینو بھی یہاں آ جائے تو زندگی جنت بن جائے۔ سردی کی پہلی بارش نے بے غلری اور خوش باشی کا دور ختم کر دیا۔ عدیل نے دیکھا کہ جنگل میں ہر طرف پہلے پہلے خشک پتوں کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ ٹھنڈی تیز ہوائیں اڑانی پھر رہی تھی۔ چڑھ اور دیودار کے سوا سارے درخت خشک ہو گئے تھے۔ ان کے ٹنڈ منڈ وجود جب بے چارگی سے ایسا دکھ نظر آتے تھے۔ عدیل کا دل یہ ویران خاموش موجود دیکھ کر ڈوبنے لگا۔ پھر لگا تار بارشیں ہونے لگیں۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر برف و شام کا لے لے کھرے بادل پانی کے دریا و دھبے پر اٹھائے تیرتے ہوئے نظر آتے اور جیسے ہی کسی چوٹی سے ٹکراتے بارش ہونے لگتی۔

رفتہ رفتہ عدیل کے اناج کا ذخیرہ کم ہونے لگا۔ بندر بھی بارشوں کی مسلسل یلغار سے غم آ کے گرم وادیوں میں اتر گئے یا غاروں میں چھپ گئے۔ صرف موٹا بندر اپنی بندریا کے ساتھ اس کے پاس آتا تھا۔ جب وہ واپس نہ جاسکتا تو چلو مقرر کے فرش پر اپنی بندریا کو پھلوں میں لے کے چپ چاپ سو جاتا۔ عدیل بودی کو بھی خود کھاتا انہیں بھی غلا دیتا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ آٹا بالکل ختم ہو گیا ہے اور بندر بھی تھوڑا سا بھرا ہے۔ اخروٹ کھا کھا کر اس کا حلق خراب ہو گیا تھا اور زبان پر چھالے بڑھ گئے تھے۔ بارش ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ باہر جا کر خوراک کیسے تلاش کرے؟ آخر یہ بوقت آجی کر ایک رات وہ تینوں بھوکے سوئے۔ دوسرے دن صبح عدیل نے دروازہ کھولا تو موٹا بندر چپکے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد عدیل نے دیکھا کہ بندر ایک بھاری تھملا کھیتا ہوا لارہا ہے۔ اس نے تھملا

عدیل کے قدموں پر رکھ دیا۔ قیل سے ناشپاتیاں، اخروٹ اور بینگ نکل نکل کر لڑھکے لگے۔ ناشپاتیاں پک کر پہلی ہو گئی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں کسی بے حد محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ بندر نے یہ خوراک کسی غار میں جمع کی ہوگی۔ اس نے ایک ناشپاتی اٹھا کر قیس کے دامن سے صاف کی اور اسے دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگا۔ بھوک کی وجہ سے اسے ناشپاتی بے حد لذیذ محسوس ہوئی۔ دوسری ناشپاتی اس نے اٹھا کر بندریا کو دی۔ بندر یا اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ عدیل نے بندر کی پیٹ چھپائی۔ ”شاباش“ بندر خوش ہو کر قلا بازیاں کھانے لگا۔ بندر یا بھی اسے دیکھ کر قلا بازیاں کھانے لگا۔

ایک رات بندر پور بندریا کہیں غائب تھے۔ عدیل نے ان کے گھر میں دروازہ کھلا رکھا۔ آخر اسے نیند آ گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ نیچے چلو مقرر فرش پر بندر اکیلا سو رہا ہے۔ بھوکا رہنے سے وہ خاصا دبلا ہو گیا تھا۔ اس کی پٹلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ عدیل نے ایک ڈبے سے چند سوکھی خرمانیاں نکال کر کچھ اپنے منہ میں رکھیں، کچھ بندر کے سامنے رکھ دیں۔ بندر نے بہت مشکل سے چبا چکا خرمانیاں حلق سے اتاریں۔ پھر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ عدیل سمجھ گیا کہ وہ خوراک کی تلاش میں گیا ہے۔ بندر یا اس کا ساتھ چھوڑ کر شاید گرم وادیوں کی طرف اتر گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بندر دوبارہ آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عدیل سمجھ گیا کہ اس کی خوراک کا ذخیرہ غالباً ختم ہو گیا ہے یا کوئی دوسرا بندر چرا کر لے گیا ہے۔ عدیل نے سوچا کہ اب خوراک کی تلاش میں اسے خود نکلتا پڑے گا۔

بارش بند ہو چکی تھی لیکن چوٹیوں کے آس پاس بادلوں کی فوج کے پڑاؤ تھے۔ شیشے کی ایک

دیواری سارے آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر طبیعت بوجھل ہو جاتی تھی اور دم گھٹنے لگتا تھا۔ عدیل آہستہ آہستہ چلا ہوا ایٹ آباد مری روڈ پر آیا۔ سڑک کا ایک بڑا حصہ بھرا گیا تھا۔ گھرے ہوئے جیسے بہت سے مزدور پتھر پر پتھر رکھ کر سہارے کے لیے دیوار بنارہے تھے۔ عدیل ان کے قریب پہنچا تو ایک مزدور نے اس سے دریافت کیا۔ ”مزدوری کرو گے؟“

عدیل کچھ سوچنے لگا۔ مزدور نے بتایا۔ ”چھ روپے روزانہ ملے گا اور دو پتھر کا کھانا بھی۔“

”کھانا بھی؟“ عدیل چونکا۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی ایک لہر اٹھی۔

”ہاں کھانا بھی لے گا۔ وہ سامنے مٹی بیٹھا ہے۔ اس کے پاس جا کے اپنا نام لکھوا دو اور اوزار لے کے کام شروع کر دو۔ مزدوروں کی بہت ضرورت ہے۔“

عدیل نے پتھر پر بیٹھے ہوئے آدمی کے پاس جا کے اپنا نام لکھوایا۔ وہاں کدالوں اور بیٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مٹی نے اسے ایک بیٹیا اور ایک کدال دے کے وہ جگہ بتائی جہاں سے مٹی کھودی جا رہی تھی۔ عدیل نے وہاں ایک ہفتے تک کام کیا۔ اس عرصے میں سڑک کی مرمت ہو گئی۔ عدیل کو روزانہ معاوضہ ملتا تھا۔ معاوضے کے روپوں سے وہ کچھ آٹا اور دالیں وغیرہ لے آیا۔ دو دن بعد پھر بارشیں شروع ہو گئیں۔ ایک صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے ارد گرد مکمل سکوت محسوس کیا۔ وہ باہر نکلا۔ آسمان پر افریقہ تاقی اور سفید اور کالے رنگ کی ایک دیپر چادر تھی ہوئی تھی۔ ہر چیز ساکت و صامت تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں تھا۔ ایک پتا بھی نہیں سرک رہا تھا۔ وہ بادلوں کی یہ دعا باز خاموشی سمجھ گیا۔ کوئی طوفان آنے والا تھا۔ اس کی طبیعت بوجھل ہو گئی اور دل پیٹنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان سے اترنے والی

خٹنک اس کا دامغ اور بدن نمند کر رہی ہے پھر آسمان سے سفید روئی کے گالے ناچتے کھومتے ہوئے گرنے لگے۔ کچھ وقفے بعد زمین پہاڑ اور درخت سفید ہونے لگے۔ وہ جمبو پڑی کے دروازے میں بیٹھا ہوا نہ جانے کب تک یہ سحر انگیز تماشا دیکھتا رہا۔ برف گرنے سے پہلے فضا بہت اداس ہوتی ہے لیکن جب برف گرنے لگتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی ہڈی اس نکل رہی ہے۔ پھر ہوا کے تیز جھوکے آئے اور برف اڑ کر اس پر تیرنے لگی۔ عبدال نے اپنی ہڈیوں میں ہولے ہولے خٹنک اترتی محسوس کی۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور آگ جلائی۔ رات گئے تک وہ لپکتے جھپٹتے شعلے دیکھتا رہا۔ آگ کی گرمی میں نئی ہمدردی تھی۔

اس نے بارشوں سے پہلے چڑھ کے گرے ہوئے تھے چکر اور دیودار کی شاخیں تو ذکر جلانے کے لیے لکڑی کا خاصا ذخیرہ کر لیا تھا مگر اب یہ ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ رات کی برف باری کیوجہ سے درختوں کے سبز برف میں دب جائیں گے۔ اگر انہیں نکال بھی لوں گا تو وہ پانی بہت پیچھے ہوں گے اور کسی طرح آگ نہیں پکڑیں گے۔ اس نے دیکھا کہ دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ پانی بہہ کر نیچے آ رہا ہے۔ اس کے پاس رکھی ہوئی ساری لکڑیاں بیگ بھی تھیں۔ آگ کی گرمی سے چھت پر پڑی ہوئی برف پھلنے لگی تھی۔ اس نے اٹھ کر کچھ لکڑیاں اٹھائیں اور انہیں سوکھنے کے لیے الٹاؤں کے گرد رکھ دیا۔ بھاپ نکلنے لگی اور سوسوں کی آواز ہونے لگی۔ اس نے بہت مشکل سے ابھی آگ پر روئی پکائی حالانکہ وہ پار بار بج رہی تھی اور بار بار پچھلیں مارنی پڑتی تھیں۔ اس نے ایک روئی چٹنی کے ساتھ کھائی اور بندر کا انتظار کرنے لگا لیکن اب بندر بھی شاید اس کا ساتھ چھوڑ کے اپنے ساتھیوں کے پاس گرم وادیوں میں چلا گیا تھا۔ عبدال ملول

ہو گیا۔ زینو کے فراق کے بعد یہ فراق اس نے شدت سے محسوس کیا۔ دوسرے دن صبح ہر طرف برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ زمین و آسمان پر ایک سفید خاموشی طاری تھی۔ اس نے جمبو پڑی سے دلی کی آخری لکڑی نکالی اور آگ جلائی پھر روئی پکا کے روکی ہی کھانے لگا۔ اچانک موٹا بندر ٹھٹھرتا ہوا اندر آیا۔ اب وہ اور دبلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پیٹ پشت سے لگ گیا تھا اور آنکھیں اترتی ہوئی تھیں۔ عبدال نے اس کی طرف دیکھا۔

”کہاں رہے دوست؟ بہت دنوں بعد آئے ہو۔“

بندر نے عبدال کی طرف خالی نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ عبدال نے روئی توڑ کے آدھی اسے دے دی۔ بندر روئی لے کے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کھاؤ میرے بار کیا بندر یا کے چلنے سے اداس ہو؟ اسے بھول جاؤ۔ بے وقاؤں کو کھانا دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

بندر نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ چپ چاپ آہستہ آہستہ نوالے توڑ کر کھانے لگا۔ عبدال نے کوٹ پہنا جو تے پہنے تھیلہ کپڑے سے لگایا۔ کھانا کھا کر اس نے برف پر چل رہا تھا۔ اس کا وزن کم تھا شاید اس لیے اس کے پاؤں برف میں نہیں ڈھس رہے تھے۔ وہ دونوں خاصی دیر تک کھوتے رہے لیکن برف میں کوئی تباہ ہوا نظر نہیں آیا۔

ایک جگہ عبدال کو برف ابھری ہوئی دکھائی دی۔ دونوں نے تیزی سے اسے کھودنا شروع

کیا۔ نیچے سے چٹان کا ایک ٹکڑا نکلا۔ وہ دونوں سخت جھنجھلائے۔ بندر کو خٹنک زیادہ محسوس ہوئی تو وہ برف پر قلابا زیاں کھانے لگا۔ اس طرح اس نے چند لمحوں میں اپنا جسم گرم کر لیا۔ عبدال نے بھی خود کو تیزی سے آگے پیچھے کھمایا اور پھر اپنے منہ سے ہاتھ نہایت شدت اور سرعت سے ایک دوسرے کے ساتھ رگڑے۔ تھوڑی دیر بعد اسے حرارت محسوس ہونے لگی۔ اس نے کھانا اٹھائی اور دوبارہ سنے کی تلاش میں آگے بڑھا۔ کچھ دور چل کر آخرا سے ایک تالاب گیا۔ وہ چڑھ کا ایک پرانا درخت تھا۔

دونوں نے تیزی سے برف ہٹائی پھر عبدال نے سبز پکھلائی سے شدید خیر میں لگنی شروع کی۔ کچھ تھوڑی دیر میں چکر اور دلی کی سرخ لکڑی نظر آنے لگی۔ اس نے پھر خیر میں لگنی شروع کی۔ لکڑی لکڑی کے پٹھے گرنے لگے۔ پھر دلی کی کول لکڑی نکلی آئی۔ اس نے لکڑیاں اٹھنی کر کے ان کے گرد مانی دلی کی ایک لکڑی رکھ دی اور باجس سے اسے جلا یا۔ اس کی انگلیاں سردی سے اتنی اڑ گئی تھیں کہ ٹپکی پکڑنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ بہت ساری تیلیاں ضائع ہونے کے بعد آخر ایک تیلی جل گئی۔ دلی کی لکڑی اچھی طرح سوچی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً آگ پکڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں شعلے بلند ہونے لگے۔

عبدال نے اپنے منہ سے ہاتھ ان پر رکھ دیے۔ بہت دیر بعد اسے حرارت محسوس ہوئی۔ شام کے سائے درختوں سے اتر کر ترائیوں میں پھیلنے لگے تھے لیکن برف کی سفیدی کے باعث اندر انہیں ہوا تھا۔ اس نے ہماڑیوں میں دو چٹکی ہوئی نیلی آنکھیں دیکھیں، وہ سوچنے لگا یہ کون سا جانور ہو سکتا ہے۔ یقیناً بیٹھیا ہو گیا۔

عبدال نے لکڑیاں باندھ کر کندھے پر رکھ لیں، کچھ لکڑیاں بندر نے اٹھائیں۔ عبدال چٹکی ہوئی لکڑی دائیں ہاتھ میں لے کر روانہ ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرنے مارنے پر تے ہوئے ہیں۔ عبدال جانتا تھا کہ جب تک چلتی ہوئی مشعل اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس پر حملہ نہیں کریں گے مگر جیسے ہی مشعل بجھی، وہ دانت سکھاتے ہوئے اس پر یلغار کر دیں گے۔

اچانک اس نے برف میں دے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی اور ایک کھڈ میں جا کر لیکن اتفاق سے کھڈ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ کھڈ اسی کے ہاتھ سے دور جا کر البتہ مشعل اس نے مضبوطی سے پکڑے رکھی۔ بیٹھیا غراتے ہوئے کود کر گڑھے کے کنارے پر آ گئے۔ عبدال اچک کر کھڑا ہوا۔

پھر پہلا بیٹھیا اس کی طرف لپکا۔ اس نے چٹکی ہوئی لکڑی اس کے خوف ناک جیزوں میں مضبوطی دی۔ بیٹھیا باجس اور دردی کی شدت سے ہلکا کر بیٹھا۔ اس کے ہونٹ اور بال جھل گئے تھے۔ دوسرے بیٹھیا کے کو بندر نے غرا کے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

عبدال نے لک کے کھانا اٹھائی اور کھما کر دوسرے بیٹھیا کے لیے تھوپی پر ماری کیونکہ وہ بندر پر حملہ کرنے والا تھا۔ کھڈ کی کاوار نشانے پر لگا۔ خون کے فوارے نکلنے لگے۔ بیٹھیا کتے کی طرح چوں چوں کرتا ہوا پیچھے بھاگا۔ پہلا بیٹھیا بھی وہاں سے دور ہٹ کر اپنا جلا ہوا منہ برف میں

برف نے راستے کے سارے نشان مٹا دیے تھے۔ ہر طرف ایک جیسی ترائیاں اور وادیاں تھیں اسے فکر ہوئی کہ وہ راستہ نہ بھول جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو بیٹھیا یوں سے لڑنا پڑے گا۔ اسے معلوم تھا کہ بیٹھیا اس کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ بیٹھیا اب پر کی پکڑ پڑی سے ہو کر آگے نکلے اور ان کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ ان کی نیلی نیلی چٹکی ہوئی آنکھوں میں حرص صاف نظر آ رہی تھی۔ ان کے پیٹ بھوک سے سوکھے ہوئے تھے اور پھلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرنے مارنے پر تے ہوئے ہیں۔ عبدال جانتا تھا کہ جب تک چلتی ہوئی مشعل اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس پر حملہ نہیں کریں گے مگر جیسے ہی مشعل بجھی، وہ دانت سکھاتے ہوئے اس پر یلغار کر دیں گے۔ اچانک اس نے برف میں دے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی اور ایک کھڈ میں جا کر لیکن اتفاق سے کھڈ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ کھڈ اسی کے ہاتھ سے دور جا کر البتہ مشعل اس نے مضبوطی سے پکڑے رکھی۔ بیٹھیا غراتے ہوئے کود کر گڑھے کے کنارے پر آ گئے۔ عبدال اچک کر کھڑا ہوا۔

پھر پہلا بیٹھیا اس کی طرف لپکا۔ اس نے چٹکی ہوئی لکڑی اس کے خوف ناک جیزوں میں مضبوطی دی۔ بیٹھیا باجس اور دردی کی شدت سے ہلکا کر بیٹھا۔ اس کے ہونٹ اور بال جھل گئے تھے۔ دوسرے بیٹھیا کے کو بندر نے غرا کے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

عبدال نے لک کے کھانا اٹھائی اور کھما کر دوسرے بیٹھیا کے لیے تھوپی پر ماری کیونکہ وہ بندر پر حملہ کرنے والا تھا۔ کھڈ کی کاوار نشانے پر لگا۔ خون کے فوارے نکلنے لگے۔ بیٹھیا کتے کی طرح چوں چوں کرتا ہوا پیچھے بھاگا۔ پہلا بیٹھیا بھی وہاں سے دور ہٹ کر اپنا جلا ہوا منہ برف میں

برف نے راستے کے سارے نشان مٹا دیے تھے۔ ہر طرف ایک جیسی ترائیاں اور وادیاں تھیں اسے فکر ہوئی کہ وہ راستہ نہ بھول جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو بیٹھیا یوں سے لڑنا پڑے گا۔ اسے معلوم تھا کہ بیٹھیا اس کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ بیٹھیا اب پر کی پکڑ پڑی سے ہو کر آگے نکلے اور ان کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ ان کی نیلی نیلی چٹکی ہوئی آنکھوں میں حرص صاف نظر آ رہی تھی۔ ان کے پیٹ بھوک سے سوکھے ہوئے تھے اور پھلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مرنے مارنے پر تے ہوئے ہیں۔ عبدال جانتا تھا کہ جب تک چلتی ہوئی مشعل اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس پر حملہ نہیں کریں گے مگر جیسے ہی مشعل بجھی، وہ دانت سکھاتے ہوئے اس پر یلغار کر دیں گے۔ اچانک اس نے برف میں دے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر کھائی اور ایک کھڈ میں جا کر لیکن اتفاق سے کھڈ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ کھڈ اسی کے ہاتھ سے دور جا کر البتہ مشعل اس نے مضبوطی سے پکڑے رکھی۔ بیٹھیا غراتے ہوئے کود کر گڑھے کے کنارے پر آ گئے۔ عبدال اچک کر کھڑا ہوا۔

پھر پہلا بیٹھیا اس کی طرف لپکا۔ اس نے چٹکی ہوئی لکڑی اس کے خوف ناک جیزوں میں مضبوطی دی۔ بیٹھیا باجس اور دردی کی شدت سے ہلکا کر بیٹھا۔ اس کے ہونٹ اور بال جھل گئے تھے۔ دوسرے بیٹھیا کے کو بندر نے غرا کے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

عبدال نے لک کے کھانا اٹھائی اور کھما کر دوسرے بیٹھیا کے لیے تھوپی پر ماری کیونکہ وہ بندر پر حملہ کرنے والا تھا۔ کھڈ کی کاوار نشانے پر لگا۔ خون کے فوارے نکلنے لگے۔ بیٹھیا کتے کی طرح چوں چوں کرتا ہوا پیچھے بھاگا۔ پہلا بیٹھیا بھی وہاں سے دور ہٹ کر اپنا جلا ہوا منہ برف میں

مارنے لگا وہ بری طرح کراہ بھی رہا تھا۔
عبدل نے دلی کی لکڑیاں دوبارہ باندھیں اور انہیں کندھے پر رکھ کر روانہ ہو گیا۔ بندر نے بھی لکڑیاں اٹھائیں اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔
عبدل راستہ بھول گیا تھا لیکن بندر کو راستہ یاد تھا۔ پہلے تو بندر سمجھا نہیں لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ عبدل راستہ بھول گیا ہے۔ اس نے اسے شلوار سے پکڑ کے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عبدل نے اس کی تقلید کی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں جھوپڑی کے پاس پہنچ گئے۔ اگر بندر اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ یقیناً بھٹک جاتا اور بھوکے بھیڑیوں کا غول اسے چیر چاڑھ کے رکھ دیتا۔ وہ ابھی جھوپڑی میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ برف باری شروع ہو گئی۔ عبدل اپنا جسم تو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن بندر کے مجبورے بالوں میں برف کے گالے پھنسے ہوئے اسے بہت اچھٹک رہے تھے۔

جھوپڑی میں داخل ہو کر وہ بہت مسرور ہوا جیسے دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔ وہ دیکھنے برف میں چلا تھا اس لیے اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پاؤں پانی جسم سے الگ ہو گئے ہوں۔ پائلیں بالکل سن گئیں۔ خون کی گردش جیسے بند ہو گئی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں لکڑیوں کی طرح اکڑ گئی تھیں۔ وہ ہاتھ بٹلوں میں رکھ کر گرم کرنے لگا پھر اس نے کودنا شروع کر دیا تا کہ اس کے جسم میں حرارت پیدا ہو۔ بندر نے اسے کوہتے دیکھ کر قہقہے بازیاں کھانی شروع کر دیں۔ خاصی دیر گزرنے کے بعد اسے ذرا پسینہ آیا اس نے اپنا جسم کچھ ڈھیلّا محسوس کیا۔ اب پیروں کا درد کم محسوس ہو رہا تھا اور انگلیاں بھی ذرا نرم پڑ گئی تھیں۔ بندر بھی تھک کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چھپنے لگے۔

عبدل نے لکڑیاں جوڑ کر ان کے درمیان دلی کی لکڑی رکھی اور اسے مایوس دکھائی۔ آگ

جلنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ تاپے خاصی دیر بعد حرارت محسوس ہوئی۔ تب اس نے ہاتھ کھینچ لیے۔ آنے کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ صرف چند اخروٹ باقی تھے اور چند سوکھی ہوئی خربازیاں ڈبے میں پڑی تھیں۔ عبدل نے سوچا کہ اب اسے بھی گرم وادیوں کی طرف جانا پڑے گا ورنہ ایک دن اس کی لاش بھیڑیے سمجھوڑ رہے ہوں گے۔

دوسری صبح عبدل کو بہت سخت بھوک تھی لیکن دوپہر تک اس نے کچھ نہیں کھایا اور جھوپڑی میں ٹھہرا رہا۔ بندر نے بھی باریک دیکھ کر وہاں سے اسے دیکھا پھر چپ چاپ جھوپڑی سے باہر نکل گیا۔ عبدل میں اسے روکنے کی سکت نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ پھر تقریباً دو گھنٹے بعد بندر کی خرخرٹ سے اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے دھندلاہٹ میں دیکھا کہ بندر واپس آ گیا ہے اور اس کے پاس دو روٹیاں بھی ہیں۔ عبدل نے جھپٹ کر روٹیاں لے لیں۔ دونوں روٹیاں تازہ تھیں۔ ایک روٹی تھوڑی سی کھائی ہوئی تھی دوسری روٹی سالم تھی۔ عبدل سمجھ گیا کہ بندر یہ روٹیاں کسی گھر میں کھس کے کسی بچے یا کسی عورت کے ہاتھ سے چپین کے لے آیا ہے۔ عبدل کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا۔ اس نے عمارت کے ساتھ روٹیاں جھوپڑی سے باہر کھینک دیں اور بندر کی طرف نفرت سے دیکھا۔
”اچھا۔ اب تو چوریاں بھی کرنے لگا ہے اچھا! لٹکے انگل جاہیاں سے۔“

بندر اس کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے ندامت اور معذرت کا اظہار کر رہا ہوں۔ چند لمحوں بعد عبدل نے بے قرار ہو کے اسے سینے سے چٹایا اور بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رونے لگا۔ اس روز ان دونوں نے کچھ نہیں کھایا۔

عبدل نے جھوپڑی میں رات بھر آگ جلائے رکھی اور اپنی چار پائی آگ کے نزدیک

کھینچی لیکن اس کے جسم کی ٹھنڈک کم نہیں ہوئی۔ اس نے صبح سویرے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ جوتے ابھی تک پوری طرح نہیں سوکے تھے حالانکہ رات بھر آگ کے قریب رکھے رہے تھے۔ البتہ جرابیں سوکھ گئی تھیں۔ بندر آگ کے پاس لیٹا رہا لیکن آگ کے بہت قریب نہیں آیا۔ وہ آگ سے خوف زدہ تھا۔

عبدل جھوپڑی سے نکل کر بمشکل سڑک تک پہنچا۔ رات کی برف باری نے راستہ مزید خراب کر دیا تھا۔ پاؤں برف میں بہت گہرے دھنس رہے تھے اور انہیں بار بار نکال کر چلنا دو بھر ہو رہا تھا لیکن بندر آسانی سے برف پر چل رہا تھا۔ کچے راستے کے برعکس سڑک پر برف کی تہہ موٹی کم تھی یا اس کے نیچے چونکہ پختہ فرش تھا اس لیے پاؤں زیادہ نہیں دھنس رہے تھے۔ ڈونگا کھلی سے نتھکا کھلی تک راستے بھر کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ ہر ایک سفید اور اتنا ہی خاموشی بھائی ہوئی تھی۔ نتھکا کھلی میں بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک چھٹی دکان کھلی ہوئی تھیں تھی۔ ہوس بھی سارے بند تھے۔ ڈاک خانے اور رئیس خانے کے دروازے بھی مقفل تھے۔

عبدل بہت دیر وہاں کھڑا رہا۔ آخر ایک راہ گیر نظر آیا۔ اس نے عبدل نے پوچھا۔ ”ایٹھ آباد کی بس کہاں سے جاتی ہے؟“

”ٹریفک بند ہو چکا ہے کیونکہ شدید برف باری سے راستہ بے حد خراب ہے۔ ویسے نہیں گزرتی چلتی ہیں۔“ راہ گیر آگے بڑھ گیا۔
کئی گھنٹے چلنے کے بعد عبدل اور بندر گیونٹر کے قریب پہنچے۔ بندر تو خوش خوش اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا لیکن عبدل کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زندگی بھر گیونٹر نہیں پہنچے گے۔ بھوک کے باعث اس کے پیٹ میں طرح طرح کی میسین اٹھ رہی تھیں۔ اس کی ٹانگیں اب مزید چلنے سے انکاری تھیں۔ اچانک اسے ایک سی سی سفید بس نظر آئی۔ وہ بہت خوش ہوا جیسں اس کی ساری

ممبیشیں دور ہو گئی ہوں۔ بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ لوگ کھیل وغیرہ لپٹے ہوئے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ نتھکا کھلی اور گیونٹر کے درمیان برف ٹھہر نہیں سکی تھی اور چڑھ کے ہرے ہرے درخت برف کے سفید پس منظر میں بہت نمایاں اور خوبصورت لگ رہے تھے۔

عبدل سوچنے لگا کہ اب وہ بندر کا کیا بندوبست کرے؟ پندرہس میں نہ معلوم کیا حالات پیش آئیں۔ کہیں اس کے ساتھ بندر بھی خواجواہ خوار نہ ہو۔ اس نے سوچا کہ اگر میں بندر کو گیونٹر ہی میں چھوڑ جاؤ تو نیچے کی گرم وادی میں یہ خود چلا جائے گا۔ اس نے بندر کو ایک درخت پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔

بندر درخت پر چڑھ گیا۔ عبدل آب دیدہ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے منہ پھیرا اور دوڑ کے بس میں بیٹھ گیا۔ بس میں بیٹھ کے اسے بندر کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے بیٹھا رہا۔ پھر بس آہستہ آہستہ چلنے لگی تو اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے لکڑی سے سر نکال کے بندر کو دیکھا۔ بندر درخت سے نیچے اترنے لگا تھا۔ عبدل نے دل پر جبر کر کے اسے دیکھ کر کٹے کا اشارہ کیا۔ بس بندر تیز ہوئی گئی۔ بندر اور عبدل دونوں ایک دوسرے کو حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک موٹر پر دونوں دوست ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے۔ عبدل کو خیال آیا کہ بندر دل میں سوچ رہا ہوگا کہ آدمی نے آکر اس کے ساتھ بے وفائی کی۔

بس تھانی کی چڑھائی چڑھ کر تھوڑا گاؤں کے پاس پہنچی تو گرم ہوا کا جھونکا آیا۔ ہوا زیادہ گرم تو نہیں تھی لیکن نتھکا کھلی کی سخت ہوا سے بدرجہا گرم تھی۔ بس سرسبز اور شاداب وادی سے خراٹے بھرتی ہوئی اڑے پہنچی۔ عبدل ایٹھ آباد کا صاف سترا خوب صورت شہر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شہر میں کئی شان دار عمارتیں تھیں کتنے خوش نما باغات

تھے ہر طرف بیش مار سدا بہار درخت اگے ہوئے تھے اس لیے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ سردی کا موسم ہے پھر اندھیرا ہونے سے کل ہی برتی تھیں جل اٹھیں۔

عبدل کو یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ تنہا گلی میں کیسی دیرانی اور اداس سی اور یہاں کیسی چٹیل پہل ہے کیسی زندگی ہے۔ لوگ ہوٹلوں اور کینوں میں گرم گرم چائے پی رہے تھے اور خوش گہیوں میں مصروف تھے بازار سے گزرتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ کسی ہوٹل میں چائے کا ایک گرم پیالہ پی لے تاکہ اس کے منہ پر ہلکے ہونے جسم کو کچھ سکون مل جائے لیکن اتنے صاف سترے ہوئے دیکھ کے اسے اندر جانے کی جرات نہیں ہوئی۔ پھر اسے ایک گلی میں ایک چائے خانہ نظر آیا۔ وہاں لوگ چادریں اوڑھے اور کبلوں کے نکل مارے گرم گرم چائے کی چٹکیاں لے رہے تھے۔ عبدل بھی اندر چلا گیا۔ چلے اس نے چائے پی پھر کھانا کھایا اور نوکر سے پوچھا ”یہاں رات گزارنے کی کوئی جگہ ہے؟“

”ہاں ہوٹل کے پیچھے ایک سرائے ہے۔“
”تھوڑے پیسے لیں گے؟“
”شاید دو تین روپے۔“

باہر نکل کے عبدل نے پیسے گنے۔ چار روپے تھے۔ وہ سرائے میں ٹھہر گیا۔

صبح عبدل سرائے سے ناشتہ کر کے نکلا تو اس کی جیب خالی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ بسوں کے اڈے پہنچ گیا۔ کئی بیس کھڑی تھیں۔ مزدوران کی چھتوں سے سامان اتار اتار کے گاڑیوں اور تانگوں میں رکھ رہے تھے۔ لوگ انہیں کچھ پیسے دے دیتے تھے۔ عبدل نے بھی آگے بڑھ کے ایک آدمی کا سامان اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک مزدور اوپر سے سامان نیچے دے رہا تھا۔ عبدل نے ابھی ایک ہی صندوق زمین پر رکھا تھا کہ دو بچے کئے مزدوروں نے اسے دھکے

دینے شروع کر دیے ساتھ ہی وہ اسے صلاتیں بھی سنارہے تھے۔ ایک مزدور تو اسے کے مار لگا۔ اس کے کپڑوں سے بچنے کے لیے عبدل نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔ دیکھتے دیکھتے وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور عبدل نے ایک رعب دار آواز سنی۔

”اوکرے! اوکرے! اتر کر بچو! اس غریب کو کیوں مار رہے ہو؟ کیا بات ہے؟“

”خان لالہ!“ ایک مزدور نے غصے سے کہا۔
”یہ پہاڑیا سامان اٹھاتا تھا۔ روز کوئی نہ کوئی بھوکا پہاڑوں سے اتر کے آ جاتا ہے۔ ہماری روزی خراب ہوتی ہے۔“

”اوئے دور ہو۔“ خان لالہ نے مزدوروں کو ہٹا دیا اور عبدل سے پوچھا۔ ”کون ہے تو؟“
عبدل نے خان لالہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمبا ترنگا اور چوڑا آدمی تھا۔ اس کے ہاتھ جیسے چہرے پر بڑے بڑے گلے لگے۔ اس کی طرف کھڑکی مارے ہوئے تھے۔ اس کی کھڑکی سے گھورتی ہوئی کئی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ وہ بوکسی کی شلوار زیب اور بھوری پٹی کا کمرہ غانی کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ عبدل نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ ”جی میں عبدل ہوں۔“

”یہاں کیا کر رہا تھا؟“
”مزدوری۔“ عبدل نے شکموں سے دوسرے مزدوروں کی طرف دیکھا۔
خالہ لالہ نے سوال کیا۔ ”یہاں سے آیا ہے؟“

”تنہا گلی سے۔“
خان لالہ نے پوچھا۔ ”کیا وہاں برف پڑ گئی؟“ عبدل نے اثبات میں سر ہلایا۔ خان لالہ بولا۔ ”مزدوری کرے گا؟“
”جی کروں گا۔“ عبدل نے زور سے گردن ہلائی۔

خان لالہ نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ رات

اڈے کے پیچھے سرائے میں آ جاتا۔ تیرے منہ پر کا بندوبست ہو جائے گا۔“ پھر اس نے مزدوروں کو ڈانٹا۔ ”خزیر کے بچو! کیا یہ تمہارے باپ کا اڈا ہے۔ غریب آدمی کو ستاتے ہو۔ چلو جتنے پیسے تمہارے پاس ہیں وہ نکالو اور اسے دو۔ یہ جرمانہ ہے۔“ دونوں مزدوروں نے بھکاری سے پانچ پانچ روپے نکال کر عبدل کو دے دیے۔ عبدل نے خان لالہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ عبدل نے روپے لے لیے۔ خان لالہ نے اس کی پشت تھپ تھپائی۔ ”اب مزے سے مزدوری کر! کوئی تیس روپے کا۔“

اڈے پر عبدل روزانہ دس بارہ روپے کما لیتا اور خان لالہ کی سرائے میں کھانا کھاتا۔ رقتہ رقتہ اس نے روپے بچانے شروع کر دیے اور خان لالہ کے پاس امانت رکھواتا رہا۔ مزدوروں کے اکسائے پر اس نے ہلکی سی منڈوا کے چھوٹی چھوٹی تلوار مارا کہ موچیں رکھ لی تھیں۔ جب کسی دن وہ نہادھو کے اور دھوپ کے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر مزدوروں کے ساتھ بیٹھا جاتا تو اپنے آپ کو بدلا بدلا محسوس کرتا۔ وہ حیران ہوتا کہ اس کے بھائی اور بھائی اسے بیوقوف کیوں سمجھتے تھے۔

نئی شروع ہوتے ہی اس کے دل میں کھد کھد ہونے لگی۔ وہ ڈونگا گلی واپس جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی خواہش اپنے ساتھیوں کو بتائی۔ انہوں نے اسے سختی سے منع کیا اور کہا کہ کمانی کا زمانہ تو اب آیا ہے۔ ہزاروں سیاح اور امرا سپر کرنے اور گری گزارنے آئیں گے، اپنی آمدنی کئی گنا بڑھ جائے گی اور شہر میں بڑی کھانسی ہوگی۔ رنگ برنگے لوگ، دلکش عورتیں اور شوخ و شراب لڑکیاں سڑکوں پر مرگفت کرتی نظر آئیں گی لیکن عبدل نہیں مانا۔ اس تو اپنے جنگل کی یاد ستا رہی تھی۔

اس نے خان لالہ سے جمع پونجی لی ایک بڑے صندوق میں کپڑے اور دوسرا سامان رکھا

اور ڈونگا گلی کی بس میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔
بازار گلی کے پاس پہنچتے ہی ہوا کے معطر جھونکوں نے اس کا حیر مقدم کیا۔ چڑھ کے گنجان درختوں نے سڑک پر ایک ٹھنڈی چھاؤں پھیلائی ہوئی تھی۔ ہر طرف سبز سبز تھا۔ آنکھیں راحت حاصل کر رہی تھیں۔ درختوں کے ساتھ ٹھونے لگے ہوئے تھے۔ چناروں کے نئے پتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ عبدل نے دیکھا کہ شہوت کے ایک درخت گردھیاں مہینٹا رہی ہیں اور اس کے پاس والے اخروٹ کے درخت میں چھوٹے چھوٹے دانے نکل آئے ہیں۔ جنگل کی ساری نباتات اسے خوش آمدید کہہ رہی تھیں اور حیوانات تو اس کی واپسی کا باقاعدہ جشن منائیں گے۔

☆.....☆.....☆

وہ جیسی جیسی سانس لے رہا تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر کی ساری گندکی صاف ہو رہی ہے۔ وہ ہماری صندوق کندھے پر اٹھا کے اپنی جھوپڑی کی طرف بڑے بڑے ڈگ بھرنے لگا اور سوچنے لگا کہ نہ جانے اب اس کی جھوپڑی وہاں موجود ہے بھی یا نہیں؟ ممکن ہے اس کا سامان کوئی نکال کر لے گیا ہو مگر اس کی جھوپڑی موجود تھی۔ وہ جھوپڑی کے سامنے پہنچا تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ جھوپڑی کے سامنے والے قلعے میں اونچی اونچی سبز ٹھیکیں گھاس اگی ہوئی تھی۔ کناروں پر رنگ برنگے پھولوں کے تختے پھیلے ہوئے تھے۔

بندروں کا پورا غول جھوپڑی کے گرد درختوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک انجینی کو اپنی طرف آنا دیکھا تو چیخا چلانا شروع کر دیا اور ایک درخت سے کود کر دوسرے درخت پر جانے لگے۔ جب وہ جھوپڑی کے بالکل قریب پہنچا تو موٹا بندر ایک درخت سے کودا اور پھر کی کے ساتھ

اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس نے خوش سے ایک نعرہ بلند کیا۔ ایک بندر یا کوکر مونٹے بندر کے پاس آئی۔ عدل نے دیکھا کہ یہ وہ بندر یا نہیں ہے جو گزشتہ سال اس کے ساتھ تھی۔ اس نے حسرت سے سوچا جانوروں میں کتنی آزادی ہے؟ تو نہیں اور کبھی اور نہیں اور کبھی۔ پھر اس نے بندر کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔

”دوست! چھٹی والی کوچھو دیا؟“ اس نے بندر یا کی طرف اشارہ کیا۔
”جی سے دوستی کرتی؟“ بندر نے اس طرح اسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ وہ خود مجھے چھو کر چلی گئی تھی۔

”تو کیا اس بے مروت کے لیے میں قیامت تک تیری آغوش پر ہتا؟“

عدل نے آگے بڑھ کے بندر سے ہاتھ ملایا۔ بندر یا نے بھی شرماتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ عدل نے اس سے بھی ہاتھ ملایا اور زنجیر کھول کے صندوق اندر لے گیا۔ صندوق سے اس نے مٹی گولیاں کا موی لافظہ نکالا اور باہر آیا۔ لافظہ کھول کے دو گولیاں اس نے بندر کی طرف پھینکیں اور دو بندر یا کی طرف دونوں نے گولیاں پہلے سوگھیں پھر منہ میں ڈالیں اور دانٹوں سے چبا کے ان کا ذائقہ محسوس کیا۔ بندر خوش ہو کے چلایا۔ بندر یا بھی خوشی سے چلائی۔ دوسرے بندر جس کے باعث درختوں سے اترنے لگے۔ بندر اور بندر یا نے میدان میں قلابازیاں کھانی شروع کر دیں۔ عدل زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے دوسرے بندروں کی طرف بھی گولیاں پھینکیں مگر مونٹے بندر نے دوسرے بندروں کو مار مار کر دور ہٹا دیا اور ساری گولیاں خود اٹھائیں۔ عدل نے اسے ڈانٹا۔

”اب یہ کیا حرکت؟ تم اتنے خود غرض ہو گئے ہو یا درکھنا بہت پٹائی کروں گا۔ چلو واپس کرو

سب کی گولیاں۔“ اس نے اشاروں سے اسے اپنی بات سمجھائی۔ بندر نے سب کی گولیاں واپس کر دیں۔

”شباباش! ہمیشہ بل بانش کے کھانا چاہیے۔“ عدل خوش ہو گیا۔

اس نے لافظہ سے مزید گولیاں نکال کر دوسرے بندروں کی طرف پھینکیں انہوں نے گولیاں لے کر سوگھیں پھر انہیں منہ میں ڈال کے درختوں پر چڑھ گئے اور گولیاں کھاتے کھاتے مسرت کے ساتھ ایک درخت سے دوسرے درخت پر پھلانگتے گئے۔ ان کے شور سے سارا جنگل بھر گیا۔ عدل کو ایسا لگا جیسے وہ اپنے جج اور پر خلوص دوستوں میں واپس آ گیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ مونٹا بندر منہ بسورے ایک طرف کھڑا ہے اور بندر یا بھی چپ چپ اس کی پاس بیٹھی ہے۔ عدل ہنستا ہوا ان کے پاس گیا۔ ”کیوں دوست! کیا ناراض ہو گئے ہو؟ پھلا اپنی بات بھی ناراض ہوتے ہیں۔ خیر یہ اور لے لوں دوسروں کا کھہ نہیں لیتے۔ سمجھ۔“

اس نے گولیوں سے بھری ہوئی مٹی اس کے سامنے کر دی۔ بندر نے ٹیڑھی آنکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ عدل مسکرایا۔ بندر نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے چند گولیاں لے لیں۔ پھر عدل نے بندر یا کی طرف گولیاں بڑھائیں اس نے گولیاں لینے سے پہلے اس طرح بندر کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ ”لے لوں؟“ بندر نے جواب میں اپنی ناراضی ظاہر نہیں کی۔ بندر یا نے ایک کراس کے ہاتھ سے گولیاں لے لی اور خوشی کے اہار میں ایک فلا بازی کھائی۔ بندر چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا پھر وہ بھی فلا بازی ایاں کھانے لگا۔ بندر یا دوڑ کر ایک منڈ پر چڑھ گئی۔ بندر بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ بندر یا منڈ پر سے کود کے جمونپڑی کی چھت پر آئی وہاں سے ایک کے اس نے رسا پکڑا اور اس کے ساتھ لگتی ہوئی درخت پر چڑھ

گئی۔ وہاں سے وہ دوسرے درخت پر کود گئی۔ بندر نے اس کا تعاقب کیا۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے درختوں میں غائب ہو گئے۔ دیر تک ان کا شور سنائی دیتا رہا۔ عدل اطمینان سے جمونپڑی میں آ گیا۔ اس نے کوٹ اتار کے ایک کھونٹی پر لٹکا دیا اور ایک ڈنڈا لے کے بستر چھاڑنے لگا۔ بستر پر چھوٹی سی ایک موٹی تہہ جھکی تھی۔ اس نے ٹرک کھول کر ایک کپڑا نکالا پھر تو ٹرک اور لاف کپڑے سے رگڑ رگڑ کے صاف کرنے لگا۔

دوسرے دن وہ تھیکا سکی سے آنا دالیں اور کھی خرید لایا۔ بندر اور بندر یا کی جمونپڑی میں مستقل رہنے لگے تھے۔ اگر کسی دن وہ نہیں چلے جاتے تو عدل نے قہر سے مار ہوجاتا۔ اس کا دل نہ چاہتا کہ ان کے بغیر کھائے ہے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی روٹی کا انحصار جنگل پر ہے تو اسے بھی ابھی سے کام لگانا ہوگا۔ تیسرے دن اس نے مونج پوری کی ترانہوں سے شروع ہو کے میرا جانی کی چوٹیوں تک سارا جنگل چھان مارا اور جن جن درختوں پر شہد کے چتے نظر آئے ان پر چاقو مارنے لگا۔ شہد کے نشان کھود دیے۔ اخروٹ اور شہتوت کے درختوں پر بھی اس نے نشانات لگائے۔

ایک دن صبح اٹھ کر اس نے میرا جانی کی بلندی کے پاس ایک پرانے درخت کی چوٹی پر ایک بہت بڑا چھتا اتارنے کی تیاری کی۔ اینٹ آباد سے وہ اس مقصد کے لیے جری دستانے لے آیا تھا تاکہ چھتا اتارنے کے وقت کھیاں نہ نکالیں اس نے ایک کھڑی سے لمبی لمبی موٹی جرائیں بھی خریدی تھیں تاکہ کوئی مٹی اس کی پٹلیوں پر ڈنک نہ مار سکے۔ اس نے جرائیں پہن لیں۔ دستانے رسیاں اور چاقو وغیرہ تھیلے میں ڈال لیے پھر مونٹے بندر اور بندر یا کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے بہت دیر انتظار کیا لیکن وہ نہیں آئے۔ آخر عدل روانہ ہو گیا۔ وہ ایک چوٹی کے قریب پہنچا

تو اسے بندروں کا چھتا چلاتا سنائی دیا۔ یہ آوازیں ایسی تھیں جیسے کوئی شخص بندروں کو پیٹ رہا ہو۔ عدل جلدی جلدی چوٹی عبور کر کے ایک چھوٹے سے میدان میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ایک منگے کے منہ میں چھ سات بندروں نے ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں اور ایک سانولا سا تہبند والا آدمی ایک چھتری سے انہیں پیٹ رہا ہے اور ان کے ہاتھ پاؤں ایک رسی سے باندھ رہا ہے۔ عدل فوراً اٹھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ بندر پکڑنے کا یہ طریقہ بہت پرانا تھا۔ کسی منگے یا تنگ منہ کے کسی اور برتن میں سیب یا ناشائیاں ڈال دی جاتی ہیں اور وہ برتن بندروں کے بسیرے کے پاس رکھ دیا جاتا ہے۔ بندر کھانے کی چیزیں دیکھ کر آتے ہیں اور برتن میں ایک ساتھ اپنے اپنے ہاتھ ڈال دیتے ہیں پھر سیب یا ناشائیاں مٹی میں پکڑ کے ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھل پکڑنے سے ان کی مٹھیاں بڑی ہوجاتی ہیں اور تمام بندر بیک وقت اپنے ہاتھ باہر نکالنا چاہتے ہیں اس لیے سب کے ہاتھ برتن کے تنگ منہ میں چپس جاتے ہیں۔ بندر نہ پھل چھوڑتے ہیں نہ ہاتھ باہر نکال سکتے ہیں۔ شکاری آ کے انہیں رسیوں سے باندھ لیتا ہے۔

عدل چھتا میں مارتا ہوا اس آدمی کے پاس پہنچ گیا اور کھڑی کے دستے سے اسے ضرب لگائی۔ اس آدمی نے چھتری سے عدل کا مقابلہ شروع کیا مگر پیچھے ہٹ گیا۔ عدل نے ہاتھ روک لیا اور کمرنگ دار آواز میں پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

بندروں کو کیوں مار رہے ہو؟

”تم کون ہو پوچھنے والے؟ بندر کوئی تمہارے رشتے دار ہیں؟“

”بندر میرے دوست ہیں سارے جنگل کے بندر۔“ عدل نے سینہ چلا کے کہا۔
”میں ہر سال بہت سے بندر پکڑ کے لے جاتا ہوں آج کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

”میرے لیے یہ نئی بات ہے۔ اس سال تم ایک بھی بندر نہیں پکڑ سکتے۔“

”کیوں؟“ اس شخص نے سیکھے لہجے میں پوچھا۔

”اس لیے کہ یہ میرے دوست ہیں میں ان کا محافظ ہوں۔“

”جنگل تمہارا نہیں ہے۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔“

”ہاں“ جنگل میرا نہیں ہے لیکن بندر میرے ہیں میں نہیں روک سکتا ہوں۔“

وہ شخص بھنبھلاہٹ سے عبدل کو دیکھ رہا تھا۔

بندر خاموشی سے ان کی گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرے بندروں کے ساتھ موٹا بندر اور اس کی بندر یا بھی منگے میں ہاتھ پھنسانے ہوئے تھے۔ عبدل نے آگے بڑھ کے منکا توڑ دیا۔ بندر پھنسے ہوئے ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ سے ملتے ہوئے درختوں پر چڑھ گئے اور خوشی سے چیخنے لگے۔ عبدل نے موٹے بندر کے سر پر ایک چپٹ باری۔

”تم بڑے لاچاپی ہو۔“ بندر نے آنکھیں پٹی کر لیں۔

عبدل نے اس شخص سے کہا۔ ”جاؤ یہاں سے دُش ہو جاؤ۔“ آئندہ بندر پکڑنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ پائیں تو زوروں گا۔“ عبدل کے لہجے میں ایسی سختی تھی کہ وہ شخص ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔

بس منگ کھڑا رہا۔ عبدل کھانڈی کے دستے سے ٹیک لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ موٹا بندر اور بندر یا بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ وہ آدی پکارا۔

”سنو بھائی!“

عبدل رک گیا۔ ”کیا بات ہے؟“

”دیکھو تم میرے کام میں دخل نہ دو۔ بندر پکڑنا اور سدھانا میرا پیشہ ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں اس جنگل سے تمہیں بندر نہیں پکڑنے دوں گا۔“

”میں بھوکا مر جاؤں گا۔“ اس آدی نے

لجابت سے کہا۔

”مر جاؤ لیکن میں بندر نہیں پکڑنے دوں گا۔“

عبدل آگے بڑھ گیا۔ وہ آدی اس کا پچھا کرنے لگا۔ عبدل نے میرا جان کی چوٹی کے پاس پہنچ کر چڑھ کے ایک بڑے درخت کی چوٹ سے شہد کا چھتا اتارا۔ چھتا اتار کے وہ نیچے پھپھاتا

اس آدی نے آگ جلائی ہوئی تھی۔ وہ دھوئیں اور آگ سے کلیاں فوراً بھاگ گئیں۔ وہ شخص عبدل کے قریب آیا۔ ”لاؤ مجھے دے دو تم تھک گئے ہو گے۔“

عبدل نے سوچا کہ انکار کر دے لیکن اس آدی کی عاجزی دیکھ کر اس نے چھتا اس کے حوالے کر دیا اور وہ دونوں آہستہ آہستہ جھوپڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ بندر اور بندر یا دونوں

اس آدی سے اب بھی خائف تھے اور گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ جھوپڑی کے قریب پہنچے تو رسوں سے لٹکے ہوئے درختوں پر بیٹھے ہوئے اور میدان میں فلا زیاں کھاتے

ہوئے بندر ادم چمانے لگے۔ وہ شخص حیران رہ گیا۔ بندروں نے عبدل کو دیکھتے ہی دھماچوڑی شروع کر دی تھی لیکن ایک باجی کو دیکھ کر وہ جلدی جلدی درختوں پر چڑھ گئے اور اسے گھورنے لگے۔ عبدل چھتا لے کے جھوپڑی میں چلا گیا۔

چند لمحوں بعد اس نے اس شخص کو پکارا۔ ”آؤ۔“ وہ شخص چپ چاپ اندر آیا۔ عبدل نے اسے چار پانی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود گلو کی کی بیڑھی پر بیٹھ کے چھتا توڑنے لگا۔ چھتا توڑ کے اس نے خمد لوہے کے گن میں ڈال دیا اور پختے کے گلا اٹھا کر باہر پھینک دیے پھر اوپر کاٹرس سے بوتلیں اتاریں اور ان کے کارک کھول کر انہیں شہد سے بھرا۔ جو شہد گن میں گرہ گیا تھا اسے اس نے روٹی کے نوالے سے صاف کیا اور نوالہ منہ میں ڈال لیا۔ پھر اس نے گڑ کی چائے بنائی۔ ایک

پيال خود لیا، ایک اس آدی کو دیا اور ایک کپڑے میں لپی ہوئی تکی کی چٹنی روٹی کے ٹکڑے اس کے سامنے رکھ دیے۔ ایک گلا اس نے خود بھی لے لیا۔ وہ آدی نہایت غور سے عبدل کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کھاؤ۔“ عبدل نے کہا۔

اس شخص نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کے منہ میں رکھا اور اوپر سے چائے کا گھونٹ لے لیا۔ تھوڑے دیر بعد موٹا بندر اور بندر یا بھی اندر آ گئے۔ وہ ابھی تک اس آدی کو خشک سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں عبدل کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ عبدل نے روٹی کا ایک ایک ٹکڑا انہیں بھی دیا اور اس آدی سے کہا۔ ”دیکھ رہے ہو نا۔ یہ سارے بندر میرے دوست ہیں۔“

”ہاں“ وہ دیکھ رہا ہوں۔“

”اب تم سوچو۔“ بھلا میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ کوئی میرے دوستوں کو کچلے اور مارے پھینے۔“

”میں بندروں کو بڑے پیار سے رکھتا ہوں اور انہیں سدھاتا ہوں۔“

”لیکن تم انہیں بہت بے دردی سے مار رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے تم بڑے ظالم آدی ہو۔“

”میں نے تو انہیں صرف باندھنے کے لیے ڈرا سا مارا تھا۔ میں ان پر ظلم کیسے کر سکتا ہوں۔ میری تو روزی ان سے وابستہ ہے۔“

”کیا تم بندر بیچنے کا کام کرتے ہو؟“

”میں ہر سال دس بارہ بندر پکڑ کے لے جاتا ہوں اور انہیں سدھاتا ہوں۔ اس کے بعد ایک جوڑا اپنے پاس رکھ لیتا ہوں باقی دوسرے مدار یوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔ میں خود بھی مداری ہوں۔ لوگوں کو کتنا شے دکھاتا ہوں اور بہار کا موسم آتا ہے تو وہ جوڑا بھی بیچ دیتا ہوں اور یہاں آ کے پھر بندر پکڑ کے لے جاتا ہوں۔“

”تم یہ کام چھوڑ کے کوئی دوسری مزدوری

نہیں کر سکتے کیا؟“

”مجھے اور کوئی کام نہیں آتا۔ یہ کام نہیں کروں گا تو بھوکا مر جاؤں گا۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ عبدل کو اس سے ہمدردی ہوئی وہ اٹھ کر ٹپکٹپک اور سوچنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے رک کے کہا۔ ”ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ میرا دل نہیں مانتا لیکن میری طرح تم بھی غریب آدی ہو اس لیے میں تمہیں اس کام سے منع نہیں کر سکتا۔“ وہ شخص سوالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عبدل بولا۔

”تم چند روز میرے پاس رہو۔ چند روز میں کچھ بندر تم سے مانوس ہو جائیں گے اور تمہارے دوست بن جائیں گے۔ پھر تم انہیں اپنے ساتھ لے جانا لیکن ایک شرط ہے۔“

وہ شخص بہت قشور تھا۔ عبدل نے کہا۔ ”تم ان پر ظلم نہیں کرو گے۔ بندروں کو اپنا دوست اور بھائی سمجھو گے ان کے ساتھ ایسا سلوک کر دو گے جیسا انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں انہیں اپنے بچے سمجھوں گا۔“

”ایک بات یاد رکھنا۔ عبدل نے تنبیہ کی۔ اگر تمہاری نیت میں کوئی خرابی ہے تو بندر بڑے سانسے ہوتے ہیں کوئی تمہارے پاس نہیں آئے گا۔“

”میری نیت میں کوئی خرابی نہیں ہے۔“

مداری دس بارہ دن تک اس کے پاس رہا۔ اس مدت میں چھ بندر اس سے مانوس ہو گئے۔ وہ انہیں لے کے چلا گیا۔ چلتے وقت اس نے انہیں رسی سے باندھ لیا تھا۔ عبدل نہیں چاہتا تھا کہ بندر رسی سے باندھیں جائیں لیکن مداری نے بتایا کہ یہ رسی میں چڑھتے وقت ادھر ادھر بھاگ جائیں گے اور لوگوں کو تنگ کریں گے۔ عبدل چپ ہو گیا اس کی باتیں بیگ کر لیں۔

ایک دن صبح عبدل ناشتے کے بعد تھپتھلا

231

کندھے سے لٹکائے کھاڑی ہاتھ میں لیے جھوپڑی سے نکلا۔ سامنے کی گڈبڑی سے تین آدمی اتر کر جھوپڑی کی طرف آرہے تھے۔ عبدال رک گیا۔ سامنے لے رنگ کا ایک موٹا سا گول مول آدمی سب سے آگے تھا۔ وہ چوڑی ٹیک ٹیک کر ہنساتا احتیاط سے اتر رہا تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ وہ پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ نہیں رکھتا ہے اور شاید پہلی دفعہ ایسے راستے پر چل رہا ہے۔ اس کے پیچھے ایک گورا چٹا آدمی تھا۔ وہ کرم کوٹ اور کلا پٹلون پہنے ہوئے تھا۔ تیسرا آدمی شلوار قمیض میں ملبوس تھا یہ کوئی مقامی شخص معلوم ہوتا تھا۔ انجنیوں کو دیکھ کر بندر حسب معمول چیخنے چلانے لگے۔ موٹا بندر اور بندر یا جلدی سے عبدال کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ مقامی آدمی نے آگے بڑھ کر عبدال سے پوچھا۔ ”کیا تمہارا نام عبدال ہے؟“

”جی ہاں۔“ عبدال نے کچھ جھجک کے جواب دیا۔ شخص نے گول مول آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ہاشم سیٹھ ہیں۔ کراچی سے آئے ہیں۔“ پھر اس نے کوٹ پٹلون والے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ سلیم خاں صاحب ہیں۔ صنعت و حرفت کے محکمے میں افسر ہیں۔ ہاشم سیٹھ کچھ بندر پکڑ کے دوسرے ملکوں کو بھیجتا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حکومت سے اجازت لے لی ہے۔ سلیم خاں صاحب انہیں میرے پاس لے کر آئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جنگل میں ایک آدمی عبدال رہتا ہے۔ بندر اس سے بہت مانوس ہیں۔ ہمیں اس سے ملنا چاہیے۔ وہ صرف دو چار دونوں میں ہمیں بہت سے بندر پکڑ دے گا۔ ہمیں بندر پکڑنے کی مصیبت خود نہیں اٹھانی پڑے گی۔“

”چرا؟“ گول مول آدمی نے عبدال کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ موٹا بندر اس کی طرف گھور

کے غرایا۔ گول مول آدمی فوراً پیچھے ہٹ گیا اور کھائی پٹی پہنے لگا۔ بولا۔ ”ہم برس برس جباروں کی کھالیں برتن کپڑے اور دوسرا سامان دوسرے ملکوں کو بھیجتا ہے۔ اس برس ایک پارٹی نے بندروں کی ایک پورٹ کا آرڈر دیا ہے۔ ہم نے سوچا انکار کر دو بے فروسچا مال اچھا نہیں لگتا اور نارتھ کے جنگل میں بہت بندر ہے۔ ہم بھی پیسہ کمائیں گا اور کسٹری کو کبھی فارن ایجنٹس ملیں گا۔“

عبدال ہکا ہکا تھا۔ مقامی شخص نے ہاشم سیٹھ سے کہا۔ ”سیٹھ عبدال بہت سیدھا آدمی ہے۔ یہ فارن ایجنٹس اور ایک پورٹ وغیرہ کی بات کیا جانے۔ آپ تو اس سے یہ سوچا کیجئے کہ یہ ایک بندر پکڑنے کے کتنے پیسے لے گا۔“

”میرا خیال ہے دس روپے فی بندر کافی ہوگا۔“ سلیم خاں نے کہا۔ ”کیوں عبدال ایک بندر پکڑنے کے کتنے پیسے لے گا؟“

عبدال چند لمحوں تک عجیب نظروں سے باری باری انہیں گھورتا رہا پھر بھاری آواز میں بولا۔ ”میں بندر نہیں پکڑوں گا اور تم لوگوں کو بھی نہیں پکڑنے دوں گا۔“

”کیا بے کو؟“ ہاشم سیٹھ نے ہلکی جھپکائی۔ ”کیا پیسہ کتنی ہے؟ ایک بندر کا کتنی روپیہ لے لو۔“

عبدال کے چہرے پر ابھرن پیدا ہوئی۔ ”میں نے ملک والے اتنے بہت سے بندروں کا کیا کریں گے؟“

”سمجھئے کی کوشش کرو مسٹر!“ سلیم خاں نے سمجھایا۔ ”یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ وہ بندروں کی چہ پھاڑ کر کے ان پر کچھ تجربے کریں گے بعض بیماریاں انسانوں کی موت کا سبب بن جاتی ہیں۔ باہر کے سائنس دان ان کے اثرات بندروں پر آزمائیں گے۔ انسانی جائیں بچانے کے لیے بندروں سے کام لیا جائے گا۔“

”بندروں کی چہ پھاڑ کریں گے؟“ عبدال کی آنکھیں کھیل کھیلیں اور چہرہ ہنستا لگا۔ ”ہاں ہاں۔ اس میں جبرانی کی کیا بات ہے۔ جب تک انہیں چہ پھاڑا نہیں جائے گا ان پر تجربہ بات کیسے ہو سکتے ہیں۔“

عبدال نے غصہ دباتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ ”میں اس بے رحمی میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں غریب ضرور ہوں لیکن لاپچی اور ظالم نہیں ہوں۔“

”یہ تو ایک سائنسی کام ہے۔ اس میں بے رحمی کا کیا سوال ہے۔“

”بندر میرے دوست ہیں، میں انہیں ہلاک نہیں ہونے دوں گا۔“

عبدال کی دوست نہیں ہوتے۔ فضول باتیں نہ کرو۔ ”ایک بندر کے کتنے پیسے لو گے؟ ان پیسوں سے تم آسانی کے ساتھ شادی کر سکتے ہو۔“ سلیم خاں ہنسا۔

”مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ عبدال ہنسا کے بولا۔

ہاشم سیٹھ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا ایک بندر کا تیس روپیہ کتنی ہے؟ تم بولو کیا مانگا ہے؟“ بندر پھر غرایا۔ ہاشم سیٹھ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ ”کیا لے گا تو نہیں؟“

عبدال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلیم خاں بیزاری سے بولا۔ ”صاف صاف بتاؤ۔ تم بندر پکڑ کر دو گے یا نہیں؟“

”نہیں۔“ دل نے دانت کچکا کچکا فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”اچھا۔ ہم کوئی اور انتظام کر لیں گے۔“ سلیم خاں بولا۔ ”آجے سیٹھ صاحب اپلیں۔“ وہ تینوں واپسی کے لیے مڑ گئے۔ عبدال غصے سے کھولنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب یہ لوگ مقامی شکار یوں کی مدد سے دام لگا کر بندر پکڑیں گے۔ کیا میں کسی طرح ان کا منصوبہ ناکام بنا سکتا ہوں۔

دوسرے دن وہ اپنی جھوپڑی سے اوپر والی ترابی میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک چٹان کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ لوگ بندر پکڑنے کے لیے اسی ترابی میں دام لگائیں گے اس لیے کہ اس کی وجہ سے بہت سارے بندر وہاں آتے تھے۔ وہ شام تک انتظار کرتا رہا لیکن کوئی نہیں آیا۔ دوسرے دن بھی وہ وہاں چھپ کے بیٹھا مگر یہ دن بھی انتظار میں گزر گیا۔ شام کو اس نے سوچا کہ شاید ان لوگوں نے کسی دوسری ترابی میں بندر پکڑنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ تیسرے روز وہ اپنی جھوپڑی سے مغرب کی طرف ایک ترابی میں گیا لیکن وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ترابی ویران نظر آئی۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ شاید وہ لوگ اپنا ارادہ ترک کر کے واپس چلے گئے ہیں پھر بھی وہ شام تک ایک چٹان کے پیچھے بیٹھا رہا۔ جب شام گہری ہونے لگی اور سورج کا سنہرا رتھ چھا لگا گئی کی چوٹی کے پیچھے اتر گیا تو وہ اپنی جھوپڑی کی طرف دانہ ہوا۔ چلتے چلتے اچانک ایک چٹان سے اس کا پاؤں پھٹا اور وہ نیچے میدان میں جا کر گرا۔ گرے ہی کسی نہایت خوف ناک چیز نے اس کا پاؤں اپنی اپنی گرفت میں لے لیا اور دو لمبی لمبی تیز میٹیں اس کے ٹخنوں سے اوپر پٹولیوں کے گوشت میں پھنس گئیں۔ وہ تکلیف سے بلبلے کے اچھلا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا پاؤں لوہے کے ایک ٹکڑے میں پھنس گیا ہے۔

وہ اپنے آپ کو سنجال نہیں سکا اور دوسری طرف گر پڑا۔ اس کا ہاتھ زمین پر لگا اور اسی لمحے کسی دوسری خوف ناک چیز نے اس کا ہاتھ اپنے آہنی جبروں میں پکڑ لیا۔ عبدال کی چپٹیں ٹھٹھکی گئیں۔ ٹھٹھکے کے درمیان لمبی شیخ اس کی ہڈی کے آ پار ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا۔ گھبراؤ نہیں!

نے زینو کی طرف دیکھا۔ ”میں نے ایک الگ گھر بنالیا ہے۔“

”کہاں؟“

”جنگل میں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔ وہاں ہم دونوں اپنے دوستوں کے ساتھ رہیں گے۔“

عبدل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ زینو سمیٹے خیر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ عبدل نے پوچھا۔ ”چلو گی؟“

”ہاں۔“ زینو نے شرمکے گردن چھائی۔

عبدل نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنے کانوں پر نرم و گرم رخساروں کا لمس محسوس کیا۔ اسے زندگی میں پہلی بار ایسا معلوم ہوا کہ تنہائی کا جو احساس ساری عمر اس کے ساتھ چٹا رہا تھا وہ اچانک غائب ہو گیا ہے۔ پھر اس نے نرم رخساروں کے بجائے کھردرے بالوں والے رخساروں کا لمس محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں فوراً بند کر کے گاؤں کے ساتھ اپنے رخسار لگائے ہوئے تھے۔ بندر کی آنکھیں بند تھیں زینو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ عبدل بھی مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کا وقت تھا۔ بسوں کے اڈے سے ملحق باغ میں چنار کے ایک عمر رسیدہ درخت کے نیچے بیٹھ لگا ہوا تھا کچھ نوجوان اور کچھ بچے آگے سبز گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی لوگ دائرے میں ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ ڈگڈگی کی آواز آرہی تھی۔ ایک بندر کوٹ چٹون پہنے ہوئے میدان میں ٹھک ٹھک کے چل رہا تھا۔ اس کے گلے میں مٹی لک رہی تھی۔ بیرونی میں ریڑ کے جوتے تھے اور ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ وہ ایک خاص انداز سے چھڑی گھمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پوری طرح گھما نہیں سکتا تھا۔ اس کا انگوٹھا چونک مرنے لگا ہوا تھا اس لیے چھڑی پر اس کی گرفت مضبوط نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چھڑی گھمانے کی کوشش کرتا تو چھڑی بار بار اس کے

ہاتھ سے گر جاتی۔ لوگ ہنسنے لگتے۔ بندر خشم ناک نظروں سے انہیں گھورتا اور جھک کر چھڑی اٹھا لیتا اور ڈگڈگی کی کھسک کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتا۔

”بندر جتن لاہور سے آیا۔ اپنے سرسار جا رہا ہے۔ کیا بتوالی چال ہے؟ کیا ٹاٹ ہے۔“

”واہ واہ۔“ ڈگڈگی زور سے بولی۔ بندر اچھلتا ہوا مدار کی پیچھے چلا گیا۔ وہاں ایک بندر یا بیٹی ہوئی بیٹنگ کھا رہی تھی۔

دوسرے مدار یوں کے برعکس عبدل نے بندر اور بندر یا کوڑی سے نہیں باندھا تھا۔ پھر بھی بندر اور بندر یا خوشی خوشی تماشا دکھا رہے تھے۔ عبدل کے بائیں ہاتھ میں ڈگڈگی تھی وہ ایک ہم آہنگی اور خوش دل کے ساتھ اسے بجا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تماشا نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ سب کچھ اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس کا دایاں بازو نہیں تھا۔ خالی آستین لک رہی تھی لیکن اسے اپنا بازو ضائع ہونے کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اس کا بایاں بازو دوسرے کام انجام دینے لگا تھا۔ اس کے چپے پر اطمینان کی کیفیت تھی۔ زینو سفید چادر میں لپٹی ہوئی اس کی کمر سے مٹی پھینکی تھی۔ عبدل اس کی طرف پلٹ کر دیکھتا تو وہ مسکرا دیتی۔ ”بندر میں اپنی صاحب کو لے کر ٹھنڈی سڑک پر چلا۔“ عبدل نے ڈگڈگی بھائی۔

بندر بندر یا کا دایاں ہاتھ اپنے بالوں میں دبائے ڈگڈگی کی آواز کے ساتھ قدم ملا کے چلے لگا۔ بندر یا سرخ کھڑا اور سرخ چوٹی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے گلے میں چاندی کے ہار لٹک رہے تھے۔ وہ بھی گردن اٹھائے نگاہ بلند کیے۔ سینہ تانے ڈگڈگی کی آواز کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میدان کا چکر پورا کرنے کے بعد دونوں نے ہاتھ پکڑ کے ایک ساتھ قلا بازی کھائی۔ بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مجمع بہت محفوظ ہوا۔

”بندر میں اور میں صاحب کی کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ ہم روکھ کر اپنے نیچے چلی گئی ہے۔ بندر میں اسے منانے جاتا۔“

بندر یا مدار کی پیچھے چھپ گئی۔ بندر آہستہ سے اس کے پاس آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ مدار کی اور پیچھے ہٹ گئی۔ بندر نے غصے سے اس کی دم پکڑ لی اور اسے کھینچا ہوا میدان میں لے آیا۔ لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

”اوئے بندے دا پتر بن۔ میں مرجائے گی۔“

چھوڑ دے اسے۔“ عبدل نے بندر کو ڈانٹا۔ بندر نے مٹی میں سر بلایا۔ عبدل نے بیچ سے کہا۔ ”کہتا ہے نہیں چھوڑوں گا۔“ اس نے ڈگڈگی بھائی۔

”بندر تک راضی نہ ہو جائے۔ اوئے! وہ بندر ہے بولا۔“

”بندر والی کے ساتھ نہیں جاتی تھی۔“

بندر نے مٹی میں سر بلایا اور بندر یا کو مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ ”کہتا ہے نہیں چھوڑوں گا۔“

بندر یا سیدھی نہ ہو جائے۔ ضدی عورتیں پانی کے بغیر سیدھی نہیں ہوتیں۔“ عبدل نے زینو کی طرف دیکھا۔ وہ شرمکے مسکرا دی۔

عبدل نے بندر یا سے کہا۔ ”چل میں کی بچی! اپنے جٹر میں سے معافی مانگ۔“

اس نے چھڑی سے بندر یا کو چکارا۔ بندر یا نے لپک کر بندر کے پاؤں پکڑ لیے۔ بندر نے پیار سے اس دیکھا پھر سینے سے لگا لیا۔ ایک شور اٹھا۔ لوگ تھمتھے لگا رہے تھے۔ عبدل نے ہنسنے ہوئے زینو کی طرف دیکھا۔ زینو نے حیا سے اپنا سر سرخ سرخ چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

عبدل نے تیلی سے سفید چادر نکالی۔ ایک کونا بندر نے پکڑا اور دوسرا عبدل نے پکڑا اور کونے زینو نے پکڑے اور گھاس پر چادر بچھا دی۔ دیکھتے دیکھتے پانچ دس بچیں بچاس بچیوں کے سیکے برستے لگے پھر مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا۔ صرف چند بچے رہ گئے تھے۔ وہ

چمکی

ایک ملکیت نے دور سے ایک کار آتی دیکھی جو ہر چند فٹ پر اچھلتی تھی۔ اس نے سوچا کہ نزدیک ترین سروس اسٹیشن بھی یہاں سے ایک میل دور ہے اسے کار والے پر رحم آگیا اور اس نے کار والے کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اس نے اشارے سے کار کو روکا اور ہمدردی کے لہجے میں بولا۔ ”اس قدر بگڑی ہوئی گاڑی لے کر نکلتا نہیں چاہیے۔ ملکیت گھر بلالو ایسا بچہ یا بچہ کر کے لے جائیں۔“

کار کے ڈرائیور نے ملکیت کو گھورا پھر بولا۔ ”کار میں... ج... کوئی خرابی نہیں... ج... دراصل... ج... مجھے بھیاں آ... ج... رہی ہیں!“

نہایت اشتیاق سے بندر اور بندر یا کو دیکھ رہے تھے۔ عبدل نے سامان سمیٹا۔ زینو نے تھیلے کا منہ کھولا۔ عبدل سامان تھیلے میں ڈالنے لگا پھر اس نے چادر اٹھائی کر کے کتے پکڑے کی ایک کھلی میں ڈالے اور تھیلی زینو کو تھما دی۔ زینو نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں تھیلی کا وزن کیا اور پھر سے پہلے عبدل کو پھر بندر اور بندر یا کو دیکھنے لگی۔ عبدل نے سامان کا تھیلیاں کتے کے ساتھ لٹکایا۔ چھڑی ہاتھ میں لی پھر بندر اور بندر یا کو اشارہ کیا۔ وہ چاروں باغ سے نکل کے بڑی سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ بچوں نے تھوڑی دوران کا تعاقب کیا لیکن جلد واپس چلے گئے۔ عبدل اپنے خاندان کے ساتھ بسوں کے اڈے پہنچا۔ تھیلیاں جانے والی بس تیار تھی۔ عبدل اور زینو بندر اور بندر یا سمیت بس میں چڑھ گئے۔ بس روانہ ہو گئی۔

کوہ گران

سیدہ عطیہ زاہرہ

اس نے اپنا بچپن کھلونوں کی خاطر تڑپتے
سسکتے گزارا تھا۔ اُسے غربت سے نفرت
تھی۔۔۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی اولاد
بھی اسی کی طرح کھلونوں کے لیے
ترسے۔۔۔ اور جب اُسے موقع ملا امیر ہونے
کا تو اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔۔۔

دولت کی ہوس میں اندھی ہونے والی ایک بھٹکی ہوئی لڑکی کی کہانی

وہ نہایت خوب صورت بھی، لیکن ایک کچے
سے گھر کی زمین اگی تھی۔ حسین آنکھیں، بے حد
سفید رنگ، اخروٹ کی رنگت کے لیے لمبے بال! یقین
پارہ ایک ایسے گھر میں تھا۔ جس کے مکانوں کے
دروازے ٹاٹ کے پردوں کے تھے۔ وہ تین بیٹیں
تھیں، لیکن یہ سن صرف اسی کے لیے تھا۔
اسے عمران سے محبت تھی، لیکن جب فیصلہ کا وقت آیا
تو اس نے چوہدری رمضان کی رفاقت قبول کر لی،
کیوں کہ وہ بہت دولت مند تھا اور اس کے سن پر
راغب ہو گیا تھا۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ چوہدری
رمضان ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور وہ بھیلہ کے حسن کا
شیدائی نہیں بلکہ اس کے حسن سے فائدہ اٹھانے کا
خواہش مند تھا۔ پھر بھیلہ ان راہوں پر چل پڑی۔
اس نے چوہدری رمضان کو مایوس نہیں کیا تھا۔ بچپن کا
دوست عمران، جس کے ساتھ اس نے زیادتی کی تھی
جسے اس نے دولت کی صلیب پر مصلوب کر دیا تھا۔
اس کے سینے میں کسک بن کر زندہ تھا۔ اس کی یادیں
اسے ہر وقت کھیرے رکھتی تھیں۔ اسی طرح پورے
چھ سال گزر گئے۔ وہ جرم کی راہ پر چلتی رہی، لیکن
عمران اس کے سینے میں موجود تھا۔
”کاش تم دیکھ سکتے عمران! کہ تم سے بے وفائی

دولت

بلائی

”جہیں، میرا عمران ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت
اچھا ہے۔ وہ یقیناً مجھے معاف کر دے گا۔“ بھیلہ یہ
بات نہیں بھول سکتی تھی کہ اسے ہمیشہ سے عمران پر بڑا
ناز تھا اور عمران نے بھی اس کا مان بھی نہیں توڑا تھا۔
وہ دونوں بچپن سے ہی ایک ان جانے رشتے میں
بندھے چلے آ رہے تھے۔ یہ تو وہ خودی جس نے اپنی
خواہشات کا غلام بن کر ہر رشتہ، ہر ناتا توڑا وہ راستہ
اختیار کر لیا تھا جس پر چلتے چلتے وہ بندگی کے اس مقام
تک آ گئی تھی جس سے آگے کوئی راستہ بھائی نہیں
دے سکتا تھا۔ عمران کا کھر بھی بستی کے دیگر گھروں
سے کچھ اچھا نہیں تھا بلکہ اکثر گھروں سے زیادہ ہی



خواب تھا۔ جیلہ کے ابا جزل اسٹور میں ملازم تھے جہاں سے بس اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ پانچ افراد پر مشتمل گھر کی دال روٹی چکی رہے، لیکن ان کے اپنی مٹیوں کو پڑھانے کے شوق میں پورے گھر کو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ خود تو صرف نام لکھنے اور اخبار پڑھنے کی حد تک علم یافتہ تھے، لیکن اپنی مٹیوں کے لیے انہوں نے بڑے اونچے اونچے خواب دیکھ کر بکھے تھے۔ بھی کہتے، اپنی مٹیوں کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ جسکی وہ انہیں وکیل اور بیرسٹر بنانے کی بات کرنے لگتے اور بھی ان تینوں کے لیے الگ الگ شعبہ منتخب کر لیتے۔ ابا کی باتیں جیلہ کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور نیلہ اور شریا تو اس سے بھی چھوٹی تھیں، ان کی سمجھ میں کہاں آسکتی تھیں! بڑی ہونے کے ناتے ابا کی امیدوں کا مرکز جیلہ کی ذات ہی تھی۔ وہ اس کے ذریعے اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتے تھے، لیکن جیلہ کو یہ سب باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر بننے کے بجائے گڑیوں کی شادی کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ گڑیوں کی شادی رچا سکے اور مٹیوں سے اس کی غربت سے اور اس کی پیدا کردہ مجبوریوں سے نفرت کا آغاز ہوا۔ یہ نفرت اس وقت شروع ہوئی تھی جب وہ چاہت اور نفرت کے لفظی مفہوم سے بھی ناواقف تھی، لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی جو خواہش اس کے ذہن میں ابھری تھی، وہ امیر بننے کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے پاس اتنے پیسے ہوں کہ وہ ایک ایک کر کے سینے میں چھتی ہوئی ہر خواہش کو پورا کر سکے، لیکن ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا یہ کسی مٹین سے گزر کر کچھ بننے کا عمل تو نہیں تھا، ورنہ وہ مٹین بننے سے بھی نہیں چوکتی۔

زوج عمران اور اس کے بابا کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے اور وہاں سے واپسی پر وہ ان ہی خیالوں میں کھوئی رہتی، کیوں کہ گھر پر تو اسے کیسوی سے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ گاڑی میں تو نیلہ

اور شریا بھی خاموش رہتی تھیں، لیکن گھر پر ان کا شور پورے گھر کو سر پر اٹھائے رکھتا تھا۔ عمران کے بابا کی سیٹھ کے ہاں ڈرائیور تھے اور نیٹم صاحبہ بہت رحم دل خاتون تھیں، جب ہی تو انہوں نے ڈرائیور کو نہ صرف رات کو گاڑی لے جانے کی اجازت دے رکھی تھی بلکہ عمران کو اسکول سے گھر پہنچانے کی چھٹی بھی دے رکھی تھی۔ نیٹم صاحبہ نے تو عمران کے بابا کو کوٹھی کے سروٹ کو اسٹریٹ میں شفٹ ہونے کے لیے بھی کہا تھا مگر وہ اس لیے نہیں گئے کہ کوٹھی میں عمران اکیلا ہو جاتا۔ یہاں تو شروع سے اس کے بابا سے کھانا کھلا کر جیلہ کی امی کے پاس چھوڑ جاتے تھے۔ پھر جب وہ کچھ بڑا ہو گیا تو اپنے گھر میں اگلا رہنے لگا۔ جہاں وہ ہوتا اور اس کی کتابیں۔ اسے کتابیں پڑھنے کا ویسا ہی شوق تھا جیسا جیلہ کو گڑیوں کی شادیاں رچانے کا تھا۔ جیلہ کو عمران شروع سے ہی پسند تھا۔ وہ خود جن چیزوں سے محروم تھی، عمران کو وہ محسوس نہیں۔ وہ بڑے شوق سے جیلہ کو کوٹھی ان میں شریک کر لیا کرتا تھا۔ پھر چون جوں وقت گزرتا گیا وہ عمران کے ساتھ ہوتی چلی گئی۔ اسے عمران کی صورت میں اپنے اس نجات دہندہ کی شکل نظر آتی تھی جو اسے غربت اور محرومیوں کی دلدل سے نکال لے جائے گا۔ وہ ہر صورت میں اپنے جسم سے اس کچھ کچھ جدا کرنا چاہتی تھی جو جسم کے ساتھ ہی اس کے جسم سے چسپی ہوئی تھی۔ اس کچھ کی بدبو سے اس کا دم کھٹکتا تھا، لیکن وہ اس کے ساتھ ہی زندہ رہنے پر مجبور تھی۔

عمران کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب وہ صرف تین سال کا تھا۔ اس کے بابا نے دوسری شادی سے صرف اس لیے گر بڑیا تھا کہ نہیں تھا عمران کو بیلوں ماں کے ظلم کا نشانہ بن جانے۔ جیلہ کی والدہ نے اپنی بساط سے بڑھ کر عمران کے بابا کی پریشانی میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہ خود تو کسی بیٹے کو جنم نہیں دے سکی تھیں لیکن عمران کو انہوں نے ایک ماں سے بڑھ کر پیار دیا تھا۔ عمران سے ان کے اس التفات کی وجہ سے ان کی اپنی مٹیوں کو بھی ان سے

فکارت ہو جاتی تھی، لیکن انہوں نے کبھی بھی بن ماں کے بیٹے کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دی۔ ایک تو عمران بہت سمجھ دار اور سعادت مند بچہ تھا اور دوسرے تمام گھروں کی بستیوں کی طرح اس بستی کے بھی سکھ دکھ مشترک تھے۔ اس لیے بغیر کوئی مسئلہ وقت گزرتا رہا اور تمام بیٹے عمر کے اس دور میں پہنچ گئے۔ جہاں زندگی کی طویل شاہراہ ان کا پہلا قدم رکھنے کی منتظر تھی۔ جیلہ اس وقت آٹھویں کلاس میں تھی، جب عمران کو اس کے بابا نے تعلیم کے لیے کراچی روانہ کیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح سے عمران کے بابا پر نیٹم صاحبہ کی مہربانی تھی۔ عمران کی انٹرمیڈیٹ پڑھنا آئی تو نیٹم صاحبہ نے اسے بطور خاص کوٹھی بلایا۔ اور پھر وہیں عمران کی مزید تعلیم کے سلسلے میں یہ فیصلہ کیا گیا اور اسے کراچی روانہ کر دیا گیا۔ نہ جانے بڑوں کے اس فیصلے میں کبھی صحت تھی لیکن جیلہ کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ عمران کی وفات سے اسے صرف ڈھارس ہی نہیں رہتی تھی بلکہ اس کی وہ مدد بھی کرتا تھا۔ اسکول کا کام کرنے میں ٹیبل بہنوں کی مدد کرتا تھا۔ جیلہ کو تو وہ اپنی جیب خرچ میں سے پیسے بھی دے دیا کرتا تھا۔ جسے وہ اپنی سہیلیوں میں بڑی فراخ دلی سے خرچ کر کے ان پر اپنا رعب بٹایا کرتی تھی۔ عمران کے اتنا دور جانے کا اسے ہی سب سے برا نقصان نظر آیا تھا، لیکن وہ کچھ نہ کہتی تھی۔ عمران کے پچھڑنے کا سب کو ہی افسوس تھا، لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر جیلہ کی امی پر ہوا تھا۔ اپنا بابا کے لیے تو وہ سب کچھ ہی تھا جس روز عمران کو کراچی چھوڑا تھا۔ اس سے ایک روز قبل اس نے جیلہ کو تین ہزار روپے دیے۔ چلی بار اتنی بڑی رقم جیلہ کے ہاتھ میں آئی تو وہ ذاتی رقم کی خوشی کے ساتھ ساتھ بولکھائی گئی۔

”عمران میں اتنے سارے مٹیوں کا کیا کردار مگی؟“

”کھ لو کسی ناکسی کام آئی جا نہیں گے۔ اب میں تو یہاں ہوں گا نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو کس سے مانگوں۔“ عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

خود اس کا اہنا دل بھی پیسے واپس کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ امیر بننے کی برائی خواہش عود کر آئی تھی۔ اتنے ڈھیر سارے روپوں کا تو اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جو اچانک چھپڑ بھڑ کر اسے مل گئے تھے۔ اسے تو بھی بابا نے عیدی بھی ایک سو سے زیادہ نادیاں دی اور وہ بھی صرف مٹی کی عید پر دیتے تھے۔ بڑی عید پر تو اسے بھی گول کر جاتے تھے۔ البتہ عمران کے بابا دونوں عیدوں پر تینوں بہنوں کو دو دو سو روپے عیدی دیتے تھے۔

”لیکن عمران تمہارے پاس اتنے سارے روپے کہاں سے آئے۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمران کے پاس اچانک اتنی رقم کہاں سے آئی ہوگی کہ وہ اس میں سے تین ہزار روپے اسے دے رہا تھا۔

”بابا نے مجھے کراچی کے لیے تھے ہزار روپے دیے تھے، ان ہی میں سے میں نے تمہیں دے دیے۔“ عمران نے ایسے کہا۔ جیسے کوئی بات ناہو۔

جیلہ اس بات سے تو واقف تھی کہ عمران کا گھر نیٹم صاحبہ کی مہربانی سے کتنی کا سب سے امیر گھر ہے، لیکن بابا کے پاس اتنی رقم ہوگی کہ وہ چھ ہزار روپے اپنے بیٹے کو خرچ کرنے کے لیے دے دیں گے۔ اس کا تو اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے عمران کی قسمت پر رشک ہونے لگا۔ جس کا باپ اتنا امیر ہے کہ اپنے بیٹے کو خرچ کرنے کے لیے چھ ہزار دیتا ہے۔ اس نے سوچا کتنا اچھا ہوتا کہ میں بابا کی بیٹی ہوئی اور عمران اماں کا بیٹا ہوتا۔ اس طرح اماں کی بیٹی کی حسرت بھی پوری ہو جاتی اور میں بھی اپنی خواہشوں کو دل میں دباؤں رہے۔

عمران کے کراچی چلے جانے کے بعد زندگی کے تمام معمولات اسی طرح ہونے کے باوجود جیلہ کو پہلی بار شدت سے کسی چیز کے کھو جانے کا احساس ہونے لگا۔ اگرچہ اب وہ صبح اسکول جاتے ہوئے گاڑی کی انگلی سیٹ پر بابا کے ساتھ بیٹھنے لگی تھی، لیکن یہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ عمران کے ناہونے کی

وجہ سے بابا رات کو لٹ گھر آنے لگے۔ وگرنہ جب تک عمران کراچی نہیں گیا تھا۔ بابا سر شام ہی کھر واپس آ جاتے تھے۔ عمران کی دوری کے مشترکہ دکھ نے جیلہ کو بابا کے اور قریب کر دیا تھا بابا کو عمران کی باتیں کرتے رہنا اچھا لگتا تھا اور جیلہ کو اس کے متعلق سننے رہنا! دونوں کی ایک مشترکہ دلچسپی عمران کے خطوط بھی تھے۔ عمران کے ہر خط میں اس کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔

پہلی بار جب عمران چینیوں پر گھر آیا تو جیلہ کو ایسے محسوس ہوا کہ اس کا کھویا ہوا خزانہ واپس مل گیا ہو۔ اس وقت تک جیلہ نویں جماعت میں آچکی تھی۔ اس کا ذہن اب تک اپنی معصوم انیسیت کو زبان دینے یا سمجھنے سے قاصر تھا، لیکن عمران اس ایک سال میں گھر سے دور رہ کر نہ صرف بہت خود اعتماد ہو گیا تھا بلکہ کسی حد تک بے باک بھی ہو گیا تھا، اتنا کہ اس نے پہلی بار جیلہ سے سوال کیا۔ ”بڑا آدمی کیسے بنتا ہے؟“ جس کا جواب جیلہ کو کبھی طرح معلوم تھا۔ ”جو بچہ چمکتا کرتا ہے وہ بڑا آدمی بنتا ہے۔“ جیلہ نے وہی کئی سنائی بات دوہرا دی، لیکن عمران نے یہ سن کر ایک اور بہت مشکل سوال کر دیا۔

”اور میں بڑا آدمی کیوں بننا چاہتا ہوں؟“ عمران کے سوال کا جیلہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے تو یہ بات معلوم ہی نہیں تھی کہ لوگ بڑے آدمی کیوں بنتے ہیں۔ نہ اس نے بھی کسی سے پوچھا تھا۔ ابا کی گفتگو کا اختتام ہمیشہ ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر پر ہوتا تھا۔ اس کے بعد کے مرحلوں سے وہ ناواقف تھی، اس لیے خاموشی سے عمران کا چہرہ دیکھتی رہتی۔ عمران اسے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔ ”میں بڑا آدمی بن کر بہت سے پیسے کمانا چاہتا ہوں، اتنے زیادہ کہ میں اور تم آرام سے زندگی بسر کر سکیں اور ہمارے بچوں کو ان روپیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے جن سے ہم گزر رہے ہیں۔“

جیلہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے ہونٹوں کی طرح عمران کو دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”ہمارے بچے۔۔۔؟“
”ہاں ہمارے بچے۔“ عمران نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جیسے ہی میں کسی قابل ہو جاؤں گا تمہیں بیاہ کر اپنے گھر لے آؤں گا۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خارا تھا۔

اس روز سے پہلے جیلہ نے زندگی کے اس موڑ کے بارے میں بھی سوچا بھی نہیں تھا۔ عمران کی زبان سے یہ الفاظ سننے تو اسے یاد آیا کہ وہ ایک لڑکی ہے جس کی قسمت میں پرانے گھر کو آباد کرنا بھی لکھا ہوتا ہے۔ عمران کے سامنے سے تو وہ شرما کر بھاگ آئی لیکن وہ رات بھر اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا رہا۔ ”ایک بات آج رات لو جیلہ کہ صرف اور صرف تم ہی میری دہن بنو گی۔“

عمران کی زبان سے نکلے ہوئے چند جملوں نے ہی اس کی دنیا بدل دی تھی، لیکن اب ان خوابوں میں ایک اور ہی رنگ آ گیا تھا۔ پہلے جس بڑے مکان میں وہ اکیلی رہتی تھی اب اس میں عمران کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ پہلے جو گاڑی وہ خود چلائی کرتی اب وہ عمران چلائے لگا تھا اور وہ عمران کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھنے لگی تھی۔ اسی طرح خوابوں کے جس پلک پر وہ پہلے تنہا سوئی تھی۔ اب عمران بھی اس کا شریک ہو گیا تھا۔ عمران کی وجہ سے جیلہ کو اپنے خوابوں کے پورا ہونے کا یقین زیادہ ہو گیا تھا۔ اب تو اسے عمران کی جدائی بھی نہیں ملتی تھی، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ عمران اس سے دور رہ کر اسی کے خوابوں کو حقیقت کی تاروں سے بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

گزرتے ہوئے دن ہفتوں اور مہینوں اور سال میں ہوتے گئے۔ جیلہ کے میٹرک کے امتحان کے بعد اس کی باقاعدہ تعلیمی عمران کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ اسی روز ان دونوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے بڑوں نے یہ رشتہ دو سال پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔

شادی کے لیے عمران کے ایم اے کے بعد نوکری کر لینے کی شرط مقرر کی گئی تھی۔ جس طرح یہ دن

گزر گئے ہیں اسی طرح یہ دو سال گزر جائیں گے، جیلہ نے سوچا تھا۔

وہ اپنے خوابوں کے سفر کی پہلی میٹری کامیابی سے طے کر گئے پر بہت خوش تھی۔ اگلے دو سال بھی ایک جھینٹے گزر گئے۔ کراچی میں ہنگاموں کے سبب عمران کے امتحان لیت ہو گئے۔ اس دوران جیلہ انٹر کے امتحان سے فارغ ہو کر نائینگ اور شارٹ پنڈ سکھ رہی تھی۔ وہ تو شاید اس نائینگ اور شارٹ پنڈ کورس میں داخلہ بھی نہ لیں، لیکن ماریہ نے اتنی خدشی کردہ انکار نہ کر سکی۔ ماریہ اور اس کی دوستی کالج میں ہوئی تھی اور پھر وہ اتنی گہری ہوئی کہ ماریہ سے چھٹی کے روز کی دوری بھی اسے ٹھنکنے لگی۔ ان کی دوستی ایک طرح سے استاد اور شاگرد کی رفاقت تھی۔ ماریہ کئی معاملوں میں اس کی استاد بنی۔ اس نے جیلہ کو نسخ کیا تھا کہ کالج میں کسی کو نہ بتائے کہ وہ کہاں رہتی ہے یا اس کے والد کیا کام کرتے ہیں۔

”جیلہ! یہ دنیا بھر کے کسی بھی فرد کو اس کی ذاتی خوبیوں سے نہیں دیکھ سکتے، سوئل اسٹیشن سے ناپتے ہیں۔ اگر تم نے انہیں بتا دیا کہ تمہارے ابا ایک دکان پر کام کرتے ہیں اور تم اس دکان میں رہتی ہو تو یہ انہیں ایسی نظروں سے دیکھیں گے کہ تم خود احساس کمتری کی شکار ہوونی چلی جاؤ گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان کی طرح تم بھی اپنے چہرے پر جھوٹ کا خوشنما نقاب لگا لو۔ یہ سب تمہاری عزت کرنے لگیں گے۔“ ماریہ نے اسے سمجھاتے ہوئے طویل تقریر کر ڈالی تھی۔

جیلہ میں اس سچ کو سمجھ لینے کے باوجود اتنی ہمت نہیں تھی کہ دھڑلے سے جھوٹ بول سکی، لیکن ماریہ نے اسے اس مرحلے پر سنبھال لیا۔ وہ اس کی طرف سے اتنی صفائی سے جھوٹ بولی کہ جیلہ خود بھی حیران رہ جاتی۔ کالج میں اتنی فرصت کے بھی کہ وہ سچ اور جھوٹ کی تحقیق کرتا اس لیے سب ہی نے ماریہ کے اس بیان کردہ اس جھوٹ پر یقین کر لیا کہ جیلہ کے والد بہت بڑے بزنس مین ہیں جو اپنے کاروبار

کے سلسلے میں زیادہ تر کراچی یا بیرون ملک رہتے ہیں۔ ماریہ کی بیان کردہ سچائی کا سب سے بڑا ثبوت تو وہ گاڑی بھی جو جیلہ کو کچھ روز کراچی بھی اور دوپہر کو لینے آتی تھی۔

اس جھوٹ کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ لڑکیاں جیلہ کی عزت کرنے لگیں، لیکن جیلہ چونکہ خود اس جھوٹ کے کھل جانے سے خوف زدہ تھی، اس لیے اس کی کسی اور لڑکی سے دوستی نہیں ہو سکی۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کے بھرم کا بھانڈا بچ چورا ہے نہ پھوٹ جائے۔ اس لیے اس نے اسے گرد ایک حصار بنالیا تھا جس میں ماریہ کے علاوہ کسی لڑکی کا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ کالج میں ”معزور لڑکی“ کے نام سے مشہور ہوتی چلی گئی۔ اس کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن پیٹھ پیچھے لڑکیاں مختلف باتیں کرتی رہتی تھیں۔

”اپنے باپ کی دولت پر اترا بی۔“، ”بھئی کوئی تبصرہ کرنی اور دوسری لڑکی بول پڑی۔“، ”کیوں، قدرت نے ذرا شغل اچھی دے دی ہے اس لیے اتنا گھمنڈ نہ کرتی ہے۔“

جیلہ تک تمام تبصرے پہنچ جاتے تھے، لیکن وہ خاموش رہتی۔ اس کے اندر کا خوف اسے بات بڑھانے سے باز رکھتا تھا۔ پھر اس طرح کے تبصروں سے اس کی انگوٹھی تسکین ملتی تھی۔ اسکول کی حد تک اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے، لیکن کالج میں قدم رکھنے کے بعد یہ احساس شدید تر ہوتا گیا اور اس میں زیادہ ہاتھ ماریہ کا تھا جو ہر وقت اسے احساس دلاتی رہتی تھی کہ وہ کالج ہی کی نہیں، شہر کی حسین ترین لڑکی ہے۔ کبھی وہ اس کی سبزا آنکھوں کی تعریف کرنے لگتی تو کبھی اس کے خوب صورت چہرے اور لمبے لمبے بالوں کی۔ ایک قہر تو تقریباً دو روز ہی پہنچتی تھی ”جیلہ! تم کچھ بھی پکھن لو، تم پر خوب جتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ جیسی سے جیسی پڑا پھن لیں مگر ضائع ہی جاتا ہے۔“

گہری سانسوں کی رنگت اور معمولی سے نقوش و نگار

والی ماریہ باتیں اتنی دلچسپ کرتی تھی کہ لوگ اس کے دیوانے ہو جاتے تھے۔ اس کی بیٹیوں بڑی ہمیشہ مختلف کپڑیوں میں جاب کرتی تھیں شاید اسی لیے ان کے گھر آنے پر تھی تہذیب کی خاصی گہری چھاپ تھی۔ بڑی بہنوں کی طرح ماریہ بھی مردوں سے آزادی سے لٹی تھی۔ لڑکوں سے دوستی کرنے اور ان کے ساتھ گھومنے کی بات جیلہ اور ماریہ کے درمیان وجہ تنازع بن جاتی تھی، لیکن پھر دونوں نے ہی اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر لیتی تھیں۔ نہ ماریہ اس کے حق میں دلائل دیتی اور نہ ہی جیلہ اس کی مخالفت میں بات کرتی۔ بس دونوں اپنے اپنے نقطہ نظر پر خاموشی اختیار کر گئی تھیں۔ ماریہ کے گھر کا محل بھی ایسا ہی تھا کہ اس پر کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ وہ تو اپنے دوست لڑکوں کو اپنی بہنوں اور والدہ سے بھی ملوا دیتی تھی۔ اس کے گھر پر بھی مردوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ جیلہ کے نزدیک یہ بری بات تھی، لیکن ماریہ اسے اپنی سوسائٹی کے آداب گردانتی تھی اور اس کی بات کسی حد تک سمجھتی تھی۔

ان میں بیٹن بیٹن وہی لڑکیاں تھیں جو چند دن پہلے تک جیلہ کو اپنے گھر لے جانے کے لیے بے چین تھیں۔

ماریہ تو شروع سے ہی ایئر کے بعد اپنی بڑی بہنوں کی طرح جاب کرنا چاہتی تھی، لیکن اب اس کی موت نے جیلہ کو بھی اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب اتنے اچانک چلے گئے تھے کہ ان کے دن ہونے کے باوجود گھر میں کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان سے بچھڑ گئے ہیں۔ پورے گھر میں کانٹے والے وہ واحد فرد تھے۔ ان کی کمائی کتنی ہی قلیل تھی، لیکن گھر کی گاڑی منجھنے والے واحد شخص تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد سب سے بڑی پریشانی بنی تھی کہ اب گھر کا چولہا کیسے جلے گا۔ اماں سدا کی پیار تھیں۔ نبیلہ اور شریا دونوں ابھی اسکول میں تھیں۔ لے دے کر بس ایک جیلہ ہی کی ذات اسکی تھی جو کچھ کمانے کے لائق تھی۔ یہی سوچ کہ جب اس نے اماں سے اپنی نوکری کا ذکر کیا تو انہوں نے پہلے اسے عمران کے بابا سے اجازت لینے کو کہہ دیا۔ کہا۔ جب سے اس کی بگلی ہوئی تھی، اماں نے اپنا طریقہ کار یہ ہی بنالیا تھا کہ ہر بات کے لیے اسے بابا کے پاس بھیج دیتی تھیں۔ اماں کی نیم رضا مندی کے ساتھ جب وہ بابا کے پاس پہنچی تو توقع کے برعکس انہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

”دیکھو بیٹی، اول تو ہمارے لڑخانان میں بھی کسی لڑکی نے نوکری نہیں کی اور دوسری بات یہ ہے میرے تمہارے خاندان کے کئی رشتے ہیں۔ بابا نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے والد صرف میرے بڑی ہی نہیں دوست بھی تھے، اور تمہاری والدہ نے مجھ پر اتنا احسان کیا تھا کہ عمران کی والدہ کی وفات کے بعد مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ پھر ایک رشتہ تمہارا ہے۔ اب اتنے مضبوط بندھنوں کے بعد یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تمہارے والد کا کفن بھی میلانہ ہوا ہو اور میں تمہیں نوکری پر لگا دوں۔“ بابا کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”لیکن بابا میرے نوکری کرنے میں حرج کیا ہے۔“ جیلہ حیران تھی کہ اس کی ہر بات ماننے والے بابا اس کی یہ بات کیوں نہیں مان رہے ہیں۔ جب کہ اس سے پہلے تو وہ بہت سی باتیں بن کہے ہی پوری کر دیا کرتے تھے۔ خصوصاً عمران سے منگنی کے بعد تو وہ اس پر بہت ہی مہربان ہو گئے تھے۔

”حرج ہے نہ بیٹا! اب یہ تو کہہ رہا ہوں۔“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی بابا! جیلہ نے بات کا انداز بدلتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“

”ایک طرف آپ مجھے بیٹا بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف اعتماد بھی نہیں کرتے!“ جیلہ نے اپنی بات مکمل کی تو بابا سوچ میں پڑ گئے۔

”تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں تم پر اعتماد کرتا۔“ انہوں نے تمیز لہجے میں کہا۔

”آپ مجھ کو دے نے بابا! اور کس میں اتنی ہمت ہے کہ مجھ سے ایسی بات کہہ سکے۔“ جیلہ اپنا وہ ہی انداز اپناتے ہوئے تھی۔ نوکری کرنے کا مجھے بھی شوق نہیں ہے بابا! لیکن مجبوری اسی کو کہتے ہیں۔ شاید قدرت بھی اسی کو کہتے ہیں تب ہی تو آپ نے مجھے شارٹ ہینڈ اور ٹائیک سکینے کی اجازت دے دی تھی ورنہ اگر ماریہ مجھے مجبور نہ کرتی اور آپ اجازت نہ دیتے تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔“ جیلہ کی بات سے بابا کی سوچ گہری ہوئی۔ ”ایک بات اور ہے بابا! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں۔“ لہجہ نرم دیکھ کر جیلہ نے ایک بھر پور چوٹ لگانے کا ارادہ کیا۔

بابا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن ان کی آنکھوں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ ناراض نہیں ہوں گے۔

”نبیلہ اور شریا ابھی چھوٹی ہیں۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ نہیں سمجھ سکتیں، میں اور آپ زمانے کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔ جس کے منہ میں جو آئے گا۔ وہ بکواس کرے گا۔ اگر ان کے کانوں تک کوئی ایسی ویسی بات پہنچی تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائیں گی

اور بابا میں یہ نہیں چاہتی۔“ اس کی بات سے بابا کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ علم بہت دور تک دیکھنے کا علم بھی دیتا ہے۔ انہیں خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ان کی ہونے والی بہو میں زمانے سے لڑنے کی قوت موجود ہے۔

”اور تم یہ نوکری کب تک کرو گی۔“ وہ کسی حد تک جان گئے تھے، لیکن یہ آخری سوال شاید انہوں نے اپنے بیٹے کے مفاد کو مد نظر رکھ کر کیا تھا۔

”جب تک عمران تعلیم مکمل کر کے کوئی نوکری تلاش نہیں کر لیتے۔“ جیلہ نے جھکی جھکی نظروں سے جواب دیا۔

گویا اسے عمران کی مدد لینے سے انکار نہیں ہے۔ بابا نے سوچا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ اس طرح عمران کا اس خاندان سے دو ہزار رشہ ہو جائے گا۔ داماد اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسا تم مناسب سمجھو۔ میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔“

نوکری کی اجازت مل جانے کے بعد جیلہ نے سب سے پہلے ماریہ کی بڑی بہنوں سے رابطہ کیا اور انہوں نے بڑی ہی عجیب جواب دیا کہ ”تم جیسی خوب صورت لڑکی کو کون اپنی سیکرٹری بنانا پسند کریں گے۔“

جیلہ کو سمجھ نہیں آ یا کہ اس کی خوب صورتی کا نوکری سے کیا تعلق ہے، لیکن اس نے اس بحث میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔

”باجی یہ بہت ضرورت مند ہے۔ اس لیے پلیز ذرا جلدی کر دیں اگر ایک آدھ مہینے میں ہو جائے تو بہت ہی مناسب ہے۔“ ماریہ نے اس کی سفارش کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ایسا کرو تم کل آ جانا۔ میں تمہیں ایک جگہ لے جاؤں گی۔ ایک صاحب نے مجھ سے ذکر کیا تھا، ہو سکتا ہے وہاں کام بن جائے۔“ ماریہ کی بہن نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد جبیلہ نے چوہدری رمضان کے دفتر میں پہلا دن گزارا۔ چوہدری رمضان ایک اوجیز عمر آتی تھا، لیکن دولت کی فراوانی نے اسے جوان بنا رکھا تھا۔ جبیلہ اس کے دفتر میں ماریہ کی بہن کے ساتھ آئی تھی۔ وہاں بغیر کسی ٹیسٹ کے اسے رکھ لیا گیا تھا۔ جبیلہ کے ذہن میں ماریہ کی بہن کا قہر بھی گونجا تھا، لیکن ملازمت کے پہلے روز چوہدری رمضان نے جب اپنے اقدام کی وضاحت کی تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”دراصل میں جبیلہ ایہ آپ کی ملازمت کا پہلا چانس ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ شروع میں ہی آپ کو کچھ تجربہ بات ہوں۔“ چوہدری رمضان نے اپنی بات شروع کی۔ ساتھ ہی ایک بات اور بھی بے اور وہ یہ ہے کہ ابھی آپ ہی ہیں اور کام سمجھتے سمجھتے ہی جیسے کوئی دوسرا بندہ شاید برداشت نہ کر پائے۔ جس طرح میں برداشت کر لوں گا۔ اس لیے میں نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔“ چوہدری رمضان کی بات مکمل ہوئی تو جبیلہ سر سے پاؤں تک اس کی شکرگزاری میں ڈوب چکی تھی۔

جبیلہ کی جانب سے کوئی بھی خوش نہیں تھا، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پہلے دن جب جبیلہ نے جانب لیا جانے کی خوش خبری سنا تو سب کی آنکھیں بھرا آئیں۔ جبیلہ نے بتایا تھا۔ چوہدری رمضان نے اس کی تنخواہ دس ہزار ماہانہ مقرر کی اور کہا کہ وہ دل لگا کر کام کرے گی تو اس میں اضافہ بھی ہوگا، لیکن اس کی بات پر کسی نے توجہ نہ دی۔ سب ہی کو اماں کی یاد آئی تھی۔ جو اچانک اس سے بچھڑ گئے تھے۔ کسی کا وہاں اس طرف نہیں گیا تھا کہ اس کمر کی آمدنی میں کتنی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ ثریا اور نبیلہ تو پھر بھی اسے آنسو چھپا کر نہیں دیکھتی، لیکن اماں تو یہ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ بڑی حسرت سے انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”کتنی تنہا تھی ان کو کہ تجھے کسی قابل بناتے کیا خبر تھی کہ۔“ اس کے بعد سب کیوں ان کے الفاظ ہی چھین لیے تھے۔

جبیلہ کی ملازمت کا وہ تیسرا ماہ تھا۔ جب عمران اپنے امتحانات سے فارغ ہو کر واپس آ گیا تھا۔ بابا نے اسے نہ تو جبیلہ کے ابا کی موت کی خبر دی تھی اور نہ ہی اس کی ملازمت کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کا خیال تھا آخری امتحانات کے دوران اگر اسے اس طرح کی بری اطلاعات دی گئیں تو اس کے مستقبل پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ شام کو جب جبیلہ دفتر سے واپس آئی تو اماں کے ساتھ عمران کو بیٹھا دیکھ کر وہ اپنے تمام دکھ بھول گئی، لیکن عمران نے اسے جن نظروں سے دیکھا، وہ ان باتوں کا کھلا ثبوت تھا کہ عمران اس سے خوش نہیں تھا۔ پھر اگلے ہی دن یہ بات ثابت بھی ہو گئی۔ جب عمران اس کے دفتر آ گیا تھا۔ چوہدری رمضان ان دنوں غیر ملکی دوروں پر تھے۔ اس لیے فراغت ہی فراغت تھی۔ عمران دفتر آ تو وہ خوش ہو گئی کہ فرصت سے باتیں ہوں گی، لیکن وہ وہ بیٹھتی ہی شروع ہو گیا۔

”کیا ضرورت تھی ملازمت میں آج اس نے غصے سے کہا۔“

”پھر کیا کرتی! بیک باگتی۔“ جبیلہ کو اس کی بات سے زیادہ اس کے انداز پر غصہ آ گیا تھا۔

”ہاں تو تیار نہیں تھے، پھر کیوں کیا تم نے؟“

”میں نے بابا سے اجازت لی تھی اور پھر اب بھی اپنے اس وعدے پر قائم ہوں کہ جب تم نوکری کر لو گے تو میں ملازمت چھوڑ دوں گی۔“ اس کی آواز بولنے بولتے رنڈھ گئی تھی۔

”آئی ایم سوری جبیلہ! لیکن میں تمہارے نام کے ساتھ کسی اور کا نام برداشت نہیں کر سکتا۔“

عمران کی بات سن کر جبیلہ کو ہنسی آ گئی۔ بھلا ملازمت کرنے سے بھی کسی کے ساتھ نام وابستہ ہو سکتا ہے۔“

اس روز عمران دفتر میں زیادہ دیر کے بغیر ہی واپس آ گیا۔ پھر ایک روز درود کے بعد جبیلہ کو نبیلہ سے معلوم ہوا کہ عمران نوکری تلاش کر رہا ہے۔ اس نے سوچا ابھی تو عمران کا نتیجہ بھی نہیں نکلا پھر عمران کو ابھی

ملازمت کیسے مل سکتی ہے، لیکن وہ خاموش رہی اس ایک جھڑپ کے بعد ان کی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جبیلہ جانتی تھی کہ عمران اب اس وقت تک اس سے کوئی بات نہیں کرے گا جب تک وہ کوئی نوکری تلاش نہیں کر لیتا۔

عمران کی نوکری کے لیے تک دو جاری ہی تھی کہ جبیلہ ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو گئی۔ چوہدری رمضان کا رویہ اس کے ساتھ پہلے دن سے ہی بہت اچھا تھا، لیکن یورپ سے واپسی پر ایک دن اس نے اس سے ایسی بات کہی جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھی۔ اس روز چوہدری رمضان اسے بچ کرانے فائبر اشارہ ہوئے میں لے گیا۔ یہ پہلا اتفاق نہیں تھا۔

اس سے پہلے بھی جب وہ کسی بڑی باری کو دعوت دیتا تھا تو جبیلہ اس کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ جس باری کو مدعو کیا ہوتا تھا۔ وہ نہیں آتی تھی۔ ایسی حالت میں وہ دونوں کھانا کھا کر واپس آ جاتے تھے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہوئے جبیلہ کو عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ مودب سے پھرے دیکھ کر جبیلہ کے خواب پھر سے بے دار ہونے لگے تھے، لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اسے حقیقت کا سامنا کرنا آ گیا تھا۔ اس لیے اس نے خواب دیکھنے

چھوڑ دیے تھے۔ اس روز جب چوہدری رمضان نے اس سے کہا، کہ آج آپ مجھے میرے ساتھ کریں گی تو جبیلہ یہی سمجھی کہ آج پھر کسی باری کو مدعو کیا ہے اور اس کی موجودگی ضروری ہوگی، لیکن کسی کو مدعو نہ پا کر جبیلہ کو حیرت ہوئی تھی، لیکن وہ خاموش رہی، کھانے کے دوران بھی زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔

لیکن کھانے کے بعد چوہدری رمضان نے جب وہ بات کہی تو جبیلہ کا کانٹا نہیں دھکتی رہی۔ وہ بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ بڑی مشکلوں سے وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔ ”سر یہ کیسے ممکن ہے۔ میری مٹھی بھری ہوئی ہے۔ اس کی نظروں میں عمران کا چہرہ گھوم گیا، لیکن چوہدری رمضان بھی پوری تیاری کے ساتھ آ گیا تھا۔

”میں جانتا ہوں جبیلہ کہ تمہاری مٹھی بھری ہے اور تمہارے منگیتر کا نام عمران ہے۔ جو تمہارے پڑوس میں اپنے والد کے ساتھ تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے ابھی ایم اے کا امتحان دیا ہے اور آج کل ملازمت کی تلاش میں بیٹھ رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تمہارے اور اس کے درمیان کی طرح کی اہلیت بھی ہو جسے تم دونوں محبت سمجھ رہے ہو سب باتیں جاننے کے باوجود میں تم سے یہ بات کر رہا ہوں۔“

جبیلہ کو حیرت تھی کہ چوہدری رمضان اس کے بارے میں اتنی باتیں جانتا ہے اور اسی حیرت میں خاموش بیٹھی وہ اس کو دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ مخاطب ہوا۔

”ان سب باتوں کے علاوہ شاید میری اور تمہاری عمروں کا فرق بھی تمہیں کچھ ہونے پر مجبور کر سکتا ہے، لیکن جبیلہ میں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک پریکٹیکل لڑکی ہو۔ ہر لڑکی کے ذہن میں شادی کے بعد کچھ خواب ہوتے ہیں۔ وہ ایک مضبوط حقیقت کے نیچے کبھی زندگی گزارنا چاہتی ہے اور ایسی زندگی میں ہی تم کو بے سکتا ہے۔ پریکٹیکل لائف میں عمران مجھ سے کوسوں دور ہے۔ اتنا پیچھے کہ شاید پوری زندگی میں اتنا نہیں کما سکے جتنا میں ایک مہینے میں کما لیتا ہوں۔ ابھی تو وہ نوکری کی تلاش میں ہے۔ اگر اسے خوش قسمتی سے نوکری مل بھی گئی تو شاید اس سے زیادہ نفل مل سکتا تھا ابھی کارہی ہو۔ اس کے بعد کیا ہوگا کہ وہ دس پندرہ ہزار کی تنخواہ میں تمہارے خواب پورے کر سکے گا؟“

جبیلہ گم گم اسے دیکھتی رہی۔ وہ بچ کہہ رہا تھا، لیکن وہ عمران سے بے وفائی کیسے کر سکتی تھی اس نے تو عمران سے بہت سے وعدے کر رکھے تھے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے تھے کہ جن کے بارے میں عمران بھی نہیں جانتا تھا۔

”مجھے کچھ سونے کے لیے وقت چاہیے۔“ آخر کار اسے زبان کھولی پڑی

”بالکل۔۔۔ کچھ وقت نہیں بلکہ بہت سادقت
لو، لیکن صرف ایک وعدہ کرو کہ بند آنکھوں سے نہیں
بلکہ آنکھیں کھول کر سوچو گی۔“ چوہدری رمضان نے
مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی
مسکرا دی۔

ہوٹل سے واپسی پر ہنڈا کار کی اگلی نشست پر
بیٹھے ہوئے بھیلے نے سوچا۔ کیا بھی عمران ایسی کوئی
کار خرید سکا۔ وہ تو شاید اس ہوٹل میں کھانے کو بھی
دنیا کی سب سے بڑی عیاشی سمجھے گا۔

اسے گھر میں بھیلے کی ہمت نہیں بڑی کہ وہ کسی
سے اس مسئلے میں بات کرنی۔ لے دے کہ ایک ماریہ
کی ذات ایسی تھی جس سے وہ اس مسئلے پر بات کر سکتی
تھی، لیکن بھیلے نے جیسے ہی بات شروع کی وہ لڑنے
مرنے پر تیار ہو گئی۔

”تم نے فوراً ہی چوہدری رمضان کی بات
کیوں نہیں مان لی۔“ ماریہ بری طرح ایکساٹڈ
ہو رہی تھی۔

”میں نے ان سے سوچنے کے لیے وقت مانگا
تھا جو انہوں نے دے دیا۔“ بھیلے نے جواب دیا۔

”یہاں تک تو ٹھیک ہے اس طرح تمہاری سبکی
بھی نہیں ہوئی، لیکن اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔
ہاں کرو۔“ ماریہ کا دھڑ دھڑا پوری طرح چوہدری
رمضان کے حق میں تھا۔

”لیکن ماریہ وہ عمران۔۔۔!“ بھیلے نے جھپکتے
ہوئے کہا۔ ماریہ کو ان دونوں کے بارے میں مکمل علم
تھا۔

”دیکھو بھیلے! قسمت نے پہلی بار تمہارے
دروازے پر دستک دی ہے۔ اسے ٹھکراؤ نہیں۔ اگر تم
ان جذباتی چکروں میں پڑ گئیں تو تمام عراس پر
چھپتا رہو گی۔ عمران جیسے نجانے کتنے چوہدری
رمضان کے ملازم ہوں گے۔ وہ اگر تمام عمر بھی خوش
کرتا رہے تو اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا، جہاں آج
چوہدری رمضان کھڑا ہے۔“ ماریہ کی زبان پر بھی
چوہدری رمضان کی تعریف تھی۔

”لیکن ماریہ امی کبھی اس بات پر تیار نہ ہوں
گی۔“ بھیلے نے اپنی ایک اور مشکل بتاتے ہوئے
کہا۔

”تو تم کیا چھوٹی بچی ہو جو ہر کام اپنی امی سے
پوچھ کر کرو گی۔“ ماریہ اس کی بات سن کر ہنسر
آئی۔ ایک بار تمہاری اور چوہدری رمضان کی شادی
ہو گئی تو تمہاری امی زیادہ سے زیادہ چند دن ناراض
رہیں گی۔ پھر خود بخود مان جائیں گی، یوں بھی مائیں
زیادہ دن ناراض نہیں رہ سکتیں اور تمہاری امی کے
سامنے تو یوں بھی بہت سی مجبوریاں ہیں۔ تمہاری
دونوں چھوٹی بہنیں ہیں اور ان کا مستقبل بھی تم سے
وابستہ ہے۔ اگر تم کسی بڑے گھر میں بیٹائی جاتی ہو تو
تمہارے توسط سے قسمت ان پر بھی مہربان ہو سکتی
ہے۔ ویسے ہی تم اپنے خاندان کی واحد کلاؤن کرن ہو۔
یہ بات بھی تمہاری والدہ کی نظروں میں ہوگی۔“ ماریہ
کی باتوں میں وزن تھا، مگر بھیلے کو خوف محسوس ہو رہا
تھا۔

اس روز بھیلے گھر میں داخل ہوئی تو عمران اس
کی امی کے پاس بیٹھا تھا۔ بھیلے کو یوں محسوس ہوا جیسے
عمران صرف اسی کو دیکھنے کے لیے امی کے پاس بیٹھا
تھا، لیکن اس کے دل کے چور نے اسے اس وقت تک
کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جب تک عمران امی کے
پاس بیٹھا رہا۔ وہ خود میں اپنی ہمت نہیں ہار رہی تھی کہ
عمران کا سامنا کر سکے۔ عمران غلامی کا تو وہ کمرے
سے باہر نکلی۔ امی نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہے، لیکن
ان کی نظریں بتا رہی تھیں کہ انہیں بھیلے کا یہ رویہ پسند
نہیں آیا۔ کھانا کھاتے ہوئے امی نے ایک اور
انکشاف کیا کہ ”عمران آج رات کراچی جا رہا ہے۔“
”کیوں؟“ بھیلے نے ایسے پوچھا جیسے وہ
سارے معاملے سے لاعلم ہے۔

”بابا کی تنگی صبح نے کراچی میں اس کے لیے
نوکری کا بندوبست کیا ہے۔ عمران تیار رہا تھا کہ ایک
رہی ساز نوڈ دینا ہے اور اس کے بعد اسے نوکری مل
جائیں گی۔“ اماں اس طرح خوش ہو کر اسے بتا رہی

تھی جیسے نوکری عمران کو نہیں خود اماں کو مل رہی ہو۔
”پندرہ ہزار روپے ماہانہ اور ترقی کے امکان
بھی ہیں۔“ اماں نے بتایا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو سب سے زیادہ خوش
بھیلے کو ہی ہوتی، لیکن پہلے چوہدری رمضان کی باتیں
اور پھر ماریہ سے بات ہونے کے بعد بھیلے ایک گھنگو
کی حالت میں جتا ہو چکی تھی۔ پندرہ ہزار ہوتے ہی
کہتے ہیں اس نے سوچا پھر پیسے جیسے وہ سوچتی رہی
مادی رشتے جذباتیت پر حاوی ہوتے چلے گئے۔
چوہدری رمضان کی بات مان لینے کا مطلب ہر طرح
کی آسائش تھی۔ عمران کے ساتھ وعدہ نبھانے کے
مطلب سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ وہی
مجبوریاں جس کا سامنا بچپن سے لے کر اب تک کرنی
آئی تھیں برقرار رہیں۔ کہنے کو تو عمران نے کہہ دیا تھا
کہ ”اتنا ذخیرہ سہارا رویہ کتنا چاہتا ہے کہ اس کے
بچوں کو ان محرومیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے جن سے
اسے خود دو چار ہول بڑا تھا، لیکن وہ سب خیالی باتیں
تھیں۔“

بچپن کی ایک ایک مجبوری بھیلے کے سینے پر نقش
تھی۔ اماں کی غربت نے انہیں جس طرح اپنی چھوٹی
خواہشوں کو سینہ میں دفن کرنے پر مجبور کر دیا تھا وہ ایک
ایک کر بھیلے کو پھر یاد آئے لگیں۔ تو کیا میرے بچے
بھی کھلونوں سے اسی طرح احتیاط سے کھیلنے پر مجبور
ہوں گے جس طرح ہم خود مجبور تھے۔ اس کی بھینکی
ہوئی سوچوں نے سوال کیا۔ اسے یاد تھا وہ بچپن میں
کھلونوں سے احتیاط سے کھیلنے پر اس لیے مجبور تھے
کہ اگر ایک کھلونا ٹوٹ جاتا تو پھر انہیں مینڈوں سے
کھلونے کا انتظار کرنا پڑتا۔ ایک بار اس نے اپنی
پلاسٹک کی گڑیا کو اسی طرح اچھا ل کر پکڑا جابا تھا
جس طرح اماں اس کی چھوٹی بہن کو اچھا ل کر پکڑتے
تھے تو اس کی گڑیا کا سر زمین پر گر کر دھڑ سے الگ
ہو گیا تھا۔ کھلونا توڑنے پر اسے اماں کی مار کا سامنا تو
کرنا ہی پڑتا تھا ساتھ ہی اماں کے سامنے مینڈوں سے
کھلونے کے لیے گڑا کرنا بھی پڑتا تھا۔ اماں نے

پلاسٹک کی گڑیا کا سر جو لمبے پر گرم کر کے اسے ہنڈ پر
جوڑ کر اسے بھلانے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن گڑیا
جہاں جہاں سے جوڑنے کی کوشش کی گئی تھی وہاں
وہاں سے گڑیا اتنی کر یہہہ انظر ہوئی تھی کہ بھیلے کو اس
سے خوف آنے لگا تھا۔ عمران کی نوکری کے بارے
سن کر بھیلے کو یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ اب اس کے
پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔ بہت ممکن ہے کہ عمران
نوکری جو ان کرتے ہی اس سے ملازمت چھوڑنے کا
مطالبہ کرے۔ رات دیر تک گمانے کے بعد جب وہ
صبح اٹھی تو عمران کراچی جا چکا تھا۔

بھیلے دفتر پہنچی اور ایک نئی حیرت اس کی خاطر
تھی۔ ماریہ اس کے دفتر میں براہمن تھی۔ بھیلے بھی
کروہ اس سے ملنے آئی ہے، لیکن جب اسے یہ معلوم
ہوا کہ ماریہ کی اپائنٹ بھی اسی دفتر میں ہو چکی ہے تو
اس کی حیرت عروج پر پہنچ گئی۔

”کل شام تک تو انکی کوئی بات نہیں تھی!“ اس
نے سوال کیا۔

”ہاں دراصل رات چوہدری رمضان گھر آئے
تھے۔ انہوں نے آفر کی تو میں منہ نہیں کرا پی۔“ ماریہ
نے جواب دیا۔

”کیسی آفر؟“ بھیلے کی حیرت اپنی جگہ برقرار
تھی۔

”دراصل چوہدری رمضان کی جو پہلی بیک پیڑی
تھی وہ ان کے ساتھ فارن ٹور پر بھی جایا کرنی تھی،
لیکن جب سے تم آئی ہو ان کو اس مسئلے میں مشکل
ہونے لگی ہے۔ میرا اپائنٹ انہوں نے اسی لیے کیا
ہے کہ میں ان کے ساتھ فارن ٹور پر بھی جا سکوں۔
جب وہ یہاں ہوں گے تو میری ڈیوٹی الگ
ڈیوٹی منٹ میں ہوگی۔“ ماریہ نے تفصیلی جواب دیتے
ہوئے کہا، لیکن اس میں خطرے کی بو محسوس ہوئی وہ
مردوں کو اپنا گردیدہ بنانا جانتی تھی۔ اگر وہ چوہدری
رمضان کو رجھانے میں کامیاب ہو گئی تو۔۔۔ اس
سے آگے وہ سوچ بھی نہ پائی۔ اگرچہ ابھی وہ کوئی
فیصلہ نہ کر پائی تھی، لیکن ماریہ کی آمد کو اس نے اپنے

لیے خطرہ محسوس کیا تھا۔

عمران نے توقع کے عین مطابق نوکری ملتے ہی جیلہ سے استعفا دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ خط اس کے دفتر کے پتے پر آیا تھا۔ اس لیے یہ بات گھر والوں سے پوشیدہ رہی تھی۔ جیلہ نے بھی اسے پہلی بار خط لکھا تھا کہ کیوں کر اس کے پاس باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی غیر موجودگی میں وہ استعفا نہیں دے سکتی۔ اس لیے ان کو چند دن حزیہ انتظار کرنا ہوگا۔ ماریہ کی تقرری کے تیسرے روز ہی چوہدری رمضان سنگا پور چلے گئے تھے۔ اس بار ماریہ بھی ان کے ساتھ تھی اگرچہ یہ دورہ صرف آٹھ دن کا تھا، لیکن یہ آٹھ دن جس طرح جیلہ نے تڑپ کر گزارے تھے۔ یہ بات صرف وہ ہی جانتی تھی۔ عمران کو مختاطہ جواب دینے میں بھی اس کا یہ ہی دخل تھا کہ کہیں واپسی پر چوہدری رمضان پر ماریہ کا رنگ غالب نہ آچکا ہو اور اس طرح وہ کہیں کی نہ رہے۔ ورنہ وہ اس بات کا فیصلہ کر چکی تھی کہ قسمت کی دیوی کو اپنے دروازے سے مایوس نہ جانے دے گی۔ بچپن سے وہ جو خواب دیکھتی آئی تھی اب اس کے پورا ہونے کا وقت آیا تھا۔ تو وہ اپنے خوابوں سے منہ نہیں مڑ سکتی تھی۔ عمران کی ہم عمر میں ہی وہ ہی دکھ اس کے منتظر کمرے تھے جن کا سامنا وہ بچپن سے لے کر جوانی تک کرتی چلی آئی تھی۔ ماریہ واپسی پر اکیلی آئی تھی۔ ”چوہدری رمضان دو دن بعد آئیں گے۔“ اس نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔ ”دراصل انہیں کچھ کام تھا جس میں انہیں میری ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے مجھے بھیج دیا اور خود گھر گئے۔“ جیلہ اس کی زبان سے بہت کچھ سنتا چاہتی تھی، لیکن خود سے پہل نہیں کرتا تھا۔ ماریہ بھی۔ پھر ایک طرح سے وہ ماریہ کو ناہنجاریف بھیجے لگتی تھی۔ اس لیے بھی اس کے رویے میں وہ پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی، لیکن جب ماریہ نے سنگا پور کی روداد سنائی شروع کی تو وہ اپنی نظروں میں شرمندہ ہوئی کہ بے کار اس نے اپنی اتنی پیاری بیکلی پر خشک کیا۔

”کچھ کہتی ہوں جیلہ رمضان صاحب کی زبان پر ہر وقت تیرا ہی نام رہتا ہے۔ کئی بار تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ابھی کریمان پھاڑ کر جیلہ جیلہ پکارتے جنگل میں گل جابیں گے۔“ جیلہ تو اتنا سنتے ہی شرما گئی تھی، لیکن ماریہ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ”اندروں سے وہ بے چارے بہت دھمی ہیں۔“ ماریہ نے چوہدری رمضان کی وکالت کا ذمہ اٹھایا ہوا تھا۔ ”بیوی کی موت کے بعد سے وہ اکیلے ہیں اور کہتے ہیں جیلہ سے پہلے کوئی لڑکی ایسی نہیں ملی جسے میں اپنی زندگی میں شامل کر سکتا ہوں۔ اب وہ ملی بھی ہے تو اتنی دولت ہونے کے باوجود بھی میں فقیر ہوں۔“ ماریہ دن بھر اسی طرح اسے چوہدری رمضان کے قے سناتی رہی اور وہ خاموشی سے سنتی رہی اور پھر جب واپسی پر ماریہ نے اسے چوہدری رمضان کا دیا ہوا تحفہ دیا تو وہ حیران رہ گئی۔ اسے دل ہی دل میں چوہدری رمضان کی فضول خرچی پر غصہ آنے لگا۔ ”یہ سب رمضان نے دلائے ہیں۔“ جیلہ نے قیمتی تحفوں کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ خشک کی چنگاری پھر سے اس کے دل میں سراپا ہمارے لگی۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں میری جان جو شاہنشاہ انہوں نے تمہارے لیے کی ہے اگر وہ دیکھو گی تو بے ہوش ہو جاؤ گی۔“ ماریہ اس کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک وقت تو مجھے لگے گا کہ وہ پورا سنگا پور ہی خرید ڈالیں گے۔“ ماریہ کی باتوں نے اس کے ارادے کو اور پختہ کر دیا۔ جیلہ چوہدری صاحب تمہارے دیوانے ہیں اور جیسی کیوں نہ ہوں ہماری سبکدوشی بھی تو لاگوں میں ایک ہے۔“ ماریہ نے ایسے انداز میں کہا کہ وہ شرما گئی۔ ماریہ کی باتوں نے جیلہ کو ایسے اپنے ٹرانس میں لایا کہ چوہدری رمضان کی واپسی تک وہ اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے سب سے لڑنے مرنے کو تیار تھی۔ ایسا کی طرف سے جو ایک تھوڑی سی مزاحمت کی توقع تھی وہ بھی ماریہ کی تسلیوں کے بعد دور ہو چکی

تھی۔ ”چند دن کی بات ہے پھر تمہاری امی تم پر فخر کرے گی۔ کون ماں اپنی بیٹی کو ہنڈا اکارڈ میں گھومتا دیکھ کر خوش نہ ہوگی! ماریہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

جیلہ چاہے کبھی اس دن کی یاد کو اپنے ذہن سے کھرچ کر نہیں نکال سکتی جب اس نے اماں کو اپنی اور چوہدری رمضان کی شادی کی خبر سنائی تھی انہوں نے اسے کھڑے کھڑے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ دراصل اس کا نکاح چوہدری رمضان سے ماریہ کے گھر پر ہوا تھا اور وہ اور چوہدری رمضان اماں کی دعا میں لینے گھر آئے تھے پر اماں نے تو پہلا جملہ سنتے ہی اس کو گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اسے اماں کی طرف سے اسے روکل کی توقع تھی۔ یوں بھی ان تینوں بہنوں کو اماں سے یہ ہی شکایت تھی کہ وہ اپنی عمر ان کو ترجیح دیتی ہیں، لیکن اس روز سے قبل اس کو اس عجیبی شہادت کا درست اندازہ نہیں تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ عمران سے محبت کی وجہ ان کا بیٹے سے محرم ہونا ہے، لیکن اس دن اسے اس احساس ہوا کہ اماں عمران کی محبت میں کچھ بھی ترک کر سکتی ہیں۔ اسے اس دن اپنی بے عزتی کے بجائے اپنے شوہر کی بے عزتی زیادہ محسوس ہوئی تھی، لیکن چوہدری رمضان کی پیشانی پر محسن تک نہ آئی تھی بلکہ وہ جیلہ کو تسلی دیتا رہا تھا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا جیلہ! بس کچھ دن کی بات ہے پھر تمہاری ماں بھی ہم سے آئے گی۔“ رمضان نے پہلی رات اس کا غم غلط کرتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ چند دن تھے کہ پورے ہی نہیں ہو رہے تھے۔ ان کا بچہ منوں بھی چار ماہ جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا، لیکن اماں نے نہ آتا تھا نہ آئیں۔ رمضان اسے لے کر چند دن کے لیے کسی دوسرے ملک کے دورے پر چلا جاتا۔ وہاں کچھ برس کی باتیں ہوتیں اور پھر وہ محسوس پھرتے پھرتے اور واپس آ جاتے۔ ایک دو روز ملک میں رہنے کے بعد دوبارہ کسی دوسرے ملک میں روانہ ہو جاتے۔ بقول رمضان وہ سارا برس

تو کروں کے حوالے نہیں کر سکتا اس لیے وہ بار بار وطن واپس آتا ہے۔ جیلہ نے چاہا بھی کہ رمضان اس کی والدہ سے رابطہ کرے پر وہ بار بار اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیتا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ جب بھی وقت آئے گا، میں خود تمہیں لے کر تمہارے گھر جاؤں گا۔ جیلہ خاموش ہو جاتی آخر رمضان نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ آخر وہ جو فیصلہ کریں گے درست ہی کریں گے۔ وہ خود کو مطمئن کرنے والے انداز میں کہتی۔

ان چار چہیتوں میں ماسوائے اپنے گھر سے دوری کے غم کے جیلہ کے چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بیٹی منوں کے نام پر وہ آدھی دنیا گھوم چکی تھی، جن جگہوں کے نام اس نے کتابوں میں پڑھے تھے۔ اب وہ ان جگہوں پر خود ہو آئی تھی اور جن جگہوں کی تصویریں دیکھ کر وہ خوش ہو جایا کرتی تھی اب ان مقامات کو خود اپنے ہاتھوں سے چھو کر آئی تھی۔ بڑے سے بڑے شنگے میں رہنے کا شوق اور غریبی کا لڑیوں میں پھرنے کا شوق وہ پورا کر رہی تھی، لیکن کبھی کبھی جب گھر والوں کی یاد آتی تو دل میں ایک ہوک آتی۔ اماں اور بہنوں سے ملنے کی خواہش اسی طرح برقرار رہتی۔ اگر ایک روز اسے ہمیشہ مل جاتیں۔

اس رات اسے امریکا جانا تھا جس کے لیے رمضان نے آرڈر دے کر اس کے لیے چوڑے کی جیکٹ بنوائی تھی اور وہ بازار سے وہ ہی لے گئی تھی اور اسے بس اسٹاپ پر اپنی دونوں ہمیشہ ملی تھیں۔ وہ بہت تیزی سے ان کی طرف بڑھی مگر کسی سگن دونوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا تھا۔ چھوٹی بہنوں کا یہ رویہ دیکھ کر وہ تڑپ ہی تو گئی تھی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ ہی آیا تھا کہ اس کے آ جانے سے عمران اور اس کے بابائے بھی اس سے رشتہ توڑ لیا ہوگا۔ جب ہی تو وہ دونوں بس اسٹاپ پر کھڑی ہیں۔ ورنہ ہمیشہ بابائی انہیں لے جاتے اور چھوڑتے تھے۔ بہنوں کے منہ پھیر لینے کے باوجود اس نے ان کا پیچھا چھوڑا۔ ”نیلہ اور شریا یہ میں ہوں تمہاری بہن جیلہ!“

اس نے بڑے دلار سے کہا، لیکن دونوں اسی طرح منہ پھیرے کھڑی رہیں۔

”کیا بہت ناراض ہو۔“ اس نے گھوم کر بہنوں کے قریب جا کر کہا۔

”آپ کون ہیں بیگم صاحبہ۔ میں آپ کو نہیں جانتی!“ ثریا نے کہا، لیکن اس کی آواز بھرا گئی۔ پورے گھر میں ثریا اس سے زیادہ قریب تھی۔ سردیوں کی راتوں میں وہ خلاف میں گھر کر دیر تک باتیں کیا کرتی تھیں، لیکن آج اس کی وہ بی لاڈلی بہن اسے پہچاننے سے انکاری تھی۔ جیلہ کا جی چاہا کہ وہ اس کو جھجھوڑ جھجھوڑ کر کہے کہ اس نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا ہے کہ وہ اسے بیگم صاحبہ کہہ کر پکار رہی ہے، لیکن اس کی زبان سے صرف اتنا نکل سکا۔ ”میں جیلہ ہوں ثریا! تمہاری بڑی بہن۔“

”میں نے آپ سے کہا تا بیگم صاحبہ! کہ میں آپ کو نہیں جانتی اور ایک بات اور۔۔۔ وہ یہ کہ اس نام کی میری کوئی بہن نہ تھی نہ ہے ہاں ہمارے بھائی کی منگیت کا یہی نام تھا، لیکن وہ کسی امیر بوڑھے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اس لیے اب اس سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ ان چند جملوں میں ثریا بہت بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ جیلہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے بعد کیا بات کرے۔

”اماں! یہی ہیں“ اس نے بڑی مشکل سے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے ثریا نے اسے جن نظروں سے گھورا تھا اس میں زمانے بھر کی نفرت موجود تھی پھر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں زمانے بھر کا زہر گھلا ہوا تھا۔ ”اگر آپ کی مراد ہماری ماں سے ہے، تو پھر آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں کہ جن ماؤں کی بیٹیاں گھر سے بھاگ جاتی ہیں وہ پھر زندہ نہیں رہیں۔“

جیلہ کے کپڑوں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

”تو کیا اماں۔۔۔؟“ اس کے آگے زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

”آپ بالکل درست سمجھی ہیں جس روز ہمارے بھائی کی منگیت نے ایک بوڑھے سیٹھ سے شادی کی تھی اسی ہفتے ہماری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔“ ثریا کی زبان سے پچھلے گھر کا نکل نکل کر جیلہ کے کانوں میں گر رہی تھیں۔ ”مرتے وقت انہوں نے وصیت کی تھی کہ مرنے والے کو آپ کو ان کے جنازے میں بلایا جائے اور نہ ہی ان کی قبر کا بتایا جائے، لیکن اس کے باوجود عمر ان بھائی آپ کے گھر تیار نہ گئے تھے، لیکن آپ اپنے سیکنڈ ہینڈ خاوند کے ساتھ ہی مومن پرگنی ہوئی تھیں، اب لے دیے وہاں سے وہاں آ گئے۔“

اس سے زیادہ سننے کی تاب جیلہ میں نہیں تھی، لیکن ثریا کو تو قسمت سے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا، وہ اسے کہے خارج کرتی۔

”آپ نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی تھی، عمران بھائی کراچی سے اپنے امتحان ہی نہیں بلکہ مقابلے کے امتحان بھی دے کر آئے تھے اور اسی لیے ان کے آنے میں دیر ہوئی تھی جس کے لیے انہوں نے یہاں بنایا تھا کہ کراچی میں چنگاموں کی طرح سے امتحان لیت ہو گئے تھے، اپنے پاس ہونے کا انہیں یقین نہیں تھا، لیکن اب وہ بہت اچھے نمرود ہیں۔“

اس سے پاس ہو گئے ہیں اور تم نے ایک ایسے انسان سے شادی کر لی جسے اس کے اپنے بڑے بھائی نے چھوڑ دیا ہے۔“

”بولتے بولتے ثریا کی آواز بھرا گئی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گئی۔ جیلہ کو تو اپنا ہوش نہیں تھا۔ وہ کیا بولتی پھر جب ثریا اپنے جذبات چاقو بالانے میں کامیاب ہوئی تو اس نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔“ آپ تو یہاں نہیں ہوئی کی جب اخبار میں ہمارے بھائی کی تصویریں چھپی تھیں کہ یہ ہے وہ جو ان جو مقابلے کے امتحان میں پورے پاکستان میں اول آیا ہے آج کل وہ ٹریننگ پر ہیں اور ان شاء اللہ ایک دن بہت چلہ کامیاب بن کر لوٹیں گے۔“

جیلہ میں صحت نہیں تھی وہ ثریا سے اماں کی قبر کے بارے میں پوچھے تو کہہ کر کم ثریا کی زہر بھری باتیں سن رہی تھی کہ اسے دور سے بس آئی

دکھائی دی پھر بس آجکی تھی، دونوں بہنیں مزید کچھ کہنے کے لیے بڑھ گئیں پھر جب تک بس نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی جیلہ اس پر نظر بس جاتی کھڑی رہی۔ گھر آنے تک تو اس نے کسی ناکی طرح خود پر کنٹرول رکھا، لیکن پھر اس کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اسے آج احساس ہوا تھا کہ دولت کے حصول اور امیر بننے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے کتنی بڑی قیمت دی ہے۔ چوہدری رمضان سے شادی نے اس کے ماضی کے رشتے یوں ختم کر دیے تھے کہ اب وہ چاہ کر بھی اسے استوار نہیں کر سکتی تھی۔

اپنا کارینڈا کر کے وہ اپنے ٹوٹے ہوئے رشتوں اور ماں کے غم میں آسو بہاتی رہی اور تب تک بھائی رہی جب تک چوہدری رمضان واپس نہ آ گیا۔ اپنے غم کی کچھ مناتے ہوئے اسے اس بات کا احساس بھی ہوا کہ ہاں سورج بہت دیر پہلے اپنا چہرہ افق کے پار چھپا چکا ہے اور اتر کر سرے میں ہر طرف اندھیرا چھیل چکا ہے جس کے اپنے اندر اندھیرا چھیل چکا ہو اسے باہر کے اندھیروں کا کب ہوش رہتا ہے یہ ہی کیفیت جیلہ کی بھی تھی، وہ نہ جانے اور کتنی دیر محبت کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کا ماتم کرتی رہی کہ چوہدری رمضان کی آواز آئی۔

”خیریت تو ہے، یہ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔“

اس نے روشنی کرتے ہوئے بڑے پیار سے سوال کیا۔

”رمضان! اماں مر گئیں رمضان!“ جیلہ اس کی آواز سن کر روری طرح سرکنے لگی۔

”تو نہیں معلوم ہو گیا۔“ چوہدری رمضان نے کچھ عجیب سے لہجے میں کہا۔ جیلہ یہی سمجھ رہی تھی کہ جوابات اسے آج معلوم ہوئی ہے وہ چوہدری رمضان کو کبھی پہلے نہیں معلوم ہوئی، لیکن اس کی زبان سے نکلے ہوئے فقرے کا مطلب تو یہ ہی تھا کہ وہ یہ بات پہلے سے جانتا تھا۔

”تو تم جانتے تھے کہ اماں مر چکی ہیں، لیکن مجھے تسلیاں دیتے رہے تھے۔“ جیلہ نے سسکتے ہوئے

کہا۔

”کیا فائدہ ہوتا ہے تمہاری جو حالت آج ہوئی وہ چار ماہ پہلے ہو جاتی۔“ رمضان اپنی پہلی غلطی کے بعد سچیل چکا تھا۔

جیلہ کا دل چاہا، اس سے پوچھے کہ کیا آنسوؤں کو روکنے کے لیے اولاد کو والدین کے مرنے کی خبر نہیں دی جاتی۔ لیکن اٹھتے ہوئے آنسوؤں نے اس کی زبان بند کر رکھی تھی، وہ بہت دیر تک اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھی آسو بہاتی رہی اور رمضان اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اسے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

”اب بس کرو جیلہ! مرنے والے کے ساتھ ساتھ کوئی نہیں مرنے۔“ رمضان نے ایک عام سا جملہ کہا تھا، لیکن جیلہ جانتی تھی اس کی ماں مری نہیں ہے بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے اور اسے قتل کرنے والے ہاتھ کسی اور کے نہیں بلکہ اس کے خود کے ہیں اسے یہ احساس اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا تھا کہ اگر وہ یہ غلطی نہ کرتی تو اس کی ماں اپنی جلدی نہ مرنے۔

رمضان اس کے لیے گلاس میں پانی لے آیا۔

”لو یہ پانی پی لو۔“ اس نے جیلہ کی طرف قہقہہ اسیورٹڈ گلاس بڑھاتے ہوئے کہا، کبھی جیلہ اس طرح کی کرا کر ہی تصویروں اور خواہشوں میں دیکھا کرتی تھی، لیکن اب یہ اس کے روزمرہ کی چیز تھی، لیکن اس کی جو قیمت جیلہ کو دینی پڑی تھی اس کا احساس اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بہہ رہا تھا۔

”چلو شہناش، اب بس کرو۔“ رمضان نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔ ”بہی تو ہمیں تیار بھی ہونا ہے، فلاح میں زیادہ وقت نہیں ہے۔“ رمضان کے الفاظ اس کے دماغ پر کوڑوں کی طرح لگے۔

”میں نہیں نہیں جاؤں گی رمضان!“ جیلہ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”سب سے پہلے میں اماں کی قبر پر جاؤں گی اور ان سے معافی مانگوں گی۔“ آنسو ایک بار پھر اٹھنے کے لیے بے تاب تھے۔

”باگل ہوئی ہو کیا۔ تمہاری اس معافی سے انہیں کیا فرق پڑے گا۔“ رمضان نے اس کی بات مسترد کرتے ہوئے کہا۔

”میری تو سلی ہو جائے گی۔“ بجلہ نے خند کرتے ہوئے کہا۔ پچھلے چار پانچ مہینوں میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو بجلہ کی زبان سے نکلی ہو اور رمضان نے پوری نہ کی ہو۔ اس مان پر اس نے یہ بات بھی کہہ دی تھی، لیکن اس کی بات سنتے ہی رمضان پھر گیا۔

”اور میرا جولا کھوں کا نقصان ہو جائے گا اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔“ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

”تو تم چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“ بجلہ نے درمیان کی راہ نکالتے ہوئے کہا۔

”میں اپنی بات کو بار بار دہرائے گا عادی نہیں ہوں کبھی بجلہ نیلہ! تم میرے ساتھ چلو کی اور آج ہی چلو کی، سیدھی طرح نہ مائیں تو مجھے اگلیاں میز بھی کرنی آتی ہیں سمجھیں!“ اتنا کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔

دروازہ بند کر کے گیا تھا کہ بجلہ کا دل دہل گیا۔ رمضان کا یہ رخ اس کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ اب تک وہ بجلہ کے سامنے خود کو پیار کرنے والے شخص کے طور پر پیش کرتا رہا تھا جس کی تمام تر خوشیاں بجلہ کی ہر خواہش کو پوری کرنے میں چھپی ہوئی تھیں۔

میرے امر لیکنا نہ جانے سے رمضان کا کیا نقصان ہوگا اس نے سوچا اور اس سوال کے ساتھ ہی اسے اپنی بہن کی کہی ہوئی بات یاد آئی تو کیا واقعی رمضان غشیات کا اسٹگر ہے۔ اس کا ذہن یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، لیکن جیسے ہی وہ سوچتی تھی اس کے سامنے صورت حال واضح ہوتی چلی گئی۔ اسے یاد آیا کہ بیرون ملک کے ہر ٹور سے پہلے رمضان اس کے لیے خاص طور سے لباس تیار کروا تا رہا تھا جسے وہ اس کی محبت کا ایک انداز سمجھتی رہی تھی۔ پھر ہر بار یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ اس کے لباس اپنے غیر ملکی دوستوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا، لیکن وہاں سے اس کے لیے

دوسرے قیمتی لباس بھی دیتا بھی تھا جن میں سے کچھ وہ اپنے یہاں کے دوستوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ بجلہ نے ایک بار اس کی اس عادت پر ٹوکا تھا تو اس نے مذاق میں بات اڑا دی تھی۔

”اگر یہ لوگ تمہاری اترن پہننے میں خوش ہیں، تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ”میں دراصل ان لوگوں پر یہ بات ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیوی کی خوب صورتی کا ان کپڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو وہ پہنتی ہے۔“

رمضان نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا تھا اس وقت وہ خوش ہو گئی تھی، لیکن آج اسے رمضان کی اس حرکت کے نئے معنی معلوم ہوئے تھے گویا میں اس جال میں جکڑ کر رمضان کے لیے ایک کیرئیر کے فرائض انجام دیتی رہی ہوں پھر اسے جب یہ بات یاد آئی کہ رمضان ہمیشہ اس کی فلاح کے دوران اس کے لباس خود منتخب کرتا رہا ہے تو ہر چیز اس کے سامنے واضح ہو گئی۔

چڑھے کی وہ جیکٹ جو اس کے اس ٹور کے لیے بنوائی گئی تھی۔ صوفے پر ہی رکھی تھی اس نے چیک کرنے کا فیصلہ کیا تو قلع کے عین مطابق جیکٹ دوہری تہہ والی مٹی اور ان کے درمیان کوئی چیز بھری ہوئی تھی۔ خوف کی کوئی لہر اس کے وجود میں دوڑی چلی گئی۔ اگر میں پکڑی جاتی تو کیا ہوتا۔ اس نے سوچا۔ رمضان تو صاف قح جاتا! اس حالت بجلہ نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ رمضان اسے شادی کرنے سے بھی بڑا فیصلہ! اس سے پہلے کہ رمضان اس کے پاس آتا وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی۔

”تمہارا پورا کھیل میری کبھ میں آ گیا ہے رمضان!“ اس نے حیرت زدہ رمضان کو لٹکارتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن تمہاری شرائط اترن پر نہیں، بلکہ اپنی شرطوں پر!“ اس

نے جیکٹ رمضان کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ رمضان خود بھی اس کھیل کا آخری آدمی نہیں تھا، لیکن برائی کا دھندہ کرنے والوں کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ چند گھنٹوں میں تمام معاملات طے پا گئے اور وہ امریکا کے لیے روانہ ہو گئے، لیکن اس بار بجلہ کی حالت سیلنگ پارٹنر کی نہیں تھی، بلکہ وہ ایکٹیو پارٹنر تھی۔ اس کا مطالبہ بھی مان لیا گیا تھا کہ اب تک اسے دھوکے میں رکھ کر جو کام کئے گئے ہیں۔ اسے ان کا معاوضہ دیا جائے اور یوں وہ انہوں کے پچھیر میں لکھ پتی ہو گئی تھی۔

جس گڑھے میں وہ ابتدا میں انجانے میں گری تھی، اس روز کے بعد اسی گندگی میں وہ اپنی مرضی سے اترنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لنگ کے بدل کی نظر میں اس اہمیت اختیار کرتی چلی گئی اور کچھ ہی عرصے بعد وہ صرف بڑے کاموں کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ گروہ میں اس کی اہمیت رمضان سے بھی زیادہ ہو گئی۔ دولت چاروں طرف سے اس پر برس رہی تھی وہ امیر سے امیر تر ہوتی چلی جا رہی تھی اس کا بینک بینکس بڑھتا چلا جا رہا تھا، لیکن اب دولت اس کے لیے مطلب کھوئی چلی جا رہی تھی۔ ایک دولت ہی کا اب اس کے نزدیک تو زندگی کی ہر دل چسپی کا مقبوض ختم ہو گیا تھا وہ اپنی کے تمام راستے وہ خود ہی بند کر چکی تھی اس لیے ان ہی راستوں پر وہ خود آ نکلیں بند کیے انجام سے بے پروا چلی جا رہی تھی کوئی اور کام تو تھا نہیں اس لیے یہی کیے جا رہی تھی۔ ماضی کی محبتوں سے نا تا توڑ لینے کے بعد اس کے پاس گناہ اور برائی کے نئے استوار ہونے والے رشتوں کے علاوہ زندگی بسر کرنے کا اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ ان سہاراؤں کے ذریعے ہی زندگی کا قیہ سز کاٹ رہی تھیں دنیا کی نظروں میں وہ رمضان کی بیوی تھی، لیکن حقیقت کبھی تھی۔ یہ وہ اور رمضان دونوں جانتے تھے۔ ان کے درمیان بڑنس اور بھوری کے سوا اور

کوئی رشتہ نہیں تھا ہر چند کہ لوگ اسے اب بھی سسر رمضان ہی کہہ کر بلاتے تھے۔

بیٹے ہوئے ان چھ سالوں میں کئی بار بجلہ کا جی چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی دنیا میں واپس چلی جائے، لیکن پھر وہ خود ہی یہ خیال مسترد کر دیتی۔ بہن کی زبان سے نکلے ہوئے آخری الفاظ اسے یاد تھے اب وہ جرم اور گناہ کی اسی دنیا میں سانس لینے پر مجبور تھی اس کی دلیری اور بہادری کی دھوم بجی ہوئی تھی، لیکن خود وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھی کہ وہ یہ خطرناک کام صرف اسی لیے انجام دیتی تھی کہ جلد سے جلد اپنے انجام تک پہنچ جائے، لیکن ہر بار وہ اپنے انجام تک پہنچنے میں ناکام رہی تھی۔ بارہ روز پہلے جب گروہ کے بڑوں کی گرفتاری کے بعد رمضان بھی گرفتار ہو گیا تھا تب بھی وہ گرفتاری سے قح گئی تھی اور پھر جب اسے یہ پیغام ملا کہ اسے کسی حالت میں بھی پولیس کے ہاتھ نہیں آتا ہے تو وہ یہاں آ کر چھپ گئی تھی۔ اتنا موقع اسے نہیں مل سکا تھا کہ فائلیں بھی غائب کر دیتی، لیکن بینک کے جن لا کر دلوں میں وہ محفوظ تھیں انہیں اس کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا اور شاید اسی لیے وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ بجلہ گرفتار ہو جائے۔

نوری نے اس کے سر ہانے چائے رکھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے تو بجلہ کو احساس ہوا کہ دن کتنا چڑھ آیا ہے۔ نوری کی کہانی بھی عجیب تھی اس کے عین بیٹے تھے، لیکن بیٹیوں اپنی بیویوں میں اس طرح گمن تھے کہ مال کو باہر لے کر بھول گئے تھے۔ نوری کو بجلہ کا سہارا ملا تو اس نے بھی بہو اور بیٹیوں کے ہاتھوں ڈھیل ہونے سے بہتر سمجھا کہ ایک کوٹنے میں بڑی اللہ اللہ کرنی رہے۔ بیگم صاحبہ خود تو دس دن میں چکر لگاتی تھیں، لیکن اس کی خواہ ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ کام تو کچھ ہوتا نہیں تھا بس وہ ہوتی۔

نوری سے معلوم کرتی ہوں، شاید یہ میرے

نہیں آرہی تھی۔ تنگ آکر اس نے کتاب رکھ دی۔

”شاید مجھے جلال بابا کے پاس جانا ہی پڑے۔“ اس نے یہ ہی سوچ کر نوری کو آواز دی۔
 ”نوری ایک جگہ چلنا ہے اگر تم فارغ ہو تو۔“
 ”میں نے کیا کرنا ہے بی بی! جیسا آ۔“

حکم! ”نوری فوراً تیار ہو گئی۔ اس سے پہلے بجیلہ بھی اپنے اس گھر میں آتی تھی اس کے ساتھ ساتھ کوئی ناکوئی گاڑی ہوتی تھی، لیکن آج اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا ٹیکسی جانے پہچانے راستے پر جا رہی تھی۔ جب ٹیکسی اس کے پرانے گھر کے پاس سے گزری تو ایک جدید طرز کا گھر اس کے سامنے تھا وہ بے چین ہو کر ٹیکسی سے اتری اور گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازے دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئی تو عمران نظر آیا۔ وہ چھ سالوں کے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ عمران بھی اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا، لیکن وہ اسے لے کر کھانا روم میں چلا آیا۔ اس نے اسے چوہدری رحیم خان کی موت کی خبر سنائی جیسے جیل والوں نے دبا دیا تھا اور اب وہ بجیلہ کو مشورہ دے رہا تھا کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ ایسی صورت میں وہ اسے پوری طرح سپورٹ کرے گا اور پھر بجیلہ نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ اسی کی دی معلومات کی وجہ سے گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔

”بھائی! اگر باجی کو سزا ہو گئی تو۔۔۔“ ثریا کی آواز میں خوف تھا۔

”جہاں میں نے چھ سال انتظار کیا ہے وہاں بارہ سال اور انتظار کر سکتا ہوں۔“ عمران کے الفاظ سن کر دونوں بہنوں کے چہرے پر خوشی بکھر گئی۔ ان دونوں کو کالجوں پر ڈراپ کرنے کے بعد حوالات کی طرف جاتے ہوئے عمران سوچنے لگا۔ ”جانے میرا یہ انتظار کب ختم ہوگا۔ کبھی ختم ہوگا بھی۔۔۔“



خواب کے بارے میں کوئی بات بتا سکے، جب تک بجیلہ کو یہ خیال آیا نوری کسی کام سے باہر جا چکی تھی۔ اپنے اس خیال کے ساتھ ہی بجیلہ کو اچانک خان بابا یاد آ گئے۔ ان کا ڈیرہ بجیلہ کی پرانی بستی سید پور سے بہت دور تھا، لیکن اماں سمیت بستی کی اکثر عورتیں تعویذ وغیرہ لینے ان ہی کے پاس جایا کرتی تھیں۔ ان کی اس مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ وہ اس طرح جو تعویذ اور دھاگے دیا کرتے تھے اس کے پیسے نہیں لیتے تھے۔ وہ اس وقت اتنے بوڑھے تھے، پتا نہیں اب زندہ بھی ہوں یا نہیں۔ بجیلہ نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”پہلے نوری سے ہی بات کرتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

براہ راست گفتگو سے بچنے کے لیے اس نے نوری سے ایک مختلف انداز سے بات کی۔

”تمہارے پاس کوئی ایسی کتاب ہے! نوری جس میں خوابوں کی تعبیر دی گئی ہو۔“ اور نوری فوراً ہی ایک پتلی سی کتاب لے کر حاضر ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی بجیلہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کچھ عجیب سی زبان تھی اور عجیب سے اشارے! بجیلہ نظر آنے والی مختلف باتوں کی تصویریں کتاب میں دیکھتی رہی، لیکن اس کے پلے کچھ بھی نہیں چکا اس کے باوجود صفحات پلٹتی رہی۔ ایک جگہ لکھا تھا اگر کسی نے دیکھا کہ جسم سے خون بغیر زخم کے جاری ہے اور تمام بدن آلودہ ہو گیا ہے تو مال حرام ملنے کی دلیل ہے جس حیثیت سے خون جاری تھا یعنی کمی بیشی۔ بجیلہ سوچنے لگی کہ اس کے پاس پہلے ہی حرام مال کچھ کم ہے جو مزید ملنے کی نوید دی جا رہی ہے ایک اور جگہ لکھا تھا اولے کا میدان دیکھنا، دشمن بدخواہ بہت ہوں، خود اپنے آپ کو مردہ دیکھنے کے بعد تحریر تھا کہ یہ بیماری سے صحت یاب ہونے کی یا سفر سے گھر آنے کی دلیل ہے۔

بجیلہ بہت دیر تک یوں ہی صفحے پلٹ پلٹ کر مختلف چیزیں پڑھتی رہی، لیکن کوئی بات سمجھ میں